

ڈھاکہ سے فرار

ای۔ حمید



حسن ترتیب

9	ڈھاکہ سے فرار
107	چاند جنگل اور لڑکی
209	راہن کرو سو

ڈھاکہ ہمارا گھر تھا۔ ہمیں اپنے گھرے نکلنا پڑا۔ یہ نوبت کیوں
اور کیے آئے۔ یہ ایک طویل و غنچکاں داستان ہے۔ آگ اور خون
کا یہ ڈرامہ اور سنگینوں کے یہ کرتب جنے لوگوں نے دیکھے ہیں اُن سے
پوچھو تو کہتے ہیں سے

پوچھو نہ داستانِ غم، اُجڑے ہیں کسے طرح سے ہم
گھر کا چراغ کیا بجھا، گھر ہے اُجڑے رہ گیا

داستانِ غم۔ اُجڑے گھروں کے داستان، اے حمید نے
اپنے غزے جگر سے دبے دبے آہوں سے اور سلگتے ہوئے سسکیوں سے کو
بڑے کرب آمیز پیرائے میں نوک قلم میں پر دیا ہے۔ »ڈھاکہ سے فرار، آگ کے
طوفان اور خون کے سیلاب سے زندہ بچ نکلنے کے ایک خون آلود داستان
ہے۔ پڑھئے اور گزرے ایام کے تلخ یا دوں سے عبرت حاصل کیجئے !

رات کا ایک بجاتا تھا۔ کراچی ایئر پورٹ پر بڑی رونق تھی۔
لاؤنچ میں مسافر یہاں وہاں چل پھر رہے تھے۔ ڈھاکہ جانے والی فلائٹ میں ابھی ایک گھنٹہ
پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کینے میں آگیا۔ میں ٹونجے کی فلائٹ سے لاہور
سے کراچی پہنچا تھا۔ یہ فروری ۱۹۷۱ء کی ساتویں تاریخ تھی۔ مشرقی پاکستان میں اٹھے ہوئے اس
طوفان کی آگ زوروں پر تھی جس نے بعد میں اُسے جلا کر راکھ دیا۔ ڈھاکہ شہر کے محلہ محمد پورہ
میں میرے دو خالہ زاد بھائی رہتے تھے جنہیں واپس لاہور لانے کے لئے میں ڈھاکہ جا رہا تھا۔
وہ قایم لوگوں کی تجارت کرتے تھے اور ان دفتر اور دکان محمد پورہ میں تھی۔ مشرقی پاکستان
میں مکتی باہنی کے ہندو بنگالیوں کی کارروائیاں پورے عروج پر تھیں۔ بھارت نے اپنے ہندو
فوجی گوریلے بنگالی مہاجرین کے روپ میں ہزاروں کی تعداد میں مشرقی پاکستان میں داخل کر دیے
تھے جو ملک کے چپے چپے میں سلہٹ سے لے کر چٹاگانگ تک پاک فوج کے خلاف تحریکی
کارروائیوں میں مصروف تھے۔ شیخ مجیب الرحمن بھارتی سامراج کے ایجنٹ کی شکل میں مشرقی
پاکستان کے میدھے سادے مسلمان بنگالیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ملک کے سیاہ و سفید
کا مالک بنا ہوا تھا۔

اس کی سیاسی جماعت اکثریت کے ساتھ انتخابات جیت چکی تھی اور اب وہ ڈھاکہ
گورنمنٹ ہاؤس میں بنگالہ دلش کا جھنڈا لہرانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ فوج چھاؤنی کی
بارکوں میں بند کر دی گئی تھی اور ڈھاکہ شہر میں مکتی باہنی غیر بنگالیوں کا قتل عام کر رہی تھی۔

میرے دونوں خالہ زاد بھائی زلفی اور فیضی محمد پور میں دوسرے غیر بنگالیوں کے ساتھ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ لاہور میں ان کے خط آنے بند ہو گئے تھے۔ ایک روز اخبار میں خبر چھپی کہ مکتی باہنی نے محمد پور میں حملہ کر کے وہاں کے غیر بنگالیوں کو بے دردی سے ہلاک کر دیا ہے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ بہنوں کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھایا۔ آخر بڑے بوڑھوں نے حوصلہ دیا اور کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہماری فوج حالات پر قابو پا لے گی۔

لیکن کسی کو کیا معلوم کہ فوج کو تو ہماری اس وقت کی نااہل سیاست نے بارکوں میں بند کر رکھا تھا اور مکتی باہنی دل کھول کر من مانی کر رہی تھی۔ نرائن گنج اور ڈھاکہ کے اقبال ہال میں بہادیوں اور پنجابیوں کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔ میرے ایک دوست ڈھاکہ میں فوجی افسر تھے طے یہ پایا کہ میں ڈھاکہ جا کر ان سے ملوں اور ان کی مدد سے اپنے خالہ زاد بھائیوں زلفی اور فیضی کو محمد پور سے نکلوا کر چھاؤنی پہنچا دوں تاکہ ان کی زندگیاں محفوظ رہ سکیں۔ ان دنوں ڈھاکہ جانا اپنی زندگی کو بھی خطرے میں ڈالنے کے برابر تھا۔ لیکن زلفی اور فیضی کی زندگی بچانا بھی ضروری تھا۔

چنانچہ میں ایک رات فوج کی فلائٹ سے لاہور سے روانہ ہو کر کراچی پہنچ گیا۔ کراچی سے ڈھاکہ کو فلائٹ رات دو بج کر پندرہ منٹ پر روانہ ہوتی تھی۔ یہ فلائٹ وایا کو بلو جاتی تھی۔ میں یہ سفر کیا کر رہا تھا۔ کراچی ایئر پورٹ پر اتر کر میں نے کچھ وقت بک مشال پر رسالے اور کتابیں دیکھتا رہا۔ یہاں کئی ایک بنگالی خاندان ڈھاکہ فلائٹ کے انتظار میں بیٹھے تھے یہ لوگ مغربی پاکستان سے شاید نقل وطن کر کے ڈھاکہ جا رہے تھے۔

اس قسم کی خبریں عام آرہی تھیں کہ شیخ مجیب الرحمن بہت جلد ایک جلسہ عام میں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرانے والے ہیں۔ حالات کی شدید سنگینی کا ہمیں احساس تھا۔ لیکن حالات اتنے زیادہ سنگین ہوں گے یہ مجھے ڈھاکہ پہنچ کر معلوم ہوا۔ کچھ دیر میں لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا تاکہ کسی طرح سے وقت کٹ جائے۔ مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ جہاز کے ٹیک آف کرنے میں صرف سوا گھنٹہ باقی تھا۔

چنانچہ میں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل والے کیفے میں آ گیا۔ یہاں رشتہ تھا۔ زیادہ تر

بنگالی اور بہاری لوگ تھے جو مشرقی پاکستان جا رہے تھے بنگالی اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے اور بہاری اپنے رشتہ داروں اور لواحقین کی خیر و عافیت معلوم کرنے جا رہے تھے۔ ایک ڈبلی تیلی سانولی سی بنگالی لڑکی اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک طرف سٹون کے پاس بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اس کا چہرہ نیند کے خماریں ڈوبا ہوا سا تھا۔ یا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ مجھے کیسے کی ساری فضا نیند میں ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے کافی منگوائی اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا کہ میں ڈھاکہ ایئر پورٹ پر پہنچوں گا۔ تو دن نکل آیا ہوگا۔ بلکہ خوب دھوپ چمک رہی ہوگی۔

اس سے پہلے میں دو تین مرتبہ مشرقی پاکستان جا چکا تھا۔ سندھ بن سے لے کر کپتائی اور سلہٹ سے لے کر گولنڈ و تک سونا ریش کے کونے کونے میں گھوم چکا تھا۔ ڈھاکہ بھی میرا جانا پچانا شہر تھا۔ میں نے سوچا کہ ایئر پورٹ پر اتارے ہی ٹیکسی لے کر چھاؤنی روانہ ہو جاؤں گا اور پھر وہاں سے اپنے عزیز فوجی افسر کی جیب لے کر محمد پور جاؤں گا اور زلفی اور فیضی کو وہاں سے نکال کر ڈھاکہ چھاؤنی لے آؤں گا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ سارا منصوبہ پانچ روز کا تھا۔ پانچویں روز مجھے دونوں بھائیوں کو ساتھ لے کر واپس لاہور کے لئے ڈھاکہ سے روانہ ہو جانا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ قسمت میرے اس فیصلے پر منہس رہی ہے اور بے پناہ مصیبتوں کا ایک ہجوم وہاں میری راہ دیکھ رہا ہے۔ کافی آگئی میں نے سگریٹ الٹش ٹرسے میں بھجایا اور کافی بنا کر پینے لگا۔ کافی تلخ اور خوشبودار تھی۔ جلی ہوئی حسد کی لکڑی کی خوشبودار!

میری آنکھوں میں مشرقی پاکستان کے نادریل، تارا اور سنبل کے درخت گھوم گئے اور خلیج بنگال سے آنے والی ہواؤں میں جھومتے کیلے کے درختوں کے جھنڈ اور چٹا گانگ شہر سے باہر ناگ ٹولہ پہاڑی ٹیلے پر سجا تاسین کا خوب صورت سرخ ڈھلائی چھتوں اور تارا رام اور کیلے کے ہسراتے درختوں والے بنگلے کی تصویر آگئی۔ اس بنگلے کے پُرسکون ڈرائینگ روم اور لان کی نرم سرسبز گھاس پر بانس کی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر میں اور سجاتا نے کئی بار چائے اور کافی پی تھی۔

سجاتا چٹا گانگ کے ایک ہندو تاجر کی لڑکی تھی۔ اس سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۴ء میں

برس پہلے دیکھا ہے جب تمہارا کوئی مذہب نہیں تھا۔ جب تم شاید کسی گھنے جنگل میں خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ اور..... میں بھی اپنے خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں میں سفر کر رہا تھا.....

سٹیئر زرائے گنج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دریائے پدما کی ٹیالی لہریں سٹیئر سے ٹکرا کر پیچھے کود رہی تھیں۔ کہیں کہیں پھیروں کی کشتیاں دریا کی سطح پر ڈولتی دکھائی دے رہی تھیں۔ جن کے بادبان کھلے تھے اور دریائی ہوا میں پھولے ہوئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں کرتا رہا۔ کریوں اے کاسگریٹ سلگائے دیند کی، خواب کی، ہزاروں سال پہلے کی دنیاؤں کی، ہزاروں سال بعد کی دنیاؤں کی باتیں کرتا رہا۔ وہ میری باتیں سنتی رہی۔ چپ چاپ آنکھیں کھولے سنتی رہی۔ کسی وقت وہ پلکیں جھپکا کر ایک گہرا سانس لیتی اور پھر گردن پر سر کو ایک طرف جھکا کر میری خواب دنیا کی باتیں سننے لگتی۔ اس کے گہرے سانس کی آج اور ہلکی ہلکی ناریل کی جھک مجھے اپنے قریب سے ہوا کا جھونکاں کر گزرتی محسوس ہوتی۔ میں نے کہا۔

”سمجھتا ہوں کہ سانس میں سندر بن میں اُگے ہوئے ترناری کے پھول کی جھک ہے۔ ہے۔ تیری آنکھوں میں غروب آفتاب کی لالی ہے جب وہ دریائے کرناٹکی کے سیاہ جنگلی کناروں میں ڈوب رہا ہوتا ہے۔“

سمجھتا ہوں کوئی جواب نہ دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میری ایک بات بھی نہیں سن رہی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ میری ساری باتیں سن رہی ہے۔ کنول کے اس سفید پھول کی طرح جو ناریل کے درختوں سے گزر کر آنے والی ملایا کی ہواؤں کی خشکی اپنی پنکھڑیوں کے رخساروں پر محسوس کرتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ ہوا کی جھک اس کے ریشمی رخساروں کو چوم کر گزر جاتی ہے اور وہ کوئی بات نہیں کرتا۔ کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔

سٹیئر ہٹا چلا گیا۔ سورج غروب ہونے لگا۔ اس شام سمجھتا ہوں نے مجھے اپنے باپ اور ماما سے ملایا۔ اس کا باپ ایک خالص ہندو جنگلی تاجر تھا جسے سندر بن کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی خربھوؤں بھری ہواؤں اور دریائے کرناٹکی کے کناروں پر چھوٹے تار کے درختوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے مجھ میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ ڈیک کے لاؤنج میں ہم نے

بارہ سال سے نرائے گنج جلتے ہوئے سیٹر میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں چھٹیاں گزارنے جا رہی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار سٹیئر کے ڈیک پر دیکھا۔ وہ جنگل کے ساتھ لگی دریا میں غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ سورج کی لالی میں اس کے سیاہ کھلے بال سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ مجھے وہ ٹیگور کی نظم کی طرح معلوم ہوئی جیسا کہ خوب صورت جنگلی لڑکی کے روپ میں میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔

”رات میں نے سونے سے پہلے تیرا تصور کیا اور سو گیا خواب میں مجھے تو لگتی تھی۔ تیرے جوڑے میں جوہی کے سفید پھولوں کا جوڑا تھا۔ میں نے تمہاری آنکھوں کی جھیلوں میں نیلے کنول کے پھول کھلے دیکھے..... میں نے تمہارے ماتھے کی مسرخ بندیا کے سورج کو چوم لیا اور..... اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔“

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سب کچھ خواب ہے تو میں کبھی بیدار نہ ہوتا اور ساری زندگی خواب دیکھتا رہا.....“

سمجھتا ہوں کہ میرے ذہن میں ٹیگور کی یہ نظم گونجنے لگی۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی غلافی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ نظریں تھکی تھکی اور پر سکون تھیں۔ جھیل کے پانی کی طرح جس کے اوپر صدیوں پُراٹے سنبل کے سُرخ پھولوں والے درختوں کا سایہ ہوا اور جس کا پانی سبز ہو گیا ہو۔

مجھے یوں جیسے اس نے ایک ہلکی سی آہ بھری اور اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو جھٹک کر اپنے کین میں چلی گئی۔ دوسرے روز میں اس کے پاس اسی جنگل کے پاس کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ایک کم گوشتی دنیاؤں میں گم رہنے والی غم پسند لڑکی تھی۔ اس نے کہا

”میں نے کلکتے میں ایم اے کیا۔ ہمارا گھر بلال گنج میں تھا۔ پھر ہم لوگ چٹاگانگ آگے۔ یہ میں نے کہا۔“ سمجھتا ہوں میں کلکتے کئی بار گیا ہوں۔ اور بالی گنج کے گہرے سبز درختوں اور ہری بھری گھاس والے باغوں میں ہو کر کئی بار گذرا ہوں۔ کاش میں نے وہاں تمہیں دیکھا ہوتا۔ لیکن اب ایسے لگتا ہے کہ میں نے تمہیں کلکتے کے بالی گنج میں دیکھا ہے۔ بلکہ اس سے بھی ہزاروں

رگا۔ جیسے اس نے گہرا سانس لیا ہو۔ اس کے سانس کی نیم گرم خوشبو میرے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ جیسے شام کی اندھیری لڑکی میری آنکھوں کو چوم کر گزر گئی ہو۔

میں واپس آنے لگا تو سجاتا نے مجھے اپنے جوڑے سے نکال کر جوہی کا ایک سفید پھول دیا۔ اس پھول سے ہلکی ہلکی خنک محک اُٹھ رہی تھی۔ میں نے اُسے چوم لیا اور اسے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں نے خوشبوؤں کے گہرے تاریک، بجھے ہوئے جوالا کبھی میں چھلانگ لگا دی ہو۔ میں ناگ ٹور کی پہاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے شرک پر آکر اوپر دیکھا۔ سجاتا کے بنگال کی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔ برآمدہ خالی تھا۔ برآمدے میں پڑی بانس کی کرسیاں خالی تھیں۔ سجاتا جا چکی تھی۔

دوسرے روز چٹا گانگ کے آسمان پر کالی گھٹا چھا گئی تھی۔

بنگال کی دریاؤں کی ٹھنڈک آنے والی بارش کی نمی اور سندربن کے جنگل کی خوشبوؤں والی ہوا چل رہی تھی۔ یہ جادو کی ہوا تھی۔ بنگال کے کالے جادو کی ہوا تھی۔ اس ہوا میں سانولی لڑکیوں کی پراسرار سرگوشیاں اور کالے سانپوں کی خاموش پھنکاریں تھیں۔ ناگ ٹور کی پہاڑی کے آسم کے جھنڈ ہوا میں جھوم رہے تھے۔ میں اور سجاتا ایک ویران سے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ہمارے اوپر سنبل اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ لہرا رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب کیلے کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ایک جگہ مولسری کا گھنا درخت تھا۔ وہاں کچھ لوگ دریوں پر بیٹھے تھے۔ ایک کھلے بالوں اور گردے پکڑوں والی بیراگن ایک تاراما تاتھ میں لے رہی تھیں۔ بند کئے جھوم جھوم کر کوئی بنگالی لوگ گیت گاتا رہی تھی۔ میں اور سجاتا اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ بیراگن بے حد خوبصورت عورت تھی اس کے حسن نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ اس کی آواز اک تارے کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ کبھی گلتاک تارا گارہا ہے۔ کبھی گلتا بیراگن خاموش ہے اور صرف اک تارا بجا رہی ہے۔

سجاتا نے کہا

”یہ بیراگن لوگ جنگل جنگل، گاؤں گاؤں گھومتے ہیں۔ جس گھر میں کوئی شادی بیاہ ہو وہاں آکر گاتے ہیں۔ یہ جو بنگالی لوگ گیت گاتا رہی ہے۔ اس کا مطلب کچھ یوں ہے کہ..... اے میرے

چائے پی۔ سجاتا خاموش رہی۔ اس کا باپ کاروبار کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی ماما بھی خاموش بیٹھی رہی۔ میں سجاتا کے باپ کی بے معنی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور کنگھیوں سے سجاتا کے کانوں میں چپکتے نیلم کے گول گول ٹکڑوں کو ٹکاتا رہا۔

ایک مہینے بعد میں چٹا گانگ گیا تو سجاتا سے ملنے ان کی ناگ ٹولہ والی کوٹھی پر گیا میں لاہور سے اس کے لئے مائٹوں کی ٹوکری لیتا گیا تھا۔ سجاتا مجھے کوٹھی کے لان میں مل گئی۔ وہ جوہی کی بازو پر چھکی جوہی کی کلیاں اتار رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ بعض جس طرح پہلے چپ سی رہ کر مجھے دیکھا کرتی تھی اسی طرح مجھے خاموش نظروں سے دیکھتی رہ گئی پھر اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے دریائے پدما کی لہروں پر بادلوں میں سے سورج کرن نے ایک پل کے لئے جھانک کر دیکھا ہو۔

شام کو ہم دونوں برآمدے میں ستون کے پاس بانس کی کرسیوں پر بیٹھے کافی پی رہے تھے اور گیلی شام کی فضا میں ترناری کے نیلے پھولوں اور دریا کنارے اگی مہوا کی کلیوں کی گہری خوشبو ملی ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ بال شانوں پر سیاہ آبشار کی طرح پڑے تھے۔ تاریک رات کی آبشار..... جو بہتے بہتے اچانک رک گئی ہو۔ سجاتا کو پہلی بار دیکھ کر مجھ کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا کہ جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو۔ چلتے چلتے رک گئی ہو۔ کچھ سوچتے سوچتے رک گئی ہو۔ چٹا گانگ کے خوب صورت اور صاف ستھرے شہر کی کوٹھیوں میں روشنیاں جھللانے لگی تھیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں شام بہت جلد گہری ہو جاتی ہے۔ پھر رات کی رانی کی جھاڑیوں میں جگنو چمکنے لگتے ہیں اور دریاؤں کی طرف سے آنے والی نم دار خنک ہواؤں میں ادھورے گیتوں اور گرم آہوں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگتی ہیں۔

”سجاتا! میں نے لاہور میں تمہیں بہت یاد کیا۔ کافی ٹاؤس میں..... ٹی ہاؤس میں..... تم ہر جگہ مجھے یاد آئیں۔ کیا تم نے بھی مجھے کبھی یاد کیا تھا؟“

”سجاتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ تھوڑی دیر میری طرف دیکھا۔ پھر نظریں موڑ کر جوہی کی گہری سبز بلیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید یہ میرا وہم تھا کہ مجھے ایسے

محبوب! مجھے بتاؤ۔ میں کب تک سینے پر اڑا کرے رکھے تمہاری راہ دیکھتی رہوں؟
ہم خانہ بدوش ہیں۔

میرے محبوب بتاؤ! میں کب تک تیری راہ دیکھوں؟
میں دریا کے کنارے رات رات بھر دیا جلا کر تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ ہم تو خانہ بدوش
ہیں۔۔۔۔۔!!!

ہم دریا کے کنارے پر کھانا پکاتے ہیں اور دریا کے دوسرے کنارے پر جا کر کھاتے ہیں۔
ہم سانپ پالتے ہیں۔ ہم سانپ کی سرخ آنکھوں سے پیار کرتے ہیں۔

میرے محبوب! میں کب تک تیری راہ دیکھوں؟.....“
بیراگن دیسے دیسے رقص کی گردش میں تھی۔ اس کے سیاہ بال دائیں بائیں رقص کی گردش
کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ یہ بیچ ج بنگال کا کالا جادو تھا۔ یہی وہ جادو کی امرنیل تھی جو مسافر کے
جسم کے گرد آہستہ آہستہ پھیلتی چلی جاتی ہے اور مسافر کو اس وقت علم ہوتا ہے جب اس کے
پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہیں اور وہ ایک قدم بھی آگے نہیں جاسکتا اور پھر کسی نہ کسی سانولی
بیراگن کے سیاہ بالوں میں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے گم کر دیتا ہے۔ بنگال کا جادو، جادو
کا بنگال!۔

پھر بارش شروع ہو گئی۔ میں اور سجاتا بھاگ کر کوٹھی کے برآمدے میں پہنچے۔ اس
کے بال بھیک کر اس کی ساری سے چٹ گئے تھے اور اس کی ساری سمٹ کر اس کے
چیٹی بدن سے چٹ گئی تھی اور اس کا بدن ایک دھیمادھیم شعلہ بن کر سلگ رہا تھا۔
دریا کی لہروں، سمندر کی موجوں سے طلوع ہوتا ہوا سورج کا شعلہ!



میں چٹا گانگ سے واپس آ گیا۔

سجاتا مجھے ریلوے سٹیشن پر چھوڑنے نہ آئی۔ اس نے پرسکون خاموش نظروں سے اپنے
کوٹھی کے لان میں جڑ ہی کی بیلوں کے قریب کھڑے ہو کر اوداع کیا اور میں ناگ ٹولہ کی پہاڑ
سے نیچے اتر آیا۔ میں ریلوے سٹیشن جانے کی بجائے چٹا گانگ کے بڑے بازار میں گھومتا پھرتا

رہا۔ ایک ہوٹل سے جو تھیکا رائے کے بھجن گانے کی آواز آرہی تھی۔

میں رک گیا۔ شام کی ٹھنڈی ہوا میں غروب ہوتے سورج کی لالی میں جو تھیکا رائے کی
آواز خلیج بنگال کے پانیوں کی طرف لے جا رہی تھی۔ امرنیل بن کر میرے جسم کے ارد گرد نظر نہ
ہونے والا جالا سامنتی جا رہی تھی۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اگر میں کچھ دیر وہاں اور کھڑا
رہتا تو ضرور پتھر بن جاتا۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے پتھر بن جاتا۔

میں چٹا گانگ سے ڈھاکہ آ گیا۔ ساری رات ریل گاڑی سپاری، سنبل اور تازہ گھنے
جنگلوں سے گذرتی رہی۔ کھڑکی میں سے ان اندھیرے جنگلوں کی ٹھنڈی مہک والی ہوا آتی
رہی۔ اس ہوا میں مجھے سجاتا کے گرم سانس کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ صبح ہو رہی تھی کہ گاڑی
پاربتی پور رُکی۔ یہاں میں نے ریلوے تار گھر سے سجاتا کو تار دیا کہ میں تمہیں یاد کرتا ہوں
ڈھاکہ کی طرف سفر کر رہا ہوں۔

اور پھر ڈھاکہ کا خوب صورت مکلا پور ریلوے سٹیشن آ گیا۔

تین روز بعد مجھے سجاتا کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ اداس ہو
گئی تھی۔ کاش میں اسے اپنی یاد میں اداس دیکھ سکتا۔ میں بھی اداس رہا۔ دو تین دن سجاتا
کا خیال میرے ساتھ ساتھ ڈھاکہ کے بازاروں میں اور رہنا کے باغوں میں سفر کرتا رہا۔
میں ایک ہفتے بعد لاہور آ گیا۔ ایک مہینے بعد مشرقی پاکستان گیا تو سجاتا کا خط میرے ایک
ڈھاکہ کے دوست کے پاس آیا ہوا تھا۔ میں نے بے تابی سے اسے کھول کر پڑھا۔ اس
نے لکھا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کی سالگرہ ہے۔ ضرور آنا۔ سالگرہ میں تین روز باقی تھے۔
میں مکلا پور ریلوے سٹیشن سے چٹا گانگ ایکسپریس میں سوار ہوا اور چٹا گانگ پہنچ گیا۔

ناگ ٹولہ پہاڑی پر روشنیاں ہو رہی تھیں۔

یہ روشنیاں سجاتا کی کوٹھی کی تھیں۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ سجاتا کے ماما پتا مجھے ملے
میں نے سجاتا کی بہن کو تحفہ دیا۔ سجاتا نے گلابی رنگ کی سنہرے باڈروالی ساڑھی پہن رکھی
تھی جس پر کرن لگی تھی۔ اس کے ماتھے پر سرخ بنڈیا دمک رہی تھی۔ یہ چندن کی بنڈیا
تھی جو کشمیر کی پہاڑیوں میں زعفران بن کر اڑتا ہے۔ اس کے سیاہ جوڑے میں ترناری کے

گئے درختوں میں کوئل بول کر اڑ گئی۔

سجائے بانس کے چھتاروں کی طرف دیکھا۔ وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ جہان رخصت ہونے لگے۔ میں بھی رخصت ہونے کے لئے لان میں سے گذر کر کونٹھی کے گیٹ پر آگیا۔ سجاتا میرے ساتھ نہیں تھی وہ دور برآمدے میں اپنی بہنوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ برآمدے کی روشنی میں اس کی ساڑھی کی کرن اور ماتھے کی سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ شاید اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اداس ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ وہ اداس ہو گئی تھی۔ میسری خواہش تھی کہ وہ اداس ہو جاتی۔

میں واپس آگیا۔ ساری رات میں ہوٹل کے کمرے میں لیٹا سجاتا کے جسم سے چھو کر آنے والی خوشبو کو اپنے چہرے پر محسوس کرتا رہا۔ صبح میں جلدی اٹھا۔ گاڑی ٹھیک چھ بجکر دس منٹ پر چھوٹ جاتی تھی۔ چٹا گانگ کے خوبصورت ریلوے اسٹیشن پر بڑی رونق تھی۔ گاڑی ٹھیک وقت پر روانہ ہو گئی۔ ڈھاکہ تک مجھ پر ایک نشے کی سی کیفیت چھائی رہی۔ سجاتا کی شکل بار بار سامنے آ جاتی تھی۔ دل ہی کہتا کہ واپس چلو۔ اور ساری زندگی سجاتا کے پاس گزار دو۔

مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اپنی زندگی سجاتا کے پاس نہیں گزار سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اس کا ہندو باپ بھی تھا۔ وہ صبح و شام درگادیوی کی پوجا کرنے مندر جاتی تھی اور میں مندر میں نہیں جاسکتا تھا۔ وہ ماتھے پر تلک لگاتی تھی۔ وہ بنگال کے ایک کٹر ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور میں مسلمان گھرانے سے متعلق تھا۔ یہ شمال اور جنوب کا فرق تھا۔ ہندو اور خشکی کا فرق تھا۔ اور یہ دونوں کبھی آپس میں نہیں مل سکتے تھے۔

ٹریں ڈھاکہ کے بکے عظیم انسان ریلوے اسٹیشن کملاپور میں داخل ہو رہی تھی۔ سجاتا کا چہرہ ہجوم میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

سجاتا سے میری آخری ملاقات ۱۹۷۰ء کے آخری مہینوں میں ہوئی۔ میں ڈھاکہ کے شاہ باغ ہوٹل کے لاونچ میں سے نکل رہا تھا کہ میں نے سجاتا کو دیکھا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک پل کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

سفید پھولی سجے تھے۔ اس کے جسم سے الگ کر جو ہوا میری طرف آئی اس میں خاورِ اناج کی خوشبو تھی۔ یہ پاگل کر دینے والی خوشبو تھی۔ یہ دو چار بھری خوشبوؤں کا ملاپ تھا۔ یہ دو دریاؤں، دو سورجوں اور دو براعظموں کا ملاپ تھا۔ سجاتا نے پرسکون خاموش آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر مجھے ڈرائینگ روم میں دوسرے مہمانوں کے پاس لے گئی۔ اس محفل میں چٹا گانگ کے مسلم گھرانوں کی شریف خواتین بھی مدعو تھیں۔

کھانا بڑا پُر تکلف تھا اور مسلمان باورچیوں نے تیار کیا تھا۔ کھانے کے بعد بنگالی گھریلو لڑکیوں نے گیت سنائے۔ ٹیگور اور جیم الدین کے بنگالی گیت۔۔۔۔۔ کافی کا دور چلا تو مہمان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں اور سجاتا بنگلے کے پھوٹے والے برآمدے میں آگئے۔ جہاں رات کی رانی کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور جھاڑیوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ ہم نیم روشنی برآمدے میں بانس کی کرسیوں پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا

”سجاتا مجھے اس ناریل اور تارڈی سرزمین سے بہت محبت ہے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ میں کسی جہم میں یہاں ضرور آیا ہوں۔ یا تو اس شہر کا راجہ بن کر حکومت کرتا رہا ہوں اور یا پھر بیراگی بن کر اس سرزمین کے جنگلوں، دریاؤں اور میدانوں میں گھومتا پھرتا رہا ہوں۔“

سجاتا خاموش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”شاید پھر میں کبھی دیو داس تھا جو اپنی پاربتی کی تلاش میں۔۔۔۔۔ اس سے اپنی زندگی کی آخری ملاقات کرنے ایک بیل گاڑی میں بیٹھا برودان آیا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر کسی جنگل کی گہری پُراسرار رات میں مر گیا اور پاربتی سے زندگی کی آخری ملاقات نہ کر سکا۔“

رات کی رانی کی جھاڑیوں میں مہرے جگنو، نیلی روشنیوں والے جگنو چمک رہے تھے۔ ہوا میں خوشبو تھی۔ ایک رات کی رانی وہاں جھاڑیوں میں مہک اڑا رہی تھی اور ایک رات کی رانی میرے پاس بانس کی کرسی پر خاموش بیٹھی حنا کی مہک دے رہی تھی۔ بانس کے اونچے اونچے

وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اُسے دل صدمہ پہنچا ہو۔ بولی۔
 ”کیا تم بھی چاہتے ہو کہ میرا بیاہ ہو جائے؟“
 ”کیوں نہیں چاہتا میں! بیاہ کے بعد تم اداس نہیں رہا کرو گی۔“
 اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور کہنے لگی۔
 ”میں جاتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر اوپر چلی گئی۔ میں اُسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔
 اس کے بعد سجاتا میری ملاقات نہ ہو سکی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ میں ملک سے
 اہر چلا گیا۔ اس عرصے میں مشرقی پاکستان میں بھی انتخابات شروع ہو گئے اور پھر عوامی لیگ
 کے لیڈر نے چھ نکات پیش کر دیئے اور بنگلہ دیش کی تحریک شروع کر دی اور غیر بہاریوں کا
 نقل عام شروع ہو گیا۔ نہ میں سجاتا کو کوئی خط لکھ سکا اور نہ سجاتا کا کوئی خط مجھے ملا۔ اس
 سے زیادہ اب ہم لوگوں کو ان نوجوانوں کی فکر تھی جو ڈھاکے کے غیر بنگالی محلے محمد پور میں
 پھنسے ہوئے تھے۔

”غزاتین و حضرات! توجہ فرمائیں! کراچی سے وایا کو لمبو جانے والی فلائیٹ نمبر۔۔۔“
 میں اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ مائیک پر ایک لڑکی اعلان کر رہی تھی کہ کراچی
 سے ڈھاکہ جانے والی فلائیٹ تیار ہے اور اس کے مسافر برائے مہربانی جہاز میں آکر سوار
 ہو جائیں۔ میں نے بل ادا کیا اور نیچے اتر کر لاؤنج میں سے ہو کر ٹکٹ کا نمبر لے کر ایئر پورٹ
 کے اندر آ گیا۔ یہاں ایک بس ہمیں جہاز تک لے جانے کے لئے سٹارٹ ہو چکی تھی مسافر
 سوار ہو رہے تھے۔ بس ہمیں لے کر جہاز کے پاس پہنچ گئی۔

یہ بوئنگ جہاز تھا۔ اس پر پہلے بھی میں ڈھاکہ تک سفر کر چکا تھا۔ جہاز کی ایئر سوسٹیس
 میری شناسا تھیں اور میٹرو وارڈ بھی۔۔۔ میں نے میٹریسیوں کے نیچے اور اوپر وہی مخصوص
 شناسا چہرے دیکھے۔ مس خان میٹریسیوں کے اوپر کھڑی آنے والے مسافروں کو خندہ پیشانی
 سے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب سے گذرا۔ اس نے مسکرا کر مجھے بھی خوش آمدید
 کہا۔ جہاز مسافروں سے بھر چکا تھا۔ ان مسافروں زیادہ تعداد بنگالی گھرانوں کی تھی۔ غیر بنگالی

سے گئے۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جوڑے میں ترناری کی سفید کلیاں تھیں اور
 کانوں میں سفید بندے۔۔۔۔۔ اس نے اور اس کی چھوٹی بہن نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔
 وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی تھی اور کچھ کچھ حیران بھی ہوئی تھی۔
 ”ہم یہاں ایک کام سے آئے ہیں۔ پتاجی بھی ساتھ ہیں۔“
 ”اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔“

”کیا تم لوگ شاہ باغ میں ٹھہرے ہو؟ تمہارے تو ماسی کی یہاں اتنی بڑی کوٹھی ہے۔“
 ”پتاجی کسی کے ہاں نہیں ٹھہرتے۔۔۔۔۔ کل آؤ گے؟ میں یہاں تمہارا انتظار کروں گی۔۔۔“
 یہ ساتھ والے سائیڈ کیفے میں۔۔۔۔۔ اچھا منشا کار!۔

سجاتا اپنی بہن کے ساتھ اوپر چلی گئی۔
 اگلے روز وہ سائیڈ کیفے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ پینک کلر کی سادہ ساڑھی میں
 بال بوہنی پینک کلر کے ایک ربن میں بندھے تھے۔ دائیں جانب بالوں میں یوہنی بے نیازی تھی۔
 سے ایک سفید گلاب لگا رکھا تھا۔ کانوں میں بھی پینک رنگ کے بوندے تھے۔ اس کی آنکھوں
 میں بڑی اداس سی چمک تھی۔ چہرے پر پہلے سے زیادہ گہری خاموشی تھی۔ میں نے چپائے
 منگوائی۔ سلہٹ کے باغوں کی خوشبو دار چلے پیتے ہوئے بولی۔

”شاید ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں۔“
 ”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔ کہنے لگی۔
 ”شاید مدراس یا کلکتے۔۔۔۔۔ وہ میرا بیاہ کر رہے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ سترامی نہیں۔ بلکہ اور زیادہ اداس ہو گئی۔ اس کے بیاہ کی بات
 سن کر میں بھی اُداس ہو گیا۔ حالانکہ میرے اداس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ نہ میں
 اس سے بیاہ کر سکتا تھا اور نہ وہ مجھ سے بیاہ کر سکتی تھی۔ پھر وہ کیوں اداس ہوئی تھی؟
 اس کے دل میں کیا تھا؟ میں نے کہا۔

”ربیاہ تو ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہوگا تمہیں۔ ماں باپ جہاں کہیں وہاں شادی
 کر لو۔“

شروع کر دیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ کراچی کی روشنیوں سے بھری ہوئی رات میں جھلکاتی جھلکاتی، دھکتی چمکتی عمارتوں کے ادیر کو لمبو کی طرف پروانہ کر رہا تھا۔ جہاز اڑتا چلا گیا۔ اندھیری رات میں نیچے بحیرہ عرب کا سمندر کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جہاز کو لمبو کے اوپر سے گزرا گیا۔ نیچے دور روشنیوں کے نکتے سے نظر آئے۔ جہاز پر اعلان ہوا کہ ہم کو لمبو کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ مجھے وہ خوب صورت دن یاد آگئے۔ جو میں نے اس حسین ترین جزیرے میں بسر کئے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگالیا اور اپنی نیند میں سلگتی ہوئی آنکھوں کو بند کر کے یادوں کے خاموش جنگلوں میں کھو گیا۔ جہاز اب خلیج بنگال کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ آسمان پر صبح کا نور پھوٹ رہا تھا۔ مشرقی پاکستان پہنچتے پہنچتے دن کافی ٹھیک آیا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ مشرقی پاکستان کے دریا اور جنگل اور چھوٹے چھوٹے جزیرے شروع ہو گئے تھے۔ جہاز ڈھاکہ کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ گول کھڑکی میں سے میں نے نیچے دیکھا۔ فضا بدلی ہوئی تھی۔ مجھے ایک سڑک نظر آئی جو سنسان پڑی تھی۔ صرف ایک ٹرک دور جاتا دکھائی دیا۔ ڈھاکہ کی یہ سڑک مجھے جہاز میں سے پہلے کبھی ایسی سنسان نظر نہیں آئی تھی۔

حالات واقعی خراب ہو چکے تھے۔ لیکن حالات کس قدر سنگین حد تک خراب ہو چکے تھے اس کا احساس مجھے ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اترنے کے بعد ہوا۔ ہمارا جہاز رن وے پر اترنے کے بعد ریٹنگٹا ہوا ایک جگہ آکر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ایئر پورٹ کے کمرے تھے۔ لاؤج تھا جہاں بڑی گہما گہمی ہو ا کرتی تھی۔ لیکن اب وہاں سوائے پاک فوج کے اور پاک ایئر فورس کے جوانوں کے اور کوئی عملے کا آدمی نہ تھا یہ جوان مسافروں کو ایئر پورٹ سے باہر جانے کی سہولتیں دے رہے تھے۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ صرف ایک بیگ تھا۔ میں نے بیگ اٹھایا اور چیکنگ کے بعد ایئر پورٹ کے بڑے کمرے میں آ گیا۔

کبھی یہاں خوب صورت میزوں اور صوفوں کے پاس گلدانوں میں تروتازہ پھول جھک رہے ہوتے تھے۔ لیکن آج یہاں صوفوں پر گرد جمی تھی۔ ہاتھ روم کا نل ٹوٹا ہوا تھا جس میں سے مسلسل پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ بنگالی عملے نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ منگلا زبان میں نعرے لکھے ہوئے تھے۔ میں باہر آیا تو کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ایئر پورٹ کی

میرے علاوہ شاید دو چار مسافر ہی ہوں گے۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ ایک بنگالی بوڑھا بیٹھا تھا۔ سامنے بھی اسی قسم کا ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ ایئر سٹیشن میں خان نے میرے پاس آکر جھک کر پوچھا

”کیا آپ کافی یا چائے پسند کریں گے؟“

میں نے کہا۔ ”شکریہ! صرف کافی..... بغیر دودھ کے۔“

وہ کافی لے کر آگئی اور آہستہ سے بیچابی میں پوچھنے لگی۔

”آپ ڈھاکہ کس لئے جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”میرے دو خالہ زاد بھائی وہاں پھنس گئے ہیں۔ انہیں لینے جا رہا ہوں“

ایئر سٹیشن نے کہا۔

”وہاں حالات بہت خراب ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی دوسرے مسافروں کے پاس چلی گئی۔ میں سوچ میں کہ ڈھاکہ کے حالات کیوں خراب ہیں۔ وہ لوگ تو بڑے سخت دینی مسلمان لوگ ہیں۔ انہیں کن کی صحبت خراب کر گئی۔ مجھے اقبال کا مصرع یاد آ گیا ہے

خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زارغ

مشرقی پاکستان میں مہاجرین کے بھیس میں بھارت نے لاکھوں ہندو فوجی گوریلے داخل کر دیئے تھے جو جگہ جگہ توڑ پھوڑ اور پاک فوج کے خلاف ویاں کے لوگوں میں زہر پلا رہے پکینڈہ کرنے میں مصروف تھے۔ یہ بھی سنا تھا کہ وہ فوجی لباس میں وہاں کے دیہات میں بنگالی مسلمانوں کے گھروں میں جا کر کہتے ہیں کہ ہم پاک فوج کے سپاہی ہیں ہمیں مرغیاں دو۔ روپے دو۔ دودھ اور انڈے دو۔ صرف اس لئے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ فوج کے خلاف ہو جائیں یہ ہندو ملکی باہمی کے سپاہی بڑی سے بڑی حرکت سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

”خواتین و حضرات! برائے مہربانی سگریٹ بجھا دیں اور اپنی اپنی حفاظتی

بیٹیاں کس کر باندھ لیں.....“

جہاز کے چاروں انجن سٹارٹ ہو چکے تھے۔ جہاز نے رن وے پر آہستہ آہستہ کھسکنا

نہیں جانتا تھا کہ میرا رشتہ دار فوجی افسر چھاؤنی میں کس جگہ رہتا ہے۔ سوچا کہ شاید حسن کو معلوم ہو کہ ان کی رجمنٹ کس جگہ پر ہے۔ گیٹ پر کیمپ لگا تھا۔ ایک پنجابی اور ایک بنگالی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں لیفٹیننٹ حسن سے ملنا چاہتا ہوں بنگالی سپاہی نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ پنجابی سپاہی میرے قریب آکر کہنے لگا۔

”وہ چھاؤنی گئے ہوئے ہیں۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”لاہور سے۔“

وہ چونک سا پڑا۔ ”لاہور سے؟ آپ یہاں کیوں آگئے؟“

میں نے اُسے بتایا کہ میرے عزیز یہاں محمد پور میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی خیریت کے لئے بلکہ انہیں یہاں سے نکلانے آیا ہوں۔ پنجابی سپاہی خاموش ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”آپ اندر جا کر ویننگ روم میں انتظار کریں۔ لیفٹیننٹ حسن ابھی آجائیں گے۔“

میں انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے اپنے رشتہ دار فوجی افسر کی رجمنٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔

”سامنے چھاؤنی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں پنجاب رجمنٹ کی گارڈ پوسٹ ہے۔ وہاں سے آپ کو پوری اطلاع مل سکے گی۔“

چھاؤنی کے علاقے سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ لیکن ایسی بے رونقی اور دیرانی میں نے اس سے پہلے ڈھاکہ میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تمام گاڑیوں پر سیاہ جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ ہر جگہ بنگالی آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ غیر بنگالی ایک بھی چہرہ وہاں نہیں تھا۔ میں چھاؤنی کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ چھاؤنی کا علاقہ جہاں سے شروع ہوتا تھا وہاں دونوں جانب سڑک سے نیچے آکر ترپاک فوج کا کیمپ لگا تھا۔ میں ایک کیمپ کی طرف گیا۔ جمبو کے باہر خالی پیٹیوں پر دو فوجی جوان بیٹھے تھے۔ سڑک پر ایک میز رکھی تھی۔ دو فوجی جوان چھاؤنی میں داخل ہونے والے سے ضروری پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

میں نے جا کر سلام کیا۔ ایک سوبیدار میرے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”وعلیکم السلام۔“

عمارت کے بعد باہر غیر بنگالی یعنی پنجابی، بہاری اور پٹھان خاندانوں کا ایک ہجوم ڈیرہ ڈالے پڑا تھا۔ صندوق بسترے اور دوسرا سامان دیواروں کے ساتھ اوپر تک لگا تھا۔ زمین پر عارضی اینٹوں کے چولہے بنے تھے جن پر کھانا وغیرہ پکا یا جاتا تھا۔

مجھے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دن یاد آ گئے۔ ان دنوں بھی میں نے اسی قسم کے ہجوم ریلوے سٹیشنوں اور مہاجر کیمپوں میں دیکھے تھے۔ ایئر پورٹ کے ایک گیٹ کے سوائے باقی دونوں گیٹوں کے لوہے کے دروازے بند تھے۔ دولہی قطاریں بنی ہوئی تھیں جن میں لوگ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ڈھاکہ سے نکل جانے کے لئے پی۔ آئی اے کے ٹکٹ اور پرمٹ حاصل کر رہے ہیں۔ پرمٹ اس لئے کہ مسافروں کو ان کی باری کے مطابق جہاز پر سوار کیا جاتا تھا۔ ڈھاکہ سے دن میں صرف دو فلائیں کراچی جاتی تھیں ہر ایک جہاز میں دوسو کے قریب مسافر سوار ہوتے تھے اور ایئر پورٹ کے باہر ہزاروں لوگ صرف قطاروں میں کھڑے تھے۔ جو لوگ کیمپ لگائے بیٹھے تھے ابھی ان کی قطاروں میں کھڑے ہونے کی باری بھی نہیں آئی تھی۔

قطار میں کھڑے ہونے کے لئے پانچ پانچ سو روپے کی بلیک ہو رہی تھی۔ ٹکٹ دینے والی کھڑکی پر ایک مسافر بلکہ مہاجر کئی روز میں پہنچتا تھا۔ مسافروں کو قطار میں کھڑے کھڑے جہاں رات پڑتی تھی وہ اسی جگہ بستر لگا کر سوجاتے تھے۔ ایسے لوگ بھی وہاں پیدا ہو گئے تھے۔ جو ایک سو روپیہ رات کا کرایہ لے کر مسافر یا مہاجر کی جگہ خود سوجاتے تھے یہ منظر اس قدر دلخراش تھا کہ ایک بار تو میں بھی کانپ کر رہ گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں ڈھاکہ کے ہکر پھنس گیا ہوں۔ اب نہ مجھے پراسرار آنکھوں والی سبوتا کا خیال تھا اور نہ بانس اور تار کے گھنے جنگلوں کی طرف سے خوشبو آتی تھی۔ اب دل میں ایک ہی خیال تھا کہ یہاں سے اپنے خال زاد بھائیوں کو لے کر کب نکل سکوں گا؟

میں ایئر پورٹ سے باہر آ گیا۔

ایئر پورٹ کی عمارت کے بالکل سامنے پاک ایئر فورس کا ہوٹل تھا۔ یہاں میرا ایک فلائٹ لیفٹیننٹ دوست مسٹر حسن رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے ملنا چاہیے۔ کیونکہ میں

تھے۔ میں فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ میرا بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ موسم میں گرمی تھی۔ میں ٹھیک مقام پر پہنچ گیا۔ میرے عزیز فوجی افسر نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کی بیوی نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور کہا۔

”آپ اس جلتی آگ میں کیسے آگئے؟“

میں نے ہنس کر کہا۔

”مجھے اس قسم کے سفروں کی عادت ہے بھابی!“

پھر میں نے انہیں بتایا کہ میں کس غرض کے لئے آیا ہوں۔ فوجی افسر نے کہا۔

”ہماری جیب تو شہر میں نہیں جاسکتی۔ ہاں! میں تمہارے ساتھ نوکر بھیج دوں گا۔ جو
مجرور جا کر فیضی اور زلفی کو یہاں لے آئیں گے۔“

میں نے کہا

”نوکر کو ساتھ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔“

» اس کی بیگم جھٹ بولیں۔ «ہنیں نہیں۔ ایسا نہ کرنا۔ محمد پور کے حالات بہت خراب ہیں۔»

لیکن دوسرے کھانے کے بعد میں کوٹھی سے باہر نکل کر محمد پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر میں اس وقت بنگالیوں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کمتی باہنی کا راج تھا۔ چوک چوک میں

کسی پر شک پڑ جائے تو ملاشی لی جا رہی تھی۔ جس کسی کو جی چاہا پکڑا جا رہا تھا۔ بنگالی اکثریت

کے محلوں میں جہاں کہیں بھی غم رنگائی تھی انہیں مالتو ختم کر دیا گیا تھا اور یا وہ بھاگ کر میرپور

میں آگئے تھے۔ مرغ نمکالا، اکثریت کے علاوہ تھے اور بہت بڑے محلے تھے۔ محمد نور تو لوہے

سمر آزاد کو طرح ایک علاقہ مھسا سوا تھا۔ اسی جگہ دھان منڈی تھی، جہاں شیخ محب الرحمن

من ابادی عمر ایک مکالمہ پسند ہوا تھا۔ اسی جگہ دھان سٹی بی بی کی پہلی یں بی بی اس کے

[illegible]

میر کو یہ بھی بہت بڑی آبادی تھی جہاں سارے کے سارے پہاڑی آباد تھے۔ یہ دونوں می

آبادیاں تھیں جو مال ہی میں غیر جنگلیوں یعنی بہاریوں نے آباد کی تھیں۔ لاہور میں رہتے ہوئے

ہمیں احساس نہیں تھا کہ حالات اتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں میر لورڈ اور جگر لورڈ کے

بارے میں بھی ہمیں لاہور میں غلط افواہیں مل رہی تھیں.... بیرونیوں علاقے ابھی تک محفوظ

میں نے پنجابی زبان میں کہا کہ لاہور سے آیا ہوں اور فلاں رجمنٹ کے فلاں آفیسر کی کوٹھن کی تلاش میں ہوں جو چھائی میں رہتے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے اٹھ کر مجھ سے ماتھ ملایا، صوبے دار نے بڑی تشویش سے کہا۔

”آپ لاہور سے یہاں کیوں آ گئے؟“

میں نے اُسے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے ایئر فورس ہوسٹل کے گارڈ کو بتا چکا تھا۔

صوبیدار نے کہا۔

”کیا لاہور والوں کو خبر ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے کہا کہ ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ بھارت کے بھیجے ہوئے ہندو مکتی باہنی

یہاں کے لوگوں کو ہمارے خلاف اُکسا کر توڑ پھوڑ کی کارروائیاں کر رہی ہے۔ بے گناہ

غیر ہنگامیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ بچوں کو لوہے کی میخوں کے ساتھ درختوں پر ٹھونکا جا رہا ہے

”لیکن یہ سب کچھ بھارت کے ایجنٹ کر رہے ہیں جو ہندو ہیں۔ بنگالی مسلمان کو گمراہ کیا

گیارہ۔

صوبیدار میجر خاموش رہا۔ اتنے میں ایک فسواری رنگ کی کار چیک پوسٹ پر آکر رک

گئی۔ صوفیہ مہاجر بھاگ کر وہاں گیا۔ واپس آیا تو اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ آنکھوں میں

شعاع تھی۔ معلوم ہوا کہ اس گاڑی میں ایک شریف بہاری باپ اپنی اس بیٹی کو ہندو مکتی باہمی

کے جنگل سے جھڑا کر لایا ہے۔ جسے انہوں نے چار روز پہلے اغوا کر لیا تھا۔ اس کمی کا جو حال ہوگا۔

اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ ہم خاموش سے ہو گئے۔ کسی نے کوئی بات نہ کی۔ پھر

صوبہ دار نے کہا۔

”آپ چائے پیئیں گے ہمارے ساتھ۔“

میرے انکار کے باوجود پاک فوج کے جہان نے اپنے روائتی حسن اخلاق کا مظاہرہ

مہرے ہوئے مجھے لگ میں چائے پلائی اور میرے فوجی رشتے دار کی یارک کا پتا بھی بتایا۔ میں

چیک پوسٹ پر ضروری چیکنگ کروانے کے بعد چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہ

سڑک بھی ڈھاکہ شہر کی دوسری سڑکوں کی طرح ویران تھی۔ بہت کم لوگ اس پر آ جا رہے

مجھے مل گئی۔ اسے بنگالی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا۔
 ”محمد پور چلے گا یہ اور رکشا میں سوار ہو گیا۔ بنگالی ڈرائیور نے اپنے ساتھی سائیکل
 رکشا والے کی طرف مسکرا کر دیکھا اور رکشا سٹارٹ کر دیا۔ میں کچھ پریشان سا ہوا۔ دونوں
 کے اشارے خطرناک تھے۔ لیکن اب رکشا ایئر پورٹ سے فارم گیٹ کی طرف دوڑے جا
 رہا تھا۔ راستے میں سڑک پر ایک بھی غیر بنگالی چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک پر ایک جگہ
 بائیں جانب دوسری منزل پر ہمارے ایک دوست اسحاق کشمیری کی نوادرات کی دکان کی
 گیلری میں تانبے کے تھال اور سجاوٹی فانوس لٹک رہے تھے۔ گیلری میں کُرسی پر اس کا بنگالی
 بنگالی ملازم بیٹھا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ دکان اپنے بنگالی ملازم کے حوالے کر کے لاہور
 چلے گئے تھے۔ حالات ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ ڈھاکہ آ گئے اور حالات زیادہ خراب ہو
 جانے کے بعد وہ دوبارہ واپس چلے گئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ چنانچہ آج کل ان کی دکان
 کا مالک ان کا بنگالی ملازم ہے۔

سڑک فارم گیٹ کی طرف مڑی تو چوک میں بنگالی نوجوانوں نے رکشے کو روک لیا۔
 یہ ایک بڑا سنگین معاملہ ہے۔ لیکن چونکہ میں نیا نیا لاہور سے آیا تھا اور ابھی مجھ میں بنگالیوں کی
 اسلام دوستی کا احساس شدید تھا اس لئے میں ذرا نہ گھبرایا اور رکشے سے منہ باہر نکال کر
 کہا۔

”کیا بات ہے بابو؟“

بنگالی مجھے تعجب سے دیکھنے لگے۔ شاید انہیں پہلی بار کوئی غیر بنگالی ملا تھا جس نے ان
 حالات میں اس اعتماد کے ساتھ منہ باہر نکال کر بات کی تھی۔ کیونکہ جیسا کہ مجھے محمد پور جا کر
 معلوم ہوا تھا کہ جس کسی نے رکشے میں سے منہ باہر نکال کر بات کی اس کی گردن کا جرمولی
 کی طرح کاٹ کر سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔ میرا اعتماد کام کر گیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ
 حالات کس قدر خون آشام ہو گئے ہیں تو میرا خیال ہے کہ میں بھی اس اعتماد سے گردن
 رکشے سے باہر نہ نکالتا۔ میرے اس طرح سے بات کرنے پر بنگالی نوجوان پرے ہٹ گئے۔

”تم کدھر کو جاتا؟“

تھے۔ ان آبادیوں کے کنارے کنارے ضرور غیر بنگالیوں پر ظلم و ستم ہوا تھا۔ لیکن اکثریت ابھی
 محفوظ تھی۔ شاید محض اس لئے کہ آبادی بہت زیادہ تھی۔

میں چھاؤنی کے دروازے پر اس جگہ آ گیا جہاں فوج کی چیکنگ پوسٹ لگی تھی صوبیدار
 بمبر صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے قریب جا کر انہیں بتایا کہ مجھے کوٹھی مل
 گئی ہے اور اب میں محمد پور اپنے عزیزوں کو لینے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کچھ تشویش کا اظہار
 کیا۔

”ان آبادیوں میں ابھی تک زیادہ گڑ بڑ نہیں ہوئی۔ لیکن وہاں تک

جانے کا راستہ خطرناک ہے۔ یہ خالص بنگالی علاقہ ہے۔ اور شہر میں پولیس بھی ان
 ہی کی ہے۔ ہماری فوج کا ایک سپاہی بھی شہر میں نہیں ہے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”صوبیدار صاحب! بنگالی بھائی بھی ہمارے مسلمان بھائی ہیں
 انہوں نے ہی مسلم لیگ بنائی تھی۔ انہیں درغلا یا گیا ہے۔ راستے میں مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔
 ”مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔“

صوبیدار صاحب مجھے دیکھتے رہ گئے اور میں چھاؤنی سے نکل کر اس سڑک پر آ گیا
 جو ایئر پورٹ کو جاتی تھی۔ ایئر پورٹ بالکل پاس ہی تھی۔ وہاں اسی طرح غیر بنگالی کنبوں
 کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ مشرقی پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے غیر بنگالی اسی طرح
 سے قطاروں میں کھڑے ہوئی جہاز کا ٹکٹ اور پیرمٹ لینے بے یار و مددگار کھڑے تھے۔
 مجھے محمد پور کا راستہ معلوم تھا۔ میں اس سے پہلے کئی بار وہاں گیا تھا۔ یہ بستی ایئر پورٹ سے
 اتنی ہی دور تھی جتنی دور لاہور ریلوے سٹیشن سے سمن آباد سے۔ یہ علاقہ بھی سمن آباد سے ملتا
 جلتا تھا اگرچہ سمن آباد ایسی خوبصورت اور کشادہ کوٹھیاں وہاں کم تھیں اور محمد پور میں بعض
 بڑے گنجان علاقے بھی تھے جو اچھرہ اور گڑھی شاہو کی یاد تازہ کرتے تھے۔ میں رکشے کی منتظر
 میں کھڑا ہو گیا۔

بنگالی سائیکل رکشا والے میرے ارد گرد منڈلانے لگے۔ میں تیز رفتار سواری میں محمد پور
 کا راستہ طے کرنا چاہتا تھا۔ کیسی وہاں تھی نہیں۔ رکشا کوئی خالی نہیں تھی آخر ایک رکشا

میں نے کہا۔

”پھر بھی میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو یہاں سے اٹھ کر چھاؤنی چلے جانا چاہیئے جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر یہاں واپس آ جانا۔“

زلفی ہنس کر بولا۔ حالات بالکل ٹھیک ہیں یہاں بھائی جان! محمد پور میں ہمیشہ سے امن رہا ہے اور امن رہے گا۔ یہاں دھان منڈی میں شیخ نجیب کی کوٹھی ہے یہاں کبھی کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی۔
میں نے انہیں بتایا کہ راتے میں بنگالیوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ بڑے پریشان سے ہو گئے۔

”خدا کا شکر ہے کہ آپ بچ کر نکل آئے، ہم تو اول یہاں سے باہر نہیں جاتے۔ غیر ملکی گاہک اپنی گاڑیوں میں ہی یہاں پر آ جاتے ہیں۔ اگر کبھی گلشن وغیرہ کے علاقے میں جانا بھی ہوتا ہے تو غیر ملکی لوگوں کے ساتھ ان کی گاڑیوں میں جاتے ہیں۔“

گلشن کا علاقہ ڈھاکے کا نیا علاقہ ہے۔ جس طرح سے لاہور میں گلبرگ کا علاقہ ہے۔ وہاں زیادہ تر غیر ملکی سفارتی لوگوں کے جنگلے تھے۔ میں نے کھانا کھایا اور آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ دوپہر کے بعد ہم محمد پور کی مارکیٹ میں آ گئے۔ یہاں بہاریوں کی بے شمار دکانیں تھیں سبزی فروش، پھل فروش، سقائی، مکیانہ فروش، کپڑے فروخت کرنے والے..... ساری دکانیں کھلی تھیں اور خوب کاروبار ہو رہا تھا۔ بنگالی بھی دکھائی دے جاتے تھے۔ مگر وہ بہت کم تھے۔ زیادہ لوگ بہاری اور دوسرے پنجابی وغیرہ تھے۔

واپس آ کر ہم برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ اوپر والی منزل میں ایک نہایت شریف متوسط درجے کا لکڑی کنبہ رہتا تھا۔ محمود نامی دُبلایا سا نولے رنگ کا بہاری لڑکا ہمارے پاس بیٹھا ہمیں اپنی خوفناک داستان سنارہا تھا کہ کس طرح سے وہ چٹا گانگ سے اپنی دونوں جوان بہنوں کو لے کر ڈھاکہ پہنچا تھا۔ اس کی دونوں بہنیں چٹا گانگ کے میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھیں اور ہسپتال میں رہتی تھیں۔ ان کے نکلتے ہی کمتی باہنی کے

ظاہر ہے اہوں نے میرے رنگ روپ اور بولنے کے انداز سے پتا کر لیا تھا کہ میں پنجابی ہوں۔ میں نے کہا۔

”اپنی ماسی کے ہاں جا رہا ہوں۔ دھان منڈی میں۔“

شیخ نجیب الرحمان کی کوٹھی کے ساتھ والی کوٹھی میں.....

موسیٰ، دھان منڈی اور شیخ نجیب الرحمان کا نام کام کر گیا۔ انہوں نے مجھے آگے جانے کی اجازت دے دی۔ رکشا ڈرائیور نے مسکرا کر مجھے گردن گھما کر دیکھا اور کہا۔
”بابو جی! تم لوگ بڑا خوش قسمت جو بچ گیا۔ ادھر تو یہ لوگ کسی کو نہیں چھوڑتا۔“
میں نے کہا۔ ”بھائی تم بھی مسلمان ہم بھی مسلمان بھائی بھائی ہے پھر ایک دوسرے سے کیا ڈرنا۔“

بنگالی رکشا ڈرائیور نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان میں ہندو کمتی باہنی اور بھارت کے غیر مسلم ایجنٹوں نے نفرت کا ایسا شدید بیج بو یا تھا کہ مسلمان، مسلمان کی گردن پر چھری چلا رہا تھا۔ رکشا اب فارم گیٹ سے نکل کر محمد پور کے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ فارم گیٹ ایوب خان نے بنایا تھا۔ رکشا اب محمد پور میں داخل ہو گیا تھا۔ دائیں بائیں اک منزلہ پرانی طرز کی برآمدوں والی ویران سی کوٹھیاں تھیں۔ یہاں بہت کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ رکشا مارکیٹ میں جا کر کارپوریشن ہال کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہاں کافی رونق تھی۔ میں رکشے سے اترا اور اس عمارت کی طرف آگیا جہاں میرے خالہ زاد بھائی رہتے تھے۔ ان کی عمارت کے باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔

میں ڈرائیونگ روم میں داخل ہوا تو زلفی اور فیضی مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ وہ ایک امریکی بوڑھی عورت کو قالین کھول کر دکھا رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں صرف ان کے لئے ڈھاکہ آیا ہوں۔ وہ بڑے متاثر ہوئے کہ اتنے شدید حالات میں بھی میں آ گیا۔ حالانکہ اگر کوئی انسان اپنے کسی عزیز کی خاطر اس قسم کے خراب حالات میں سفر کرتا ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ بیچے لاہور میں سب گھر والے ان کے لئے بے حد پریشان ہیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگے کہ یہاں محمد پور میں تو سب

ہر چلا تھا۔ اب سوال ان کے پرمٹ حاصل کرنے کا تھا۔ میں نے بہت زیادہ سفارش ڈھلائی تو جیسے پرمٹ مل گئے۔ لیکن ان پرمٹوں کا نمبر ایک ہفتے کے بعد آتا ہے۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ابھی ہمیں ڈھاکہ میں ایک ہفتہ اور بسر کرنا تھا۔ ڈھاکہ شہر کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ بم پھینکے جاتے تھے۔ غیر جنگالوں کو موقع پا کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ دوسرے شہروں اور دوسرے اضلاع کے دیہات میں بہت خراب حالت تھی۔ ایسی ایسی دل خراش خبریں سننے میں آرہی ہیں کہ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے تھے۔ ہم شام کو محمد پور میں اپنے مکان کے باہر بیٹھ جاتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ وہاں سلہٹ کا ایک قایمیں کا سوداگر خریدیں بھی آ جاتا۔ اس نے کمال ہوشیاری سے کام لے کر اپنا سارا مال بک کر دلا کر لاہور بھجوا دیا تھا اور غوجیب میں پرمٹ لے کر واپس جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس کا کام اب شہر کے غیر جنگالیوں میں افراتفری پھیلنا تھا۔

”بھائی صاحب اپنا نہیں کل کیا ہو جائے۔ فوج حملہ کرنے ہی والی ہے۔ شیخ نجیب الرحمن کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ مشرقی پاکستان میں بھارتی جاسوس

تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔“

میں ایک روز اپنے مکان کے پچھواڑے آنگن میں کرسی ڈالے بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ساتھ والے مکان کی کھڑکی میں ایک سانوی سی لڑکی کا اداس چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ اس لڑکی نے مجھے اشارہ کر کے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے کتاب پر سے ہٹا کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ میں نے اس سے اشاروں میں پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ اس نے ایک رقعہ میری طرف پھینک دیا یہ کاغذ کی گولی سی میرے پاؤں کے پاس آگئی۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

”آج رات بارہ بجے اسی آنگن میں میرا انتظار کرنا۔“

میں پریشان سا ہو گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ آدھی رات کو کوٹھے پھلانگ کر لڑکیوں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ وقت نہیں رہا تھا۔ اور پھر میں ڈھاکہ کے اس مقصد کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ رات دس گیارہ بجے تک ہم ڈرائیونگ روم

ہندو غنڈوں نے اس ہوٹل پر حملہ کر دیا اور لڑکیوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ ان بچیوں میں سے بہت کم بچیاں بعد میں برآمد ہو سکیں۔ باقیوں کا آج تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں! محمود نے کہا۔

”فرید پور میں ہماری گاڑی پر حملہ ہو گیا۔ مکتی باہنی والے چن چن کر گاڑی کے غیر جنگالیوں کو قتل کرنے لگے۔ پلٹ فارم خون سے بھر گیا میں نے بڑی مشکل سے جنگالی کہہ کر اپنی اور اپنی بہن کی جان بچائی۔“

محمود کی تینوں بہنیں کالج میں پڑھتی تھیں۔ ایک چٹا گانگ میڈیکل کالج میں تھی۔ اور باقی دو ڈھاکہ کے کسی کالج میں پڑھتی تھیں۔ تینوں گھر پر بیٹھی تھیں۔ کیونکہ ڈھاکہ کے سارے سکول اور کالج بند تھے۔ ہر کشا، ٹیکسی اور گاڑی پر سیاہ جھنڈی لگی تھی! میں نے دونوں بھائیوں کو واپس چھاؤنی لے جانے کی کوشش کی تو انہوں نے ہنس کر کہا

”گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ چند ایک روز میں حالات بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر محمد پور پر حملہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو لاکھوں کی تعداد میں

غیر جنگالی رہتے ہیں۔“

ایک روز میں نے جنگال رائفلز کا ٹرک دیکھا۔ وہ منڈی کے باہر کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ فوج کے باغی دستوں کا ٹرک ہے اور اپنے فوجیوں کے لئے سبزی گوشت اور آٹا دال وغیرہ لینے آیا ہے۔ شام کو میں ایک غیر ملکی دیگن میں بیٹھ کر واپس چھاؤنی گیا اپنے فوجی عزیز کو ساری صورت حال بتائی۔ اس نے کہا۔

”آپ لوگ بہت بھاری غلطی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کو فوراً

چھاؤنی آجانا چاہیے کوئی پتا نہیں کہ حالات کیا سے کیا رخ اختیار کریں۔“

دوسرے دن زلفی اور فیضی نے کچھ مال اکٹھا کیا اور اسے ایک آسٹریلیائی کمیشن کے ایک ٹرک میں ڈال کر محمد پور سے نکال کر چھاؤنی پہنچا دیا۔ اب میں بھی چھاؤنی کی بجائے محمد پور میں ہی رہ گیا تھا۔ میں نے دونوں بھائیوں کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ واپس لاہور چلے جائیں۔ میں ان کے لئے واپسی پی۔ آئی۔ اے کے ٹکٹ ساڑ

میں بیٹھتا ناش کھیلے رہے۔ پھر سب سو گئے۔ میں بھی اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ دل یہی کہتا تھا کہ بارہ بجے تک جاگو اور معلوم کرو کہ ہسپتال کی بنگالی لڑکی کیا کہنا چاہتی ہے۔

ٹھیک سات کے بارہ بجے میں پچھلے آنگن میں آ گیا۔ یہاں ایک شریفے کا درخت تھا جس میں اس کی آڑ میں ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس بنگالی لڑکی کا چہرہ دیوار پر نمودار ہوا۔ پھر اس نے ہمارے آنگن میں آہستہ سے چھلانگ لگادی۔ میں درخت کے سائے میں سے باہر نکل آیا۔ اندھیرے میں اس سانولی بنگالی لڑکی کی سرخ آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کیا کہنا چاہتی ہے اور اس نے مجھے کس لئے بلایا ہے؟ اس نے اپنا چہرہ میرے قریب لاکر سرگوشی میں کہہ سانس بھر کر کہا۔

”تم سے محبت کرتے.....“

اس کے گرم سانس میں سانپ کی پھنکار تھی۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

”تم غلطی پر ہو۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ جاؤ اپنے گھر واپس کو دجاؤ نہیں تو میرا بھی تمہارے ماں باپ کو خبر کر دوں گا۔“

اس بنگالی لڑکی نے میری گردن میں اپنی سیاہ سانپ ایسی نہیں ڈال دیں اور مسکرا کر کہنے لگی۔

”تم واپس نہ جاؤ۔ یہیں رہ جاؤ۔ ہم یہاں سے بھاگ سہٹ چلے جائیں گے۔ وہاں میری ایک بہن کا مکان ہے وہ سہٹ سے بچاس میل دور گھنے جنگل میں دریا کے کنارے رہتی ہے۔ وہاں ہوا کے سرخ پھول کھلتے ہیں جن کی شراب بنائی جاتی ہے۔ تم میرے ساتھ وہاں چلے چلو۔ ہم ساری زندگی وہاں رہیں گے۔ چلو میرے ساتھ وہاں ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ میں تمہیں محبت کا وہ پھول دوں گی جس کی خوشبو

تم ساری زندگی نہ بھلا سکو گے۔“
مجھے بنگال کی جادوگریاں یاد آ گئیں۔ میں نے اس کے ہاتھ چھو جھٹک دیئے اور

کہا۔

”ہوش کرو احق لڑکی! تم ابھی غیر شادی شدہ ہو۔ تم ایک شریف مسلمان گھرانے کی لڑکی ہو۔ کیا تمہیں اپنے ماں باپ کی عزت کا بھی خیال نہیں؟“
وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنسی جیسے کہہ رہی ہو۔ بڑے احق ہو تم جو ایک ایسی لڑکی کو اس کے ماں باپ یا دولا رہے ہو جو ان سب کو چھوڑ کر کچھ ہونے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں آن گری ہے وہیں نے اے کسی نہ کسی طرح واپس اپنے مکان میں کود جانے پر مجبور کر دیا صبح میں نے اس لڑکی کے بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہندو بنگالی لڑکی ہے جو سہٹ سے ڈھا کہ کو اپنی سہیلی کے پاس آئی ہوئی ہے۔ چند روز بعد وہ واپس سہٹ چلی گئی۔ پھر معلوم ہوا کہ اُسے ہندو بھارتی گوریلا فورس نے کرائے پر لے رکھا تھا اور اس سے مسلمان بچیوں اور بچھانوں کو گمراہ کر کے، درختا کر فوج کے ٹھکانوں کی جاسوسی کرنے کا کام لیتے تھے۔

پی۔ آئی۔ اے سے پر ہماری باری ابھی نہیں آرہی تھی۔ ہمارا پرمٹ نمبر بچاس ہزار کے قریب تھا اور ابھی سات ہزار واں نمبر جا رہا تھا۔ ایک روز میں نے اپنے عزیز زلفی سے کہا کہ سادر جاتے ہیں۔

”وہاں جرمن ملک پلانٹ میں میرا ایک پشاور کا دوست کام کرتا ہے“

اس کی خیر خیریت دریافت کرنی چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں بیچارہ کس حال میں ہے۔“

سادر ایک چھوٹی سی بستی ہے جو ڈھا کے سے پندرہ میل کے فاصلے پر چٹاگانگ کی طرف آباد تھی۔ یہاں جرمن ملک پلانٹ والوں نے ایک بڑی خوب صورت ماڈرن کالونی بنائی ہوئی تھی۔ اس کالونی میں میرا وہ پشاور دوست کام کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جرمن کمپنی والوں کے ساتھ ہو گا اور کمپنی ہاؤس کے غنڈے اس کالونی میں نہیں جائیں گے۔ اسی لئے

جانب کھڑے سنبھل کے سرخ پھولوں والے درختوں کا سایہ تھا۔ ہم ان درختوں سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے۔ یہاں ہمیں دُور سے ایک جلوس نظر آیا۔ لمبے لمبے بانس۔ سُرخ ٹوپیاں اور لوگوں کا ہجوم..... زلفی نے کہا۔
 ”کہیں کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔ اس قسم کے جلوس غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا کرتے ہیں۔“

اب ہم جلوس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ جلوس سادر کی طرف جا رہا تھا۔ لوگوں کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ انہوں نے سڑک چھوڑ رکھی تھی۔ ہماری کار تیزی سے ان کے قریب سے گزر گئی۔ جلوس بڑے سخت اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ میں وہ نعرے یہاں نہیں لکھ سکتا دو میل کے فاصلے پر سادر کی جرم کالونی تھی۔ ہماری کار کالونی کے بانس کے گیسٹ میں سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ بندہ نہ بندہ ذات.... زرد رنگ کی چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کے ویران برآمدوں میں سوکھے پتے گرے پڑے تھے۔ ایک بنگالی لڑکا درخت تلے بیٹھا تھا۔ ہم کار اس کے قریب لے گئے۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں اس سے پوچھا کہ یہ جرم کالونی والے لوگ کہاں چلے گئے؟ اس نے نفرت سے ہماری طرف دیکھا۔ کیونکہ رنگ اور شکل و صورت کے لحاظ سے ہم صاف پنجابی معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے کہا۔

”وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ ادھر کوئی نہیں ہے۔“

”زلفی نے مجھے آنکھ ماری۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند کر لیا۔ ہم نے گاڑی کالونی کے گیسٹ سے باہر نکال لی۔ زلفی بولا۔
 ”ہم نے یہاں آکر بڑی غلطی کی۔“

ہمیں پہلی بار شدید تنہائی اور بے بسی کا احساس ہوا۔ ہم نے اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کیا۔ مکتی باہنی کے چھپے ہوئے ہندو غنڈوں کے زرخ میں گھرے ہوئے بالکل اکیلے..... گاڑی سڑک پر آئی تو اس تنہائی میں پہلی بار دہشت کا رنگ آ گیا۔ کیونکہ وہی جلوس اب ہمارے بالکل سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ زلفی نے چونک کر کہا

میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔
 زلفی نے کہا۔

”میں خود ذرا ڈھاکے سے باہر نکل کر سیر وغیرہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن فیضی کو بالکل علم نہیں ہونا چاہیے وہ ہمیں بالکل نہیں جانے دے گا۔
 ”تم بے فکر رہو۔ ہم اسے بالکل نہیں بتائیں گے۔ بس یہی کہیں گے کہ چھاؤنی رہے ہیں۔“

چنانچہ ایک دن ناشتے کے بعد ہم نے گاڑی پکڑی۔ زلفی میٹرنگ پر بیٹھا۔ فیضی یہی کہا کہ ذرا چھاؤنی تک جا رہے ہیں اور محمد پور سے باہر نکل کر سادر کی طرف روانہ گئے۔ یہ ہماری ایک سنگین غلطی تھی کہ اس سنگین صورت حال میں ہم ڈھاکہ شہر سے باہر جا کا خطرہ مولی رہے تھے۔ ڈھاکہ شہر سے باہر تو بے حد حالات خراب تھے اور ہر طرف مکتی باہنی کا راج تھا۔ کھلنا، باریسال اور نرائی گنج میں غیر بنگالیوں کی بھاری تعداد کو مار دیا گیا تھا۔

بہر حال یہ ہماری حماقت تھی یا جو کچھ بھی تھا۔ ہماری واکس بالی گاڑی شہر سے باہر نکل گئی تھی اور اب بوڑھی گنگا کا پتلا سا پل عبور کر رہی تھی۔ یہاں دن وے ٹریفک ہے۔ پل پر سے گذر کر ہم دکانوں کے قریب سے گذرے تو زلفی نے کہا۔
 ”ادھر دیکھو!“

میں نے دیکھا۔ وہاں قطار اندر قطار دکانیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ کئی دکانیں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ سڑک کنارے اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اس نے کہا۔ ”یہ تمام دکانیں غیر بنگالیوں کی تھیں۔ انہیں لوٹ کر ان کے مالکوں کو قتل کر دیا گیا۔“

میں پہلی بار کانپ سا گیا اور مجھے ۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب بے خیالی میں ام ترس کے سکھوں کے علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ اب ہم ڈھاکہ سے دس میل باہر نکل آئے تھے۔ یہ سڑک سیدھی دوسرے بڑے شہر کو جاتی تھی۔ اس سڑک کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے اور جگہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ سڑک پر دوا

”مارے گئے یہ لوگ تو بالکل سڑک کے بیچ چلے آ رہے ہیں۔“

سڑک زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ چوڑی تھی اور جلوس نے ساری سڑک روک رکھی تھی۔ وہ بانس ہلا ہلا کر نفرے لگاتا چلا آ رہا تھا۔ شاید وہ کسی گاڑی پر حملہ کرنے جا رہا تھا۔ ایک بار تو مجھے بھی پسینہ آ گیا۔ گاڑی جلوس کے قریب پہنچ رہی تھی۔ جلوس راستہ نہیں دے رہا تھا وہ سڑک نہیں چھوڑ رہا تھا۔ شاید جلوس کے لوگوں نے ہمیں جلتے دیکھ لیا تھا اور پہچان لیا تھا کہ ہم پنجابی ہیں۔ اب واپس ہماری گاڑی دیکھی تو سڑک کے بیچ میں آگئے تھے تاکہ حملہ کر کے ہمیں گاڑی سمیت تہ تیغ کر دیا جائے۔

قریب پہنچ کر زلفی نے بریک لگائی تو میں نے چیخ کر کہا

”خدا کے لئے بریک نہ لگاؤ۔ گاڑی کی سپیڈ بستی میل فی گھنٹہ کر دو۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

زلفی نے ایسا ہی کیا۔ ایک دم سے کئی دہائی اور گاڑی کی سپیڈ تیز ہو گئی۔ سپیڈ تیز ہوتے ہی گاڑی جلوس کے اوپر جا پہنچی۔ لوگ ایک دم سے ادھر ادھر ہٹ گئے۔ سڑک پر راستہ بن گیا۔ زلفی اور میں نے اپنے اپنے سر نیچے کر لئے۔ زلفی صرف شیشے میں سے سڑک کو دیکھ رہا تھا گاڑی بے پناہ رفتار کے ساتھ جلوس کے بیچ میں سے گزر گئی۔ لوگوں نے گاڑی پر زور زور سے بانس مارے۔ انہوں نے گاڑی کے پیچھے بھی بانس پھینکے۔ لیکن ہماری گاڑی موت کے منہ سے نکل چکی تھی۔

کانی دور تک ہم میں سے کسی نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ رنگ زلفی کا بھی زرد ہو گیا تھا اور رنگ میرا بھی زرد ہو گیا تھا۔ ہم بیچ موت کے منہ سے نکل کر آ رہے تھے۔ مجھے کچھ معلوم تھا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے تو ابھی ایسے ایسے بھیانک واقعات پیش آنے والے تھے کہ ان کے مقابلے میں یہ حادثہ ایک پرکاش کی وقعت نہیں رکھتا تھا۔ ڈھاکہ فال ہو جا گا۔ اس وقت تک تو کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا۔

زلفی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے..... خدا نے ہمیں بچا لیا۔ موت ہمارے بالکل سامنے کھ

تھی۔ ان ظالم لوگوں نے ہمارا آٹکا بوٹی کر دینی تھی۔“

ڈھاکہ شہر کی عمارتیں دُور سے نظر آنے لگیں۔ ہمارا جی بائیں جانب میر پور کی ہماری بستی گزرنے لگی۔ اب وہی بوڑھی گنگا والا تنگ سا بانس کا پُل آ رہا تھا۔ زلفی نے کہا

”خدا سے دعا کرو کہ وہاں سے ٹریفک ہماری طرف سے کھلا ہو۔“

مقصود یہ تھا کہ ہم وہاں رک کر انتظار کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ دودھ کا جلا چھا چھ کو بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ ہماری گاڑی پُل کے قریب پہنچی تو معاملہ برعکس نکلا۔ پُل پر ٹریفک مخالف سمت سے جاری تھی۔ ہم نے گاڑی ایک درخت کے نیچے کھڑی کر دی۔ سامنے بنگالی پان والے کا کھوکھا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے بنگالی نوجوان بڑے غور سے ہماری طرف گھورتا نظر آ رہا تھا۔ ایک ٹرک بالکل ہمارے قریب سے موڑ کاٹ کر گزر گیا۔ زلفی نے جلدی سے کہا۔

”دیکھا! کم بخت ہمیں مگر مارنا چاہتا تھا۔“

خدا خدا کر کے ٹریفک کھلی۔ یہ وقفہ ہمیں ایک سال کا وقفہ لگ رہا تھا۔ زلفی نے گاڑی جلدی سے سمارٹ کی اور ہم پُل پر سے گزر کر محمد پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر آ کر ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ جب ساری کہانی فیضی کو سنائی تو وہ ہم دونوں پر برس پڑا۔ پھر اس نے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ ہماری جان بچ گئی۔ اُسی وقت اقبال ہال کی طرف دھاکہ ہوا

دکانیں جلدی جلدی بند ہو گئیں۔ کسی نے ایک پنجابی سٹور پر دستی بم دے مارا تھا۔ ہم بھی بھاگ کر ڈرائیونگ روم میں آگئے اور دروازے کھڑکیاں بند کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی دودھ لکے اور ہوئے۔ پھر محمد پور میں گہری خاموشی چھا گئی..... شام کو کہیں جا کر لوگوں نے کھڑکیاں دروازے کھولے اور ڈرتے ڈرتے باہر نکل کر سودا سلف کی خریداری کرنے لگے۔

اس رات محمد پور میں ایک بہت بڑا دھماکا ہوا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کی روشنیاں لگی کر دیں۔ ہم نے بھی کھڑکیاں بند کر دیں۔ ایک آدھ بار باہر جھانک کر دیکھا سامنے والی سڑک بالکل سناں تھی۔ ایک جیب تیزی سے بھاگتی ہوئی گزر گئی۔ سڑیٹ لمپوں کی روشنی میں کچھ بنگالی نظر آئے جو اس میں لاٹھیاں لئے سوار تھے۔ وہ رات محمد پور

گھنٹے ڈیوٹی دیتے تھے۔ دن میں صرف دو ایک گھنٹے ریسٹ کرتے تھے میں نے اُسے بتایا کہ میں واپس لاہور جا رہا ہوں۔ لیکن ابھی میرے پرمٹ کے نمبر کی باری دُور ہے۔ اس نے کہا۔

”غیر بنگالی یہاں سے جا رہے ہیں اور ادھر سے بنگالی خاندان یہاں دھڑا دھڑ چلے آ رہے ہیں۔ خدا جلنے کیا ہونے والا ہے۔ اللہ ہمارے گناہ معاف کرے۔“

مجھے اس کے پاس بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی تو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔
”تمہیں اب واپس محمد پور نہیں جانا چاہیے۔ یہ لوگ چلتے رکشا پر بھی بم مار دیتے ہیں۔ ان کو پتہ لگ جاتا ہے کہ بنگالی کون ہے اور غیر بنگالی کون ہے۔ تم میرے ہوسٹل میں ہی ٹھہر جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں یار۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ جو رات قبر میں آتی ہے بس وہی رات آتی ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔“

وہ کمرے سے باہر نکل مجھے چھوڑنے آیا۔ سامنے درختوں میں اس کی جیب کھڑی تھی جس پر ایک بہت بھاری بھر کم مٹین گن لگی تھی۔ اس نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ وہ مجھے جیب پر محمد پور تک نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ فوج کو شہر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں ہوسٹل کے لان میں سے گزر کر گیٹ پر آ گیا۔ ایئر پورٹ کی عمارت پر روشنی ہو رہی تھی۔ ایئر پورٹ سے رکشا مل جاتے تھے۔ میں وہاں رک گیا۔ ایک رکشہ میرے قریب آ کر رکا۔ بنگالی نوجوان نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ہمارا اصول تھا کہ ہم کسی جگہ سے رکشے میں سوار ہوتے وقت محمد پور کا نام نہیں لیتے تھے کہ ہم غیر بنگالی ہیں۔ پھر بھی ہماری تسلی ہو جاتی تھی۔

ایئر پورٹ والی سڑک سے بائیں طرف گھومے تو یہاں کچھ بنگالی کھڑے تھے۔ انہوں نے میرے رکشے کو گھور کر دیکھا۔ میں نے بنگالی زبان میں رکشے والے سے کہا۔ کہ رکشا روکے نہیں۔ میں دھان منڈی جا رہا ہوں شیخ عجیب سے ملنے۔ بنگالی رکشا والا کچھ مرعوب ہو گیا۔ وہ رکشا لے کر نکل گیا۔ محمد پور کی حدود میں داخل ہوا تو جان میں جان آئی۔ یہ مصیبت تھی کہ مجھے شام کو

پر بڑی بھاری گزری۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ سارے ڈھاکے شہر پر کیتی باہنی اور ہندو پراپیگنڈے سے متاثرہ بنگالیوں کا قبضہ تھا جو جگہ جگہ غیر بنگالیوں کے محلوں میں بم مار رہے تھے۔ پاک فوج بارکوں میں بند تھی۔ شہر اس کے لئے آؤٹ آف بانڈ قرار دے دیئے گئے تھے۔ چنانچہ عوامی لیگ کے غنڈے من مانی کر رہے تھے۔

دن چڑھا تو سب لوگ سے باہر نکلے۔ مارکیٹ میں بھی دکانیں کھل گئیں۔ پتا چلا کہ رات ایک بھاری کے مکان پر عوامی لیگ کے غنڈے بم مار گئے تھے۔ بم سے مکان کا ایک حصہ گر گیا تھا۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں چھاؤنی گیا تو میرے فوجی عزیز نے کہا

”بھئی آپ لوگ محمد پور میں کیوں بیٹھے ہیں۔ یہاں چھاؤنی میں آجائیں۔ وہاں حالات بہت سنگین ہو رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ بھی تو یہاں کچھ اچھے حالات میں نہیں ہیں مجھے معلوم ہے کہ آپ کے سارے بنگالی ملازم بھاگ گئے ہیں اور آپ کو سبزی اور گوشت بھی بنگالی دکاندار سپلائی نہیں کر رہے۔“

دور در پہلے میرے فوجی عزیز نے بتایا تھا کہ ان کا اردنی چھاؤنی کی ایک دکان سے گوشت اور سبزی لینے گیا تو بنگالی دکاندار نے یہ کہہ کر گوشت دینے سے انکار کر دیا کہ وہ بنگالی فوج کو مال نہیں دے گا۔ پھر تو وہ بنگالی دکاندار بھی چھاؤنی کی دکانیں بند کر کے بھاگ گئے تھے۔ اس روز میں ایئر پورٹ کے سامنے پاک ایئر فورس کے ہوسٹل میں اپنے دوست حسن سے ملنے گیا۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ گلے ملا۔ مجھے ان حالات میں ڈھاکے میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ آفیسرز میں کے سارے بنگالی باروچی اور ملازم بھاگ گئے ہیں۔

”ہم اپنا کھانا آپ بناتے ہیں اور کھانے کے بعد اپنی تھالیاں اور برتن خود صاف کر کے رکھتے ہیں۔“

یہ وہاں کے فلائیٹ آفیسروں اور سارے ہی آفیسروں کا حال تھا۔ وہ چوبیس چوبیس

رکھے بال بچوں کے ساتھ پڑے تھے۔ زلفی اور فیضی جہاز پر سوار ہو گئے اور جہاز انہیں لے کر کراچی کی طرف پرواز کر گیا۔ میں اکیلا واپس محمد پور چلا گیا۔

دوسرے روز آدمی رات کو ایک دھماکہ ہوا اور پھر مسلسل سٹین گنیں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ محمد پور کے لوگ جاگ پڑے۔ یہ دھماکہ لمبوں کے دھماکوں سے مختلف تھے تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ فوج ایکشن میں آگئی ہے۔ محب وطن بنگالی اور غیر بنگالی گھروں سے باہر نکل آئے اور پاکستان زندہ باد، پاک فوج زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگائے۔ صبح ہونے تک شہر کی ساری عمارتوں سے سیاہ جھنڈے اتار دیئے گئے تھے اور وہاں پاکستان کے جھنڈے ہرا رہے تھے۔ شہر کی سڑکوں پر پاک فوج کی جیپیں اور جوان گشت کر کے امن وامان بحال کر رہے تھے۔ محب وطن عوام نے فوج کے اس ایکشن سے سکھ کا سانس لیا تھا۔ بھارت کے بھیجے ہوئے ہندو کمانڈر اور رکتی باہنی کے ایجنٹ بھارت کی سرحد عبور کر کے بھاگ گئے ریشام تک سارے شہر میں امن وامان قائم ہو گیا۔ دکانیں کھل گئیں۔ کاروبار پھر سے شروع ہو گیا۔ دفتر اور بینک کھل گئے۔

میں رکنے میں بیٹھ کر چھاؤنی کیا۔ میرا عزیز گریجر یہ نہیں تھا۔ میں نے وہاں ان کے بال بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا اور پھر شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے نکل گیا۔ سارا شہر جیسے سکھ سانس لے رہا تھا۔ محمد پور اور میر پور کے محب وطن لوگ آپس میں مٹھائی تقسیم کر رہے تھے۔ سارے مشرقی پاکستان میں امن بحال ہو گیا تھا۔ اب میں نے سوچا کہ واپس لاہور جانا چاہیے کیونکہ ایئر پورٹ پر مہاجرین کی تعداد ایک دم سے بے حد کم ہو گئی تھی لوگ واپس اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ میں ایک روز جہاز میں سوار ہوا اور واپس لاہور آ گیا۔ ڈھلکے میں امن کی حالت کی بحالی کے بعد کاروبار بھی بے حد تیز ہو گیا تھا۔ زلفی اور فیضی بھی واپس ڈھاکہ چلے گئے۔

لیکن دو مہینے بعد شریلنگا نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ عام معافی مل جانے کے بعد بھارتی حکومت نے اپنے بے شمار مہاجرین بنگالی کمانڈو مہاجرین کی صورت میں مشرقی پاکستان میں دھکیل دیئے تھے۔ ان لوگوں نے مشرقی پاکستان میں آتے ہی وہاں کے مسلمانوں

محمد پور سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہیے تھا۔ وہ رات آرام سے گزرتی تھی۔ صبح یہ افواہ عام تھی کہ نرائن گنج جیوٹ مل افس تمام غیر بنگالی ملازمین کے کنبوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ایک آدمی وہاں سے کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر آیا تھا۔ اس نے جو بھیاں لگ داتے سنائے تو اس سے لوگوں پر ایک ناقابل بیان دمشت طاری ہو گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دھان منڈی کی طرف نکل گئے۔ میں شیخ عجیب کی کوٹھی دیکھنا چاہتا تھا۔ زلفی گاڑی چلا رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دھان منڈی کا علاقہ بالکل ہمارے من سمن آباد کی طرح کا ہے۔ بالکل اسی قسم کی کوٹھیاں دونوں طرف بنی ہوئی ہیں۔ زلفی نے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ سامنے شیخ عجیب کی کوٹھی ہے۔ کوٹھی کا پھانگ اور برآمدے کے ستون رنگ کے تھے۔ آدھا پھانگ کھلا تھا۔ لان کے گھاس پر بنگالیوں کی ٹوبیاں بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ گیٹ پر رکتی باہنی کے آدمی سٹین گنیں ہاتھ میں لے پہرہ دے رہے تھے۔ کوٹھی کی دوسری منزل کی گیلری ویران ویران سی تھی۔ وہاں کو انسان یا بچہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے والی کوٹھی کے لان میں الگنی پربچوں کے کپڑے سکھانے کے لئے ڈالے ہوئے تھے۔ جب مجھے پتا چلا کہ شیخ عجیب کی کوٹھی کو راکٹ مار کر تبا کر دیا گیا ہے تو میرے ذہن میں بے اختیار سامنے والی کوٹھی کا خیال آ گیا تھا جس کے لا الگنی پربچوں کے کپڑے سکھانے کے لئے ڈالے گئے تھے۔

زلفی نے یہاں گاڑی کی رفتار مدہم کر لی تھی۔ ہم کوٹھی سے آگے نکل گئے۔ اوپر ہو کر پھر واپس اپنے گھر کے سامنے آ گئے۔ اب ہم بڑی شدت سے پی۔ آئی۔ اے کے چر پر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم روز صبح جا کر ایئر پورٹ پر پتا کرتے۔ آخر ایک روز زلفی اور فیضی کی باری آگئی۔ میرے پر مٹ کا نمبر ابھی چار روز بعد آنے والا تھا۔ دونوں واپس جانے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن میں نے انہیں مجبور کر کے جہاز پر سوار کر دیا ایئر پورٹ بالکل کسی بس سٹاپ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ لاؤنج جو کبھی گرمیوں میں ٹھنڈا کرتا تھا اب گرم تھا۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ یہ تو ایک طرح سے مہاجرین کیمپ بنا ہوا تھا۔ جن کی باری ہفتے بعد آنے والی تھی وہ بھی وہاں بستر بچھائے تھوڑا بہت سا۔

بارے میں بھی بہت فکر مند تھا۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ فرج بہت جلد ان حالات کو بھی قابو میں کرے گی۔

اگلے روز پھر منشی عثمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کا گھر شہر سے باہر ایک سڑک سے ذرا ہٹ کر سپاری کے درختوں میں تھا۔ چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ یہاں وہ اپنے دو بچوں اور بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوی ابھی جوان تھی۔ بچے چھوٹے چھوٹے تھے اور بڑے چارے تھے۔ بیوی نے ہمارے لئے جلدی سے چائے بنا ڈالی۔ ہم چائے پر دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔ دوسرے روز میں پھر عثمان کے گھر چلا گیا۔ میں اپنے ساتھ بچوں اور بھائی کے لئے کچھ پھل اور دو چار ساڑھیاں بھی لیتا گیا۔ عثمان کے بچوں سے مجھے پیار سا ہو گیا۔ بڑے معصوم اور بھولے بھالے بچے تھے۔ اس کی ڈبلی پتلی سالونی سی کم گو بیوی بڑی نیک اور وفا شعار عورت تھی۔ میں اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ پہچوٹی سی فیملی بڑے سکون اور امن سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ ان کے کوارٹر کے صحن پر موسری کے درخت کی گھنی چھاؤں تھی۔

شام کو ان کے صحن میں مید کی پرانی سی کرسیاں بچا کر ہم دونوں بیٹھ جاتے۔ عثمان کی بیوی چائے بنا کر لاتی۔ معمولی قسم کے پیالوں میں ہم چائے ڈال کر پیتے اور میں انہیں لاہور کی باتیں سناتا۔ عثمان نوا کھلی کے خون ریزہ ہندو مسلم فسادات کے دنوں میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ انتقال کر چکے تھے۔ ایک بھائی ولایت میں تھا ایک بہن کوٹ میں اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ عثمان کا کنبہ یہاں اکیلے ہی پر سکون اور سادہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی میں بڑی محبت اور سلوک تھا۔ میں ایک مہینہ چٹا گانگ میں رہا اور تقریباً ہر روز شام کو ان کے ہاں جاتا رہا۔ میں نے کبھی ان کے درمیان ہلکی سی رنجش ہوتے بھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک مہینہ چٹا گانگ میں بسر کرنے کے بعد میں نرائن گنج آ گیا اور اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ میں نے فرج میں کھانے پینے کی چیزیں سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ میں کراچی سے دالیں اور گھی وغیرہ منگوا کر سپلائی کرتا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ کبھی ڈھاکے، کبھی فریدپور

میں فرج اور پاکستان کے خلاف زبردست پراپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔ شیخ مجیب کی گرفتاری کے بعد غیر پاکستانی شرییند عناصر زیر زمین چلے گئے تھے یا بھارت بھاگ گئے تھے۔ وہاں سے وہ نئے احکام لے کر جنگالی ہمارین کی شکل میں واپس مشرقی پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ بھارت نے زبردست پراپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔ جگہ جگہ تخریبی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔

ان ہی دنوں ایک ضروری کام کے سلسلے میں میں ایک بار پھر لاہور سے جہاز پر سوار ہو کر ڈھاکہ پہنچ گیا۔ ڈھاکہ ایئر پورٹ پھر سے اپنی اصلی حالت پر آ گیا تھا۔ محمد پور جانے سے بجائے میں اپنے عزیز کے ہاں چھاؤنی آ گیا۔ دوسرے روز محمد پور گیا۔ زلفی اور فیضی پوری گرم جوشی سے پھر سے کاروبار میں لگے تھے۔ انہیں سر کھلانے کی فرصت نہیں تھی۔ حالات معمول پر آ گئے تھے۔ اگرچہ کہیں کہیں شرییند تخریبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کیوں نہ چٹا گانگ چل کر جانا سے ملاقات کی جائے۔

چنانچہ میں ایک روز ریل میں سوار ہوا اور چٹا گانگ کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ سب جاتا واپس نہیں ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ مشرقی پاکستان چھوڑ کر کلکتہ جا چکی ہے۔

ان کی کوٹھی میں ایک مسلمان خاندان آباد تھا۔ یہ کوٹھی وہ فردخت کر گئے تھے۔ کوٹھی کے لان میں پھول کھلے تھے۔ بانس اور کیلے کے درخت اسی طرح کوٹھی کی چھت پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ اس کوٹھی میں اب ایک کاغذ کا سوداگر رہتا تھا۔

میں واپس اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ ہوٹل میں رات بسر کرنے کے بعد دوسرے روز ناشتا کر کے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ ایک بہاری مسلمان سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھ سے ماچس مانگی۔ میں نے ماچس دی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر شکریہ ادا کیا تو میں نے یونہی وقت گزارنے کے لئے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس کا نام عثمان تھا۔ وہ پٹن کے ایک کارخانے میں منشی تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور پاک فرج کی تعریف کرنے لگا جس کی مدد سے ملک میں امن قائم ہوا تھا اور بھارتی ایجنٹ بھاگ گئے تھے۔ اس وقت جو تخریبی سرگرمیاں ہو رہی تھیں ان کے

اسی روز چٹاگانگ پر بھارت کے بمباروں نے بندرگاہ پر حملہ کر دیا۔ ہماری ایئر فورس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بھارت کے جہاز مار گرائے۔ اس کے ساتھ ہی ہوائی سروس بند ہو گئی۔ میں چٹاگانگ والے ہوٹل میں اسکر ٹھہر گیا۔ ذات کو عثمان کے گھر گیا تو وہ لوگ کچھ پریشان تھے۔ پھر بھی انہیں یقین تھا کہ ہماری بہادر فرج بھارت کے حملے کا دمزدن شکن جواب دے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بھارت کے فرجی معاہدے نے حالات کو گہرے تبدیل کر دیا تھا۔ دوسرے مشرقی پاکستان میں صرف ڈھاکے کا ہی ایک ہوائی اڈہ تھا۔ جو جنگ میں آسلا

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ شہر کے اوپر بھارتی فوج کے کئی ہیلی کوپٹر پرواز کرتے نظر آئے۔ باہر چوک کی طرف سے لوگوں کے نعرے اور چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ بھارتی فوج کے حق میں اور پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اٹھ سرکان کی عقی کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا۔ دور کھیت سے پرے سڑک پر ہندو بنگالی نوجوانوں کا ایک چھوٹا سا جھوم لٹھیاں لہرا لہرا کر نعرے لگا رہا تھا اور شاید ایک دکاندار کے سامان کو توڑ پھوڑ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ عثمان کے بچے اور بیوی سمے بیٹھے تھے میں نے عثمان سے کہا:

”عثمان بھائی! آپ لوگوں کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ مکتی باہنی کے یہاں پہنچ جائیں گے وہ غیر بنگالیوں کو اب کھلم کھلا قتل کریں گے اور ان کے مکانوں دکانوں کو آگ لگا دیں گے۔“

عثمان کی بیوی رونے لگی۔ میں نے کہا:

”بھائی! خدا پر بھروسہ رکھو! اللہ ہمارا نگہبان ہوگا۔ اگر ہماری زندگی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نقصان نہ پہنچا سکے گی۔“

عثمان نے کہا۔ ”مگر ہم اب کب بھی کیا سکتے ہیں؟ ہم یہاں سے اٹھ کر کہاں جائیں گے؟ کہاں جا کر پناہ لیں گے؟ ہمارا تو یہاں کوئی بھی رشتہ دار نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم لوگ یہاں سے اٹھ کر گول پاڑہ میں میرے ایک بنگالی محب وطن دوست کے ہاں چلے چلو۔“

عثمان بولا۔ ”کیا ہم اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟“

”ہاں! ضرور! وہ ایک بوڑھا محب وطن بنگالی ہے اس نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لئے اپنے ایک بچے کی قربانی دی ہے۔ وہ ایک سچا مسلمان اور پاکستانی بنگالی ہے میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ تم لوگ ابھی اسی وقت میرے ساتھ ناگ پاڑہ چلو گے۔ میں کسی سواری کا بندوبست کرتا ہوں ضروری سامان ساتھ لے چلنا۔ باقی سب کچھ اسی جگہ پڑا رہنے دو۔“

پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ مکتی باہنی کے ہندو تھے۔ کچھ مسلمان بنگالی بوڑھے انہیں حقارت سے دیکھتے ہوئے گذر گئے۔ ایک بنگالی کو میں نے روتے دیکھا۔ وہ سسکیا بھرتا ہوا کہہ رہا تھا:

”ہندو اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا۔ ہماری فوج کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ ہماری فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں وہاں سے سیدھا عثمان کے گھر آ گیا۔ عثمان مکان کے باہر کھڑا تھا۔ وہ بھی پریشان تھا۔ میں نے کہا عثمان بھائی! تم نے کچھ سنا؟

عثمان کی آنکھیں اداس اور ویران ویران تھیں۔ کہنے لگا۔

”اندر آ جاؤ۔“

ہم اندر کمرے میں آ کر تخت پوش پر بیٹھ گئے۔ اس کی بیوی بھی پریشان تھی۔ اس بتایا کہ یہ خبر شہر میں عام ہے کہ فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور بھارتی فوج ڈھاکہ میں داخل ہو گئی ہے۔ میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے عثمان! یہ ہماری جیالی فوج کی شاندار روایات کے

خلاف ہے۔“

عثمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”جو تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو گیا ہے بھائی! ہماری بہادر فوج کے ماتھے پر

کلنک کا ٹیکہ لگا دیا گیا۔ چٹا گانگ کی بندرگاہ پر بھارتی جہاز آ رہے ہیں۔“

عثمان کی بیوی نے پریشان ہو کر کہا:

”اب کیا ہو گا بھائی جان! ہم کہاں جائیں گے؟ ہمارا کیا بنے گا؟ ہمارے

بچوں کا کیا بنے گا؟ مکتی باہنی تو ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔“

میں نے کہا۔ ”ہمیں گھبرا نا نہیں چاہیے بھائی! اگر یہ بھیانک حادثہ گذر

چکا ہے تو پھر ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔“

رہ سکتے تھے۔ لیکن رانگاماتی یہاں سے بہت دور ہے اور راستہ خطرناک ہے بہتر یہ ہوگا کہ میں عثمان بھائی کے بیوی بچوں کو یہاں سے چھ سات میل دور اپنے ایک دوست کے گاؤں میں چھپا دوں۔ اگر تم بھی چاہو تو وہاں پناہ لے سکتے ہو۔“

”نہیں مومن بھائی! میں اسی گھر میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔“
ٹھیک ہے۔ پھر جلدی سے ان لوگوں کو لے آؤ۔ یہاں تھوڑی ہی دیر میں مکتی باہنی کی اور بھارت کی ہندو فوج آجائے گی ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

میں مومن بھائی کو ناگ پاڑہ اس کے گھر چھوڑ کر واپس عثمان کے گھر آیا۔ ان کے بال بچوں کو ساتھ لیا اور مومن بھائی کے گھر لے آیا۔ مومن ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہیں سے ایک بیل گاڑی کا بند و بست کر لیا تھا۔ جلدی جلدی بچوں کو بیل گاڑی میں سوار کر لیا اور ہم ان کو لے کر چٹاگانگ سے رانگاماتی کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں مومن بھائی کے دوست کا گھر تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کا گھر خالی پڑا تھا۔ عثمان کے بیوی بچوں کو اس مکان میں چھپا دیا گیا۔ عثمان کو تاکید کی کہ وہ وہاں سے ہرگز ہرگز باہر نہ نکلے۔ یہ مکان کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا تھا۔ پاس ہی بنگالی فحیرے رہتے تھے۔ وہ مومن بھائی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ مومن بھائی نے انہیں تاکید کر دی کہ عثمان کے کہنے کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے۔ انہیں وہاں چھوڑ کر ہم واپس ناگ پاڑہ آ گئے۔

واپس آکر ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے سخت غلطی کی جو واپس آ گئے۔ ہمیں بھی اس مکان میں چھپ جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ابھی ہم مکان کے اندر جا کر بیٹھے ہی تھے کہ چوک میں دو ٹرک آکر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے مکتی باہنی زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ٹرکوں میں سے مکتی باہنی کے فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کودے اور لوگوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ کوئی سگریٹ پیش کر رہا ہے تو کوئی انہیں سوڈا واٹر پیش کر رہا ہے۔ مکتی باہنی والے ان

میں وہاں سے سیدھا ناگ پاڑہ چل دیا۔ یہ بستی عثمان کے گھر سے شمال کی جانب اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان میں ایک تالاب کے کنارے پر تھی۔ دس بارہ کو اتر نماک منرا مکان تھے۔ ذرا پرے ہٹ کر مولسری کے درخت والا میرے محب وطن بنگالی دوست موٹو بھائی کا مکان تھا۔ یہ بھی اک منزلہ مکان تھا۔ جس کا ایک صحن اور ساتھ ساتھ لگے تین کمرے تھے۔ مومن بھائی اس مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے گھر والے بحرین گئے ہوئے تھے۔ مجھے وہ اپنے مکان میں ہی مل گیا۔ وہ ریڈیو پر خبریں سن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے سے پیٹ کر بولا:

”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ ہماری فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ہماری فوج کو مجبور کر دیا گیا ہے۔ بے بس کر دیا گیا ہے۔ اس فوج نے جرمن جرنیل رومیل کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔ ہماری فوج کے دامن پر یہ کس نے داغ لگا دیا ہے؟“

اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:
”بہت بڑا انقلاب آ گیا ہے۔ یہ سب کچھ ہندو کی سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے۔ ہم سب کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ خیر جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔“

میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنے دوست عثمان بھائی اور اس کی فیملی کو وہاں لارہا ہوں۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا:

”یہ ایک کھلا گھر ہے۔ ہم تم اگر شہید کر بھی دیئے گئے تو کوئی بات نہیں۔ پاکستان کے لئے میں اپنے ایک بچے کی قربانی دے چکا ہوں۔ اب اگر میں بھی شہید ہو گیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن بچوں کا قتل عام نہیں ہونا چاہیئے۔ عثمان بھائی کے بچوں کو کسی دوسری جگہ چھپانا ہوگا۔“

میں نے کہا: ”مومن بھائی! ایسی جگہ تو مجھے کہیں بھی نظر نہیں آتی۔“
اس نے کہا: ”رانگاماتی میں وہ حالات کے معمول پر آنے تک محفوظ

میرے ساتھ۔ اب یہاں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس شہر پر موت کا رقص شروع ہو گیا ہے۔

ہم دونوں مکان سے نکل کر چٹا گانگ سے رانگا ماتی جانے والی تیلی سی سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک درختوں کے سائے میں سے ہو کر رانگا ماتی کی طرف چلی گئی تھی۔ ابھی ہم مکان سے نکلے ہی تھے کہ ہم نے مکتی باہنی والوں کو مکان کی طرف آتے دیکھا۔ مومن بھائی نے کہا:

»جلدی سے میرے ساتھ بھاگو۔«

ہم مکان کے پچھواڑے بھاگ کر آ گئے۔ یہاں سنبل کا ایک بہت بڑا اور گنجان درخت تھا۔ مومن نے اشارہ کیا کہ اس پر میرے ساتھ چڑھ چلو۔ ہم دونوں بڑی تیزی سے اس درخت پر چڑھ گئے۔ میں اس سے پہلے کبھی اتنی پھرتی سے درخت پر نہیں چڑھا تھا۔ لیکن چونکہ موت پیچھے لگی تھی شاید اس لئے ہم میں اتنی تیزی اور طاقت آگئی تھی۔ ہم نے درخت کی گھنی شاخوں اور چوڑے پتوں میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔ ہم خاموشی سے مکتی باہنی کے فوجیوں کو کھنکھنے لگے جو مومن بھائی کے مکان کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ لوگ نعرے لگاتے ، بنگلہ دیش کا جھنڈا لہراتے چلے آ رہے تھے۔ مومن بھائی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

»یہ لوگ مجھے قتل کرنے آ رہے ہیں۔«

مکتی باہنی مومن بھائی کے مکان کے سامنے آکر ٹک گئی۔ دروازہ بند تھا۔ انہوں نے پاؤں کی ٹھوک مار کر دروازہ جو پیٹ کھول دیا اور شور مچاتے اندر گھس گئے۔ مگر اندر انہیں کوئی انسان نہ ملا۔ وہ سامان کو توڑنے پھوڑنے لگے۔ سارے گھر کا سامان توڑ کر ڈھیر کر دیا۔ بستر اور کپڑے لوٹ کر لے گئے۔ مکتی باہنی والے گولیاں چلا رہے تھے۔ رائفلوں اور سٹین گنوں کا منہ آسمان کی طرف کر کے بار بار فائر کر رہے تھے۔ باہر آکر انہوں نے مکان کو آگ لگا دی۔ مومن بھائی کا مکان بانس کا بنا ہوا تھا۔ اس نے دیکھتے دیکھتے آگ پکڑ لی اور دھڑلھڑا کر جلنے لگا۔ مومن بھائی نے میرے کان میں کہا۔

»مجھے اپنے مکان کی فکر نہیں۔ پریشانی ان لاکھوں لوگوں میں بڑے انسانوں کی ہے جو پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ جنہوں نے پاک فوج کے

سے پوچھنے لگے کہ یہاں پاکستان کا حمایتی کون کون ہے اور کہاں کہاں ہے ؟

لوگوں نے انہیں بستی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ہندو ننگالی فوج ایک مکان پر اندر گھس گئے اور وہاں سے کچھ لوگوں کو گھسیٹ کر باہر چوک میں لے آئے۔ ہم کھڑکی کا پیٹ ذرا سا کھول کر یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ مکتی باہنی والوں نے ہمارے دیکھتے دیکھتے چار آدمیوں کو سنگینیں مار مار کر زمین پر گرالیا اور پھر ان پر گولیاں برسادیں۔ زخمی تڑپ تڑپ کر شہید ہو گئے۔ یہ وہ ننگالی تھے جو پاکستان سے محبت کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک دکاندار کے اندر سے دو بہاریوں اور دو پنجابیوں کو گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ انہوں نے انہیں چوک میں زمین پر دو زانو بٹھا دیا۔ پھر ایک ایک مکتی باہنی کا فوجی ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں ہوا میں اٹھائیں اور پوری طاقت سے سنگینیں ان قیدیوں کی پشت پر بھونک دیں۔

چاروں زمین پر اوندھے منہ گر پڑے۔ پھر ان پر سنگینوں کی بارش ہونے لگی۔ ان لاش کو چوک میں تڑپتا چھوڑ کر مکتی باہنی ہندو سپاہی دوسرے شکار کی تلاش میں ادھر اُدھر پھرنے لگے۔ دوسرے لوگ ان کے ساتھ ساتھ تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ مومن بھائی نے کھڑکی بند کر دی اور تشویش ناک لہجے میں کہا:

»اب یہ لوگ میرے گھر میں آئیں گے۔ اس علاقے میں میں بھی محبت وطن مشہور ہوں۔ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ میں پاکستان کا زبردست حامی ہوں اور سچا مسلمان ہوں۔«

میں بھی گھبرا گیا تھا۔ اب مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ میں نے یہاں آکر سخت غلطی کی ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جرم ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ جرم ہونے والا تھا وہ ہو رہا تھا۔ اب تو ہر قیمت پر آخری حد تک اپنی جان بچانا فرض تھا۔ میں نے کہا:

»مومن بھائی! ہم یہاں سے کہاں جائیں گے؟ عثمان کے بال بچوں کا کیا

ہو گا؟«

»میں انہیں بھی وہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ لے جاؤں گا۔ چلو

ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ ان کے ساتھ ہی دھوکہ ہوا ہے۔ یہ لوگ ان کو گن گن کر قتل کریں گے۔ یہ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں جانتا ہوں بھائی! بنگالی مسلمان کو درغلا یا گیا ہے۔ اُسے شیخ مجرب نے دھوکہ دیا ہے وہ دھوکے میں آ گیا ہے۔ یہ لوگ جو مکتی باہنی کے ساتھ نعرے لگا رہے ہیں اور انہیں بیل مٹھائی پیش کر رہے ہیں یہ سارے ہندو ہیں۔ ان کی وفاداریاں شروع ہی سے بھارت کے ساتھ تھیں۔ یا اللہ! تو ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا۔ مومن بھائی کا مکان جل رہا تھا۔ دھواں ہمارے درخت تک بھی آ رہا تھا۔ ہمیں تھا کہ ہمیں زیادہ دھواں لگنے سے کھانسی آگئی تو ہماری خیر نہیں ہے۔ لیکن خدا کا شکر رہا۔ کارخ بدل گیا۔ اور دھواں دوسری سمت کو جانا شروع ہو گیا۔ مکان جل کر خاک سیاہ گیا۔ مکتی باہنی والے وہاں سے چلے گئے تھے۔ ناگ پاڑہ کی بستی کے تقریباً آدھے سے زیادہ مرنے جلادینے لگے تھے۔ لوگوں کو گھروں سے گھسیٹ گھسیٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ ہنز فوجی کر رہے تھے اور ہندو بنگالی خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ مومن بھائی نے کہا کہ اب ہمیں نیچے اترنا چاہیئے۔ یہ تو درخت میں بیٹھے بیٹھے بُری طرح سے تھک گیا تھا۔ ہم دونوں درخت پر سے نیچے اتر آ رہے تھے۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا میں جلے ہوئے بانسوں کی بوڑچی ہوئی تھی۔ مومن نے میرا ہاتھ اور مجھے ساتھ لے کر تالاب کے عقبی درختوں کے تھنڈوں میں گھس گیا۔ یہاں سے ہم نے دور نماز کر دیا۔ ہم کافی دور نکل گئے۔ ہم تھک گئے تھے۔ مومن بھائی نے مجھے ایک جگہ پتھروں کے پا بیٹھنے کو کہا۔ ہم گھاس پر لیٹ گئے۔ جب ہمارا سانس ٹھیک ہوا تو ہم نے ایک تالاب جھک کر پانی پیا۔

مومن بھائی بولا۔ ”میرے دوست! خدا نے ہمیں موت کے منہ سے بچالیا ہے۔ اب ہمیں چل کر عثمان کے خاندان اور بال بچوں کی خیریت معلوم کرنی چاہیئے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ چکا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ہم سڑک پر سے ہو کر جائیں گے۔“

”نہیں۔“ مومن بھائی نے کہا۔ ”میں اس جنگل کے راستے کو جانتا ہوں۔ یہ ایک معمولی سا جنگل ہے جس میں سوائے چھوٹے چھوٹے درختوں اور جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ ساتھ رہنا۔ ہم رات ہونے سے پہلے پہلے اپنے دوست کے گھر تک پہنچ جائیں گے۔ ہم نے آگے چلنا شروع کر دیا۔ ہمیں دور گولیاں چلنے اور لوگوں کے چیخنے اور شور مچانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ مکتی باہنی والے محب وطن لوگوں کو قتل کر رہے تھے اور ہندو بنگالی خوشی سے نعرے لگا رہے ہیں۔ آسمان پر ستارے نکل آئے تھے۔ کہیں چاند نہیں تھا۔ بڑی اندھیری رات تھی۔ جھاڑیوں میں بھیگ کر لوٹنے لگے تھے۔ موسم ہونے کی وجہ سے فضا میں گرمی اور جس زیادہ نہیں تھا۔ کوئی ڈیرہ گھٹنے کے اندر اندر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہم نے عثمان اور اس کے بیوی بچوں کو چھپایا گیا تھا۔ مومن بھائی نے کہا کہ میں گاؤں کے دوسرے ماہی گیروں سے بھی نہیں ملنا چاہیئے۔ کسی کو نہیں بتانا چاہیئے کہ ہم یہاں سے کوچ کر گئے ہیں۔ ہم رات کے اندھیرے میں ایک خفیہ جگہ سے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ ہماری آوازیں سن کر عثمان نے دروازہ کھول دیا۔ ہمارے چہرے دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا کہ حالات بہت خراب ہیں۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ آپ لوگ پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”اس وقت ہر محب وطن پاکستانی پریشان ہے۔ موت اس شہر میں اتنی سستی ہو جائے گی مجھے اس بات کا کبھی یقین نہیں تھا۔“

مومن بھائی نے اور میں نے اُسے بتایا کہ مومن کا مکان جلا دیا گیا۔ چوک چوک میں مکتی باہنی کے ہندو سپاہی بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ ہر طرف کہرام مچا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ یہ سب باتیں ہم نے اُسے الگ لے جا کر بتائی تھیں۔ تاکہ اس کی بیوی اور روانہ شروع کر دیں۔



عثمان نے مجھ سے پوچھا اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ اس ناگہانی آفت سے اپنے بال بچوں کی جان کس طرح بچائے؟ مومن بھائی نے اُسے بتایا کہ وہاں سے پچاس میل دور جنگل میں

ہم اسی جگہ رک گئے اور مومن بھائی بیل گاڑی لینے ساتھ وائے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں اور عثمانی حالات کے ایک دم بدل جانے اور تباہی نازل ہونے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ عثمان نے اپنی قمیص پھاڑ کر اپنی بیوی کے پاؤں کے زخموں میں باندھ دی تھی۔ کافی دیر بعد ہمیں دور سے جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی بیل گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس کی چھت ٹوٹی ہوئی بانس کی تھی اور اس کے ایک سریل ساگدھانا میل جٹا تھا۔ ہم بڑے خوش ہوئے۔ مومن بھائی بیل گاڑی لے کر پہنچ گیا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی بھائی، بچوں اور عثمان کو گاڑی میں بٹھایا اس کے بعد میں اور مومن بھی گاڑی میں بیٹھ گئے اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

بیل گاڑی میں ہم بڑے آرام سے سفر کر رہے تھے۔ صرف کسی وقت تنگ جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے وقت پیش آتی تھی۔ کھلی سڑک ہم نے اس لئے چھوڑ دی تھی کہ ڈرتھا اگر کوئی بھارتی یا کمٹی باہمی کا کوئی فوجی ٹرک گزرے گا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ شام تک ہم سڑک کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں سفر کرتے رہے۔ شام کے بعد ہم سڑک آگئے۔ یہاں بیل گاڑی زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ ایک جگہ رک کر ہم نے تھوڑے بہت چاول نمک کے ساتھ کھائے۔ پانی پیا۔ بیل کو پانی پلایا اور ہمارے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات بھر بیل گاڑی چلتی رہی۔

پچھلے پہر ایک جگہ سے ہماری بیل گاڑی جنگل کو جاتی کچی پگڈنڈی کی جانب مڑ گئی۔ یہ پگڈنڈی جنگل میں سے ہو کر اُس ریسٹ ہاؤس کی طرف چلی گئی تھی جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔

ہم کئی درختوں، جھاڑیوں اور ٹیلوں کا چکر کاٹ کر نندی نالوں پر سے ہوتے ہوئے آخر اس ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ یہ ایک اُجاڑی ویران جگہ تھی۔ بانس کی کھیرل والا ایک ریسٹ ہاؤس تھا جس کے برآمدے میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کونے میں اوندھے پڑی تھی یہاں کوئی نہیں تھا۔ اندر ایک کمرہ تھا جہاں وہ لکڑی کے تخت رکھے تھے۔ ان پر بستر لگا دیئے گئے جو لہا جلا یا گیا اور ساتھ لائے ہوئے چاول اٹنے رکھ دیئے گئے۔ یہ سارا کام عثمان کی بیوی نے کیا۔ ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لے آئے۔ ریسٹ ہاؤس میں ہی پڑی ہوئی ایک کلبھاڑی لی گئی تھی۔ مومن بھائی نے بتایا کہ یہ ریسٹ ہاؤس اب ویران ہو گیا ہے کیونکہ اس طرف سے گورنمنٹ نے جنگل کی کٹائی پر پابندی لگا دی تھی۔

ایک پُرانا ریسٹ ہاؤس ہے جہاں وہ کبھی کٹائی کے دنوں میں جا کر رہا کرتا تھا۔ اگر ہم کسی طرح وہاں چلے جائیں تو حالات کے ٹھیک ہونے تک وہاں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ آخر یہی طے پایا کہ ہم سب کو وہاں سے کوچ کر جانا چاہیے۔ چنانچہ اسی وقت ہم نے عثمان کی بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور اس تالاب وائے گھر کو چھوڑ کر رانگامائی جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ آگے کو چل پڑے۔ ہم سڑک سے ہٹ کر درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہو کر گزر رہے تھے عثمان نے ایک بچے کو اور ایک بچے کو میں نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ ادھی رات تک ہم چلتے چلے گئے۔ آخر تھک کر ایک جگہ نندی آگئی تو وہاں بیٹھ گئے۔ عثمان کی بیوی کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ مومن بھائی نے کھانے کو تھوڑے سے چاول ساتھ رکھ لئے تھے۔ یہاں بچوں کو اور عثمان کی بیوی کو تھوڑے تھوڑے چاول کھلائے گئے۔ رات یہ ہوا کہ رات کا باقی حصہ اسی جگہ بسر کیا جائے۔ صبح کو سفر شروع کیا جائے۔

عثمان کی بیوی بچے سو گئے۔ ہم وہاں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پچھلے پہر ہمیں بھی نیند آگئی۔ ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ میں نے مومن بھائی کو جگایا۔ پھر ہم سب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم سب نے چاول کھائے، پانی پیا اور آگے چل پڑے۔ دو گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد عثمان کی بیوی تھکن سے گر پڑی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ ہم رک گئے۔ بچوں کو اٹھائے اٹھائے ہم بھی بے حد تھک گئے تھے۔ طے یہ پایا کہ اس طرح سے پچاس میل کا فاصلہ طے نہ ہو سکے گا۔ لہذا کہیں سے بیل گاڑی حاصل کی جائے۔

» یہاں سے دائیں جانب ایک کوس پر گاؤں ہے۔ اگر میں وہاں جا کر کوشش کوشش کروں تو شاید بیل گاڑی مل جائے۔ میرے پاس کچھ روپے ہیں۔ «

پچھ سات سو روپے میرے پاس بھی تھے۔ ہزاروں روپوں میں سے بس یہی چند ایک سو روپے میں بچا سکا تھا۔ میں نے کہا:

» مومن بھائی! آپ میرے روپے بھی اپنے روپوں میں شامل کر لیں اور بیل گاڑی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بغیر بھائی اور بچے سفر نہ کر سکیں گے۔ «

رہا۔ صبح ہمیں جا کر بخار لڑا اور اس نے آنکھیں کھول کر اپنے خاوند کو دیکھا اور پھر بچوں کو اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مومن بھائی نے اُسے تسلی دے کر کہا: ”بھائی! تمہیں اب ہمت سے کام لینا ہے۔ مصیبت صرف ہم پر ہی نازل نہیں ہوئی۔ سارے ملک پر یہ بجلی گری ہے۔ ایسی بھی مائیں ہیں جن کے سامنے اُن کے بچوں کو زندہ آگ میں پھینک دیا ہے۔ تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تم اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ زندہ سلامت ہو۔ خدا نے چاہا تو ہم اس مصیبت سے بھی ایک نہ ایک دن نکل جائیں گے ہمارے ساتھ تمہیں بھی حوصلے سے کام لینا چاہیے۔“

مومن کی باتوں کا بھائی پر خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے اپنے آنسو پونچھ دیئے۔ دوسرے روز وہ صحت مند ہو گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ چاول اور دال وغیرہ کہاں سے لائی جائے قریب ہی ایک تالاب تھا۔ عثمان اور میں نے بنسی بنائی اور وہاں مچھلیاں پکڑنے لگے۔ شام تک بڑی مشکل سے دو چار مچھلیاں پکڑ سکے۔ اس تالاب میں مچھلیاں ہم کم تھیں۔ مومن نے کہا: ”میں جنگل میں جا کر پھل توڑ کر لاتا ہوں۔ کچھ روز ہمیں اسی طرح گزارا کرنا ہوگا۔ اس کے بعد گاؤں جا کر راشن لے آؤں گا۔ ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی وہاں جانے کا خطرہ مول لے۔“

میں نے کہا: ”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا جنگل میں۔“

عثمان اپنے بچوں کے پاس رہا اور میں مومن بھائی کے ساتھ جنگل میں پھلدار درختوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دور ہمیں کیلے کے درختوں کے جھنڈ مل گئے۔ ان میں کیلے کے زرد زرد گچھے لٹک رہے تھے۔ ہم نے کھارڑی مار کر گچھے توڑے اور ریسٹ ہاؤس لاکر سب کو کھلائے۔ بچوں نے کیلے شوق سے کھائے۔ بچوں کے بھی کپڑے پھٹ گئے تھے۔ بھائی نے اپنی ایک نئی ساڑھی بھاڑ کر بچوں کے لئے دھو تیاں بنا کر انہیں باندھ دیں۔ ہم نے تالاب پر اپنے میلے کپڑے دھو کر سکھائے اور پہنے۔ پاس ہی اناس کے درخت بھی مل گئے۔ جنہیں کاٹ کر ہم لے آئے۔ سب نے شوق سے انہیں کھایا۔ یہ جنگلی اناس تھے اور ترش تھے۔

سارا دن اسی جگہ گزر گیا۔ شام کو ہم نے تھوڑے بہت اُبلے ہوئے چاول کھائے۔ بغیر کچے چائے کی پتی اُبال کر پی۔ اب پھروں نے حملہ کر دیا۔ یہ پھر بڑے موٹے موٹے تھے۔ عقب یہ آگ جلا دی گئی۔ اس کے دھوئیں سے پھر بھاگ گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں بچے سو رہے تھے۔ اُن پر پرانی چادریں تان دی گئیں۔ آدھی رات تک میں، مومن بھائی اور عثمان آپس میں بات کرتے رہے کہ ہم یہاں کب تک رہ سکیں گے؟ مومن نے کہا:

”بھائی! میرا تو خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں اس وقت تک رہنا ہوگا جب تک کہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ بھارتی فوج واپس نہیں چلی جاتی۔“

عثمان نے کہا: ”غدار عجیب نے یہ علاقہ بھارتی حکومت کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ اب یہاں سے واپس نہیں جائیں گے۔“

مومن بھائی کہنے لگا: ”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ شیخ مجیب کا جھوٹ بہت جلد لوگوں کے سروں سے اتر جائے گا۔ ان لوگوں کی اصل پاکستانی ہے۔ یہ لوگ بڑے سچے مسلمان ہیں۔ سازش ہندو نے کی ہے اور ہندو بنگال نے ہی مکتی باہنی نے مل کر ملک میں تباہی پھیلانے کی ہے۔ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم پھر واپس اپنے گھر واپس آجائیں گے۔“

عثمان نے سرد آہ بھر کر کہا: ”پھر پچھتائے سے کیا ہوگا مومن بھائی؟“

ہم نے تین دن اس جنگل کے ویران ریسٹ ہاؤس میں بڑے آرام سے گزارے۔ پھر یہ راشن ختم ہو گیا۔ بچوں کے لئے سوائے چاول کے ہمارے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ دودھ بچے انہیں ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ وہ کمزور اور زرد ہو گئے تھے۔ عثمان کی بیوی کو چوتھے روز طیر یا ہو گیا اس روز کا بخار چڑھا کہ وہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہاں ہم ا کا کوئی علاج نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں بھی مومن بھائی کا تجربہ کام آیا۔ وہ جنگل میں گیا اور اسے کسی درخت سے خاص قسم کے کھڑوے پتے توڑ کر لایا۔ ان پتوں کو گرم پانی میں ابالا گیا۔ ا کا کھڑوے وارس نکال کر بھائی کو ایک گچ پلا یا گیا۔ ساری رات بخار سے بے چاری کا بدن پ

کونکل پڑا۔ اس روز آسمان پر صبح ہی سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بوندا باندی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ مشرقی پاکستان میں ابھی بارشوں کا موسم نہیں آیا تھا۔ پھر بھی اس روز آسمان ہلکے سرمئی رنگ کے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ میری تقدیر میں ابھی زندگی کے کچھ دن اور لکھے تھے کہ مقدر نے مجھے جنگل کی طرف بھیج دیا۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ جب واپس آؤں گا تو میں دشمنوں کے درمیان بالکل اکیلا رہ گیا ہوں گا۔

میں کچھ دیر جنگل میں پھل توڑتا رہا۔ میں نے کیلوں کے دو بڑے گچھے توڑ کر کندھے پر بٹالے اناس ابھی کچے تھے اور واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ ابھی میں دُور ہی تھا کہ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں چونکا ہوا کروہیں جھک گیا اور آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے جھاڑیوں جھاڑیوں ہو کر ایک جگہ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ریسٹ ہاؤس کے باہر مکتی باہنی کے چند فوجی بھاگ رہے ہیں۔ ایک فوجی کے ہاتھ میں کٹا ہوا سر ٹکٹا دیکھ کر میرے جسم میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس سر کو بانوں سے پکڑ کر اٹکائے رکھا تھا۔ میں اسی جگہ ایک دم دبک کر چھپ گیا۔ دوپہر تک میں ان جھاڑیوں کے اندر ہی دبکا بیٹھا رہا۔

کافی دیر بعد جب ہر طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا تو میں جھاڑیوں میں سے نکل کر ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھا۔ دبے پاؤں قدم اٹھاتے ہوئے میں عقب سے ہو کر ریسٹ ہاؤس پہنچا تو وہاں کا بھینانک نقشہ دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ بھائی اور اس کے دونوں معصوم بچوں کی لاشیں جن کے سینے سنگینوں سے پھلنی کر دیئے گئے تھے برآمدے میں پڑی تھیں۔ عثمان بھائی کی لاش باہر درخت کے نیچے پڑی تھی اور مومن بھائی کا سر کاٹا دھڑ ریسٹ ہاؤس کے اندر فرش پر پڑا تھا۔ یہ کام کسی مجبر نے کیا تھا۔ اس نے مکتی باہنی والوں کو خبر کر دی تھی کہ مومن بھائی جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں چھپا ہوا ہے۔ دشمن اس کی تلاش میں چٹاگانگ سے تیجھ لگا تھا۔ آخر اس نے اُسے پکڑ لیا۔ مکتی باہنی کے ہندو سپاہی مومن بھائی کا سر کاٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔ یہ دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ میری آنکھوں میں بے گناہ بچوں اور ان کی ماں کی لاشیں دیکھ کر آنسو آ گئے۔ عثمان بے چارہ بھی شہید ہو گیا تھا۔ کاش! یہ لوگ یہاں نہ آتے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا؟ چٹاگانگ میں بھی انہیں

زندہ نہ چھوڑا جاتا۔ میں ایک دم سے لاشوں پر سے توجہ ہٹا کر محتاط ہو گیا۔ یہ لوگ تو شہید ہو گئے تھے۔ اب مجھے اپنی زندگی کی حفاظت کرنی تھی۔ اور اپنے آپ کو مکتی باہنی کے غنڈوں سے بچانا تھا۔ اگرچہ میری کسی سے دشمنی نہیں تھی اور میں ڈھاکے کی مشہور شخصیت بھی نہیں تھا۔ پھر بھی میرا بیجا ہونا اور ایک وقت میں پاک فوج کو آٹا دال سپلائی کرنا ہی ایک ایسا جرم تھا جسے کبھی نہیں معاف کیا جاسکتا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے ایک جگہ آڑ میں چھپ کر یہ اندازہ لگایا کہ وہاں کوئی مکتی باہنی تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لوگ ظلم ڈھاکر چلے گئے ہیں تو میں آڑ میں نکلا۔ کلبھاڑی کے رے ایک جگہ زمین کھودنی شروع کر دی۔ شام تک بڑی سخت مشقت کر کے میں بمشکل پانچ گڑھے کھودنے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے باری باری ہر ایک گڑھے میں لاشوں کو دفن کر دیا۔ ان کی ارواح کے لئے دغاے فاتحہ پڑھی اور ریسٹ ہاؤس میں آکر بیٹھ گیا۔

میں بے حد تھک گیا تھا۔ کچھ کیلے کھائے۔ پانی پیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا امتحان اور کھلا چیلنج تھا کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں اور کب تک ان خطرناک جنگلوں میں جان بچائے پھرتا رہوں۔ یہ تو خیر اتنے خطرناک جنگل نہیں تھے۔ جنگل تو اس سے آگے شروع ہو رہے تھے جہاں شیر، چیتے، اژدہا اور بلی تھی رہتے تھے۔ ظاہر ہے میں واپس چٹاگانگ نہیں جاسکتا تھا۔ ڈھاکے بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان شہروں پر بھارتی فوج کا قبضہ ہو چکا تھا اور شیخ مجیب کے عوامی لیگی محب وطن لوگوں اور غیر بنگالیوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ اگر میں آگے دانگاماتی کی طرف نکل گیا تو پھر دیارے کرنا فلی عبور کر کے میں برما کی طرف جاسکتا تھا۔

لیکن یہ راستہ بے حد دشوار گزار، لمبا اور خطرناک تھا۔ یہ سمندرین کا علاقہ تھا جس کی دلدلیں اور شیر مشہور ہیں۔ ویسے مجھے بھی کوئی علم نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان کی سرحد کہاں اور کس جگہ سے برما کی سرحد پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ مجھے کاکس بازار کے جنگل طے کر کے آگے جانا تھا جو بے حد مشکل کام تھا۔ اور پھر یہ علاقہ بھارتی تحریک کاروں اور بھارتی کمانڈوز کی آماجگاہ تھا اس طرف سے بھاگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی تھا کہ کسی طرح

ن جا کر لیٹ گیا۔ رات میں نے اسی خونی ریسٹ باؤس میں گزاری اور صبح ہو تب ہی میں وہاں واپس چل پڑا۔ واپسی پر بھی بیل گاڑی نے مجھے بڑا فائدہ دیا۔ میری داڑھی اور سر کے بال ت بڑھ گئے تھے۔ اچانک مجھے اُن میراگس کا خیال آ گیا جنہیں میں نے سُبھاناکے ساتھ ان کی ٹھی کے قریب گاتے بجانے دیکھا تھا۔ کیوں نہ میں جو گیوں ایسا حلیہ بنا لوں؟ اس طرح سے مجھے پچھلے دنوں کا بھی نہیں اور مجھ پر شک نہیں کیا جائے گا۔ اپنا یہ خیال مجھے پسند آیا۔ میں نے ہمد کر دیا کہ کسی گاؤں میں پہنچ کر جوگی بن جاؤں گا۔

جوگی بننے کے لئے صرف مجھے گروے رنگ کی ایک دھوتی چاہیے تھی اور بس..... یہ روے رنگ کی دھوتی مجھے کسی نہ کسی جگہ سے مل سکتی تھی۔ میں بیل گاڑی میں سوار واپس ناکاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ بارش نہیں ہوئی تھی۔ بادل کل کے چھٹے مرتے تھے۔ بیل گاڑی سارا دن چلتی رہی۔ رات کو میں نے جنگل ہی میں ایک جگہ بام کیا۔ صبح اٹھا۔ ایک تالاب پر منہ ہاتھ دھویا۔ اپنا چہرہ پانی میں دیکھا تو ڈر گیا۔ یہ کسی گل کا چہرہ تھا۔ ایک اعتبار سے اچھا بھی تھا کہ کسی کو مجھ پر کبھی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں باہی ہوں۔ میری گوری چٹی رنگت گہری سالونی ہو گئی تھی۔ میں کسی طرح سے بھی وہ نہیں تھا جو ہاکے میں تھا۔ اس حلیے میں لوگ مجھے پاگل تو سمجھ سکتے تھے لیکن جوگی نہیں۔

اور میں جوگی بن کر اس ظالم دیس سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں بیل گاڑی پر سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ شام ہو رہی تھی کہ دور سے مجھے چٹا گانگ شہر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ میں مومن بھائی کے مکان کے قریب جا کر گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ اب مجھے بیل گاڑی کی ضرورت نہیں تھی۔ مومن بھائی کا مکان آدھا جلا ہوا تھا۔ میں اس کے اندر نہیں گیا۔ باہر ہی سے دیکھ کر شکر پر آ گیا۔ بیہوش شہر کو جاتی تھی۔ میری جیب میں دو اڑھائی سو روپے ابھی تک محفوظ پڑے تھے۔ یہ شہر کے مضافات کا علاقہ تھا۔ ایک درخت کے نیچے کھوکھا سا بنا تھا۔ اس میں مجھے ایک جام نظر آیا جو ایک آدمی کی شیوہ بنا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پاس ہی کڑی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ سارے ملک پر بھارتی فوج پھیل گئی ہے۔ شیخ مجیب نے منگلہ دیش کا اعلان کر دیا ہے اور سرکاری عسارتوں

سے اگر میں مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کر کے بھارت میں داخل ہو جاؤں تو میں مکتی باہنی کی سنگینوں سے بچ سکتا ہوں۔ اگرچہ بھارت میں بھی پکڑا جاسکتا ہوں لیکن وہاں قید ہو جاؤں گا۔ اور اگر کوشش کروں تو کسی نہ کسی طریقے سے سنگھروں کے ساتھ مل کر پنجاب کی سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہو سکتا ہوں۔

بہر حال ایک بات تو طے تھی کہ مجھے مشرقی پاکستان سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ مجھے بھارت میں داخل ہو جانا چاہیے۔ برما کی طرف یا نیپال کی سمت جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے برابر تھا۔ کیونکہ یہ سارے علاقے، اور ان علاقوں کے سارے جنگل، دریا اور پہاڑ میرے لئے بالکل اجنبی تھے۔ اب میں سوچنے لگا کہ بھارت کی سرحد کس مقام سے عبور کروں۔ یہ جگہ ہٹی کے علاقے میں ہی تھی۔ ہٹی وہی جگہ ہے۔ جہاں پاک فوج کے جیالوں نے شجاعہ اور بہادری کی ایک نئی تاریخ اپنے خون سے لکھی تھی اور بھارتی حملہ آوروں کو ناکوں سینے چھوڑا تھا۔ اگر سپلائی لائن کٹ جائے۔ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ٹوٹ جائے اور تخریب کا رجبہ جنگ ملک کے اندر اور محاذ کے پیچھے تخریبی کارروائیاں کر رہے ہوں تو وہاں دنیا کی کوئی بھی فوج زیادہ دیر تک نہیں ٹر سکتی۔

ہٹی میں کئی بار گیا تھا۔ یہاں سے بھارت کی سرحد دو چار میل کے فاصلے پر تھی۔ اس راستے میں بھی مکتی باہنی اور بھارتی فوجیوں سے ٹھہر بھیر ہونے کا پورا پورا امکان تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ڈھاکے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہٹی سے سرحد پار کر کے بھارت میں داخل ہونے کا ایک ہی صورت تھی کہ میں بنگالی بن کر یہاں سے چلوں۔ میرا رنگ ان پھر سات دنوں میں سالن لاپڑ گیا تھا۔ بنگالی زبان میں بڑی روانی سے بول لیتا تھا اتنا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت بھارت کی سرحد پوری طرح سے کھلی ہوگی اور اُدھر بھارتی ہندو سیٹھ ڈھاکے اور چٹاگانگ کے کارخانوں اور مسلمانوں کی دکانوں پر قبضہ کرنے کے لئے دھڑا دھڑ چلے آ رہے ہوں گے۔

ایک بار اگر میں بچتا بچا آتا ہٹی پہنچ جاؤں تو وہاں سے سرحد عبور کر کے بھارت میں داخل ہونا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ دل میں یہی فیصلہ کر کے میں ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں ایک

پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا گیا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر شہر گاؤں گاؤں غیر بنگالیوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا ہے۔ شیخ مجیب کا بنگالی حامی بن کر ان کی باتوں میں بشریک ہو گیا اور شیخ مجیب اور مکتی باہنہ تعریف کرنے لگا۔ اس حجام نے مجھ سے پوچھا کہ میرے بال اتنے کیوں بڑھ گئے ہیں۔ میں زاردارانہ انداز میں کہا:

”میں نے ایک مہینے سے سندربن کے جنگلوں میں مکتی باہنی کے لئے کام کرتا رہا ہوا اس انکشاف پر انہوں نے مجھے تعریفی نگاہوں سے دیکھا اور میرے لئے چائے منگوائی۔ پیتے ہوئے میں نے انہیں اپنی بہادری اور بنگلہ دیش کی خدمت کے سلسلے میں کئی ایک جھوٹے قصے سنائے۔ پھر میں نے اپنا سر منڈوا دیا۔ واڑھی مونچھ صفا چٹ کر دوائی اور سگریٹ سلگا باہر آگیا۔ وہاں سے سیدھا ایک کپڑے کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے گیر دے رنگ کا دس بارہ کپڑا خریدا۔ اور سیدھا ایک معمولی سے ہوٹل میں آکر کمار گپتا کے نام سے کمرہ بک کر لیا۔ رات اس ہوٹل میں بسر کی۔ صبح اٹھ کر نہایا۔ گیر دے رنگ کی دھوٹی پہنی۔ اسی کوشانوں پر اوپر ڈال لیا۔ اب میں پورا سادھو یا جوگی بن گیا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر ایک جوتوں کی دکان گیا۔ وہاں سے ایک چپل خرید کر پہنی اور چٹا گانگ کے ایک باغ میں جا کر بیٹھ گیا اور سو لگا اب کیا کرنا چاہیے۔

پھر دل میں ایک فیصلہ کر کے اٹھا اور سیدھا چٹا گانگ ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ کبھی یہاں سوٹ بوٹ پہن کر بڑی آزادی سے گھومنا پھیرا کرتا تھا۔ کبھی میں دل محبت کا بیٹھا میا درو لئے یہاں سے نکل کر کُنجاتا سے ملنے جایا کرتا تھا۔ لیکن اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ بساط اُلہ گئی تھی۔ ہر شے اوپر تلے ہو گئی تھی کل جو گلے میں بائیس ڈال کر چلتے تھے آج اجنبی بن گئے تھے سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ مکتی باہنی کے ہندو فوجی پاکستان دوست لوگوں کی جان کے ڈھونڈ رہے تھے اور انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کر رہے تھے۔ میں ویننگ روم میں آکر بیٹھ کر گاڑھی ابھی پلیٹ فارم پر نہیں آئی تھی۔ میں نے چائے پی اور سگریٹ سلگا کر سادھوؤں طرح آلتی پالتی مار کر بیچ پر بیٹھ گیا۔ میں جوگی بابا کی طرح سے اداکاری کر رہا تھا۔ دو ایک بنگا

نے میری طرف عقیدت سے دیکھا اور پر نام کر کے گزر گئے، میں نے بھی آنکھیں بند کر کے اُن کے نمسکار کا ہاتھ سے جواب دیا اور سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم پر گاڑی آکر لگ گئی۔ میں نے ٹکٹ پلٹے ہی سے لے رکھا تھا۔ میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ بڑا رش تھا۔ بھارتی فوج کے دو چار سپاہی بھی اس ڈبے میں سوار تھے۔ ہندو بھی تھے اور مسلمان مسافر بھی۔۔۔۔۔ مگر ان سب کی پہچان مشکل تھی میں کسی سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ لوگ مجھے عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں خاموش تھا اور مسکرا کر لوگوں کے سلام کا جواب دے رہا تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ سٹیشن پر سٹیشن آکر گزرتے تھے۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ ددپہر کے بعد بھی میں ایک ریلوے سٹیشن پر آکر گیا۔ یہاں سے ہلی سٹیشن کے لئے مجھے گاڑی بدلتی تھی۔ کچھ دیر کے لئے میں ریلوے سٹیشن کے بیچ پر آتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ یہاں بھارتی فوجی اور مکتی باہنی کے سپاہی چل پھر رہے تھے۔ مجھ پر کسی کو شک نہیں ہو رہا تھا کہ میں بنگالی ہوں اور ڈھاکے سے فرار ہو رہا ہوں۔ جوگی کا بھیس مجھے بڑا فائدہ پہنچا گیا تھا۔ کچھ لوگ اور عورتیں میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ میں انہیں آئینہ یاد دیتا رہا۔ کوئی اولاد کا پوچھ رہی تھی تو کوئی اپنی بیماری کے بارے میں دعا کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کی بیماریوں کے علاج میں انہیں بتا رہا تھا اور کافی آنکھ سے اس ٹرین کو بھی دیکھ رہا تھا جو ابھی ابھی وہاں آکر رکی تھی اور جس نے مجھے اپنے ساتھ لے کر میری منزل مقصود تک جانا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے کہ میں پٹی پہنچ گیا۔ یہاں کی انڈیا کی سرحد تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ سرحد کی طرف جو سڑک جاتی تھی اس پر لوگ آ جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ سرحد کھول دی گئی ہے۔ انڈیا سے بھی لوگ بھارتی تعداد میں چلے آ رہے تھے۔ میں نے ریلوے سٹیشن پر پاکستانی روپوں کے بدلے میں بھارتی کرنسی تبدیل کر دوائی۔ ایک ٹرک جس میں سامان لدا تھا انڈیا کی طرف جا رہا تھا میں نے اسے ہاتھ دے کر روک لیا۔ ڈرائیور ہندو بنگالی تھا۔ اس نے مجھے ہندو جوگی سمجھ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ ٹرک بھارت کی سرحد عبور کر کے انڈیا میں داخل ہو گیا۔ یہ مغربی بنگال کا علاقہ تھا جہاں ناریل کے درخت

ہوٹل میں آکر کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

میں جوگی بنا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں بھارتی سی آئی ڈی کے کچھ لوگ ادھر دھڑکھوم پھر رہے تھے۔ ایک ڈبلا پتلا کی عمر کا آدمی مجھے تھوڑی دیر بعد گہری نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ پھر وہ میرے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے لئے چائے کے کپ کا آرڈر دے کر مجھ سے بولا۔

”مہاراج آپ چائے پیس گئے؟“

”میں نے سر ہلائز کیا۔ نہیں۔ میں نے ابھی چائے پی ہے۔“

یہ جملہ میں نے جنگلی زبان میں ادا کیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں سینا میں ہوں بہار میں پیدا ہوا اور ساری زندگی ہمالیہ کے جنگلوں میں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں پھرتا پھرتا رہا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جیسے سب کچھ جانتا ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

”مہاراج آپ ڈھاکہ سے آ رہے ہیں کیا؟“

یہ سوال اس نے اچانک کر دیا تھا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ ایک پل کے لئے گھبرا گیا۔ لیکن جلد ہی اپنے احساسات پر قابو لیا۔

”ہم سرائی لوگ ہیں بابا! سنسار میں گھومنا پھرتے رہتے ہیں۔“

”ڈھاکہ میں آپ کہاں ٹھہرے ہوئے تھے؟“

یہ شخص آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے جلدی گلو خلاصی کرانے کے لئے کہا۔

”بابا! ہم ڈھاکہ سے نہیں آئے۔ ہم تو گیا بھگوان بدھ کی یا ترا کے لئے گئے تھے۔ ابھی ادھر اپنے ایک چیلے سے ملنے آئے ہیں۔ وہ کالی جی کے مندر میں رہتا ہے۔ سوچا یہاں چلے جیتے چلیں۔“

سی آئی ڈی کا آدمی مسکرائے جا رہا تھا جیسے اُسے میری بات کا بالکل اعتبار نہ ہو۔ پھر وہ اچانک بولا۔ ”مہاراج! میرے ساتھ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے تھانے چلنا

دُور دُور تک پھیلے تھے۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے بیچوں بیچ میں کہیں تالاب بھی تھے شام کے گہرے ہونے سبب ان جھونپڑیوں میں سے کہیں کہیں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ یہ دل اداس ہو گیا۔ ہندو بنگالی ڈرائیور مجھے بتا رہا تھا کہ وہ چٹاگانگ سے مسلمانوں کا ساما لوٹ کر کلکتے لے جا رہا ہے۔ اور یہ اس کا جوتھا پھرا ہے۔

میں اس کی باتوں میں ملائے جا رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ یہ کیسا انقلاب آگیا ہے ٹرک ایک پھانک پر رک گیا۔ ادھر سے مال گاڑی آرہی تھی۔ کچھ انڈین فوجی آکر ٹرک کی پرتا کرنے لگے۔ ڈرائیور نے انہیں ریڈیو اور بجلی کی اسٹری اور تھرمس بوتل دے کر تھپچھپڑایا۔ جب وہ چلے گئے تو ڈرائیور انہیں بُرا بھلا کہنے لگا۔

”کم بخت ہر پھرے پر کچھ نہ کچھ ضرور پھینکتا ہے۔“

ٹرین آکر گزر گئی۔ پھانک کھل گیا۔ رات گیارہ بجے کے بعد ہم کلکتے میں داخل ہو گئے۔ اس شہر سے میں خوب واقف تھا۔ ششہ سے پہلے کئی بار یہاں آیا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی اس شہر میں آنا جانا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ زکریا مٹریٹ میں مسجد ناخدا اور امجدیہ ہٹل کے ارد گرد کا علاقہ امرتسر کے کشمیری مسلمانوں کا علاقہ رہ چکا ہے۔ وہاں اب امرتسر کے کشمیری مسلمان دو ایک ہی تھے۔ جنہوں نے نقل مکانی نہیں کی تھی اور یہیں ٹھہر گئے تھے۔ میرا ارادہ اسی علاقے میں جا کر کسی پنجابی مسلمان سے رابطہ پیدا کر کے انڈیا سے پاکستان کی طرف مہمل ہونے کا تھا۔

ٹرک شام بازار کے آس پاس رُکا تھا۔ میں نے وہاں سے ایک ٹیکسی لی اور لوئر چیت پور روڈ پر سراج بلڈنگ کے پاس آکر گاڑی چھوڑ دی۔ اب میں آپ کو یہاں تک بتاؤں کہ کلکتے کے مسلمانوں کا غم سے کیا حال تھا؟ انہیں محفوظ ڈھاکہ کا بے حد صدمہ ہوا تھا۔ لیکن وہاں کے ہندو بنگالیوں کی خوشیوں میں شریک تھے۔ کیا کرتے۔ مجبور تھے۔ دل خون کے آسنور رو رہا تھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ بس نے چوک والے پٹواری کی دکان سے سگریٹ خریدے اور امجدیہ ہوٹل میں آکر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ ہوٹل کے مالک کو میں نے کچھ نہ بتایا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ بستر پر گرے ہی سو گیا۔ صبح اُٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور

آئی ڈی کا آدمی ہے اور ان لوگوں کی ٹوہ میں ہے جو بنگلہ دیش سے نکل کر بھارت میں
ہے ہیں۔ اس کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سی آئی ڈی سارے کلکتے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس
بمبارچائے کا بل بھی ادا کیا اور جاتے ہوئے جھک کر میرے قدموں کو چھو کر گیا۔ میں نے سوجھا
جو گی بن کر پھر ناخواہ خواہ دوسروں کی نظروں میں آنے کے برابر ہے۔ کیوں نہ میں یہ علیہ
ل کر سیدھے سادے انسانوں والا لباس پہن لوں؟ یہ بات مجھے پسند آئی۔ جھٹ بازار گیا۔
روباں سے اپنے لئے ایک پتلون دو قمیصیں خرید لیا۔ شام کو میں نے یہ لباس پہنا اور مون
ل سینما کے نزدیک اپنے ایک پرانے واقعہ کار کے ہاں آ گیا۔ یہ شخص قالیوں کی ایجنسی کرتا
ما اور کوئی چالیس برس سے کلکتے میں تھا۔ بوڑھا آدمی تھا اور میرے والد صاحب کا دوست
تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو بڑا حیران ہوا۔ پھر مجھے گلے سے چٹا لیا اور بولا۔ ”تم کیسے یہاں
گئے؟“

میں نے اُسے اپنے فرار کی ساری کہانی سنا ڈالی۔ وہ بڑی حیرانی سے میری باتیں سنتا رہا۔
تھوڑے دھماکے سے اُسے بے حد صدمہ ہوا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں بغیر پاسپورٹ کے
گیا ہوں اور سی۔ آئی۔ ڈی میرے پیچھے لگی ہے تو گھبرا سا گیا۔

”بیٹا! اگرچہ میں کافی عرصے سے اس شہر میں رہ رہا ہوں پھر بھی یہاں کی پولیس مسلمانوں
کے خلاف ہے۔ وہ ہماری ایک بات بھی نہیں سنتی۔ یہ لوگ تمہارے ساتھ مجھے بھی پکڑ کر جیل
میں ڈال دیں گے۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے کالی گھاٹ کی طرف چچا عبدالکریم کے پاس چلے جاؤ۔“
چچا عبدالکریم بھی ہمارے والد کے پرانے ملنے والوں میں سے تھا۔ میں زکریا سٹریٹ سے
اٹھ کر کالی گھاٹ عبدالکریم چچا کے پاس چلا گیا۔ یہ کچھ ہمت والا نکلا۔ اس نے مجھے حوصلہ دیا
کہ میں پریشان نہ ہوؤں۔ وہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملاوے گا جو پنجاب کی سرحد پر مملکت
کرنے والوں سے واقف ہے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ میں یہی چاہتا تھا۔ چچا کے پاس
رہتے ہوئے مجھے تین روزہ گزر گئے۔ اس عرصے میں مجھے بہت کم باہر نکلنے دیا گیا۔ میں گھر کی
چار دیواری میں قید ہو کر رہ گیا۔ طبیعت بڑی گھبرانے لگی۔ چچا اس آدمی کے انتظار میں تھا
جو مملکت کے گروہ میں سے تھا۔

ہو گا۔“

تھانے کا نام سن کر میں سہم گیا۔ بھارتی پولیس کے قبضے میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ میر
پاکستانی جاسوس بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امرتسر یا نا بھہ جیل کی کال کوٹھڑی میں محبوس
دیا جاؤں گا۔ بھرا ذبت ناک سزاؤں کا دردناک منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا میں سنا
ان سزاؤں کا ذکر ان لوگوں سے سن رکھا تھا جو بھارتی جیل خانوں میں قید رہ چکے تھے۔ اب
وقت آ گیا تھا کہ میں اپنے جوگی ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔

میں نے ایک ہاتھ اٹھا کر ہوا میں بلند کیا اور گرج دار آوازیں بولا۔

”ہم سنیا سی بابا میں۔ ہم دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ہمیں تنگ نہ کرو بابا! جاؤ اپنے
کام کرو۔ اگر تم نے ہمیں پریشان کیا تو بھگوان تم سے تمہارا بچہ واپس لے لے گا۔ ہماری بڈ
کبھی خالی نہیں گئی۔“

یہ ایک اتفاق تھا اور میری خوش قسمتی تھی کہ اس آدمی کا بچہ بیمار تھا بلکہ کئی روز
بیمار تھا۔ میرے منہ سے بچے کی موت کا ذکر سن کر وہ لرز اٹھا۔ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”معاف کر دیں ہمارا! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میرے بچے کے لئے بھگوان سے

پرارتھنا کریں۔ وہ بہت بیمار ہے۔“

اٹھا وہ میرے پاؤں چھونے لگا۔ میں نے اپنے پاؤں اور ارگے کر دیئے۔ میں اس کم بخت
پوری خدمت کرانا چاہتا تھا۔ میں نے جھوٹ موٹ جیب سے ایک سفوف سا نکال کر اسے پڑ
میں باندھ کر اُسے دیا اور کہا۔

”یہ لے! اسے پانی میں گھول کر اپنے بچے کو پلا دینا۔ بھگوان نے چاہا تو تمہارا

بچہ دودن میں اچھا ہو جائے گا۔“

اس نے دوائی لے کر جیب میں رکھ لی اور دس روپے کا نوٹ نکال کر میرے قدموں
میں ہاتھ جوڑ کر رکھ دیا۔

ہمارا ج! میں غریب ہوں۔ اس سے زیادہ آپ کی سیوا نہیں کر سکتا۔“

میں نے دس کا نوٹ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ اب اس نے اعتراف کیا کہ د

جو تھے روزیں بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے تنگ آگیا۔ میں نے کہا

”چچا! میں ذرا بازار سے سگریٹ وغیرہ لے آؤں۔ میں تو اندر بیٹھے تھک گیا۔ چچا نے مجھے آ کی کہ میں زیادہ دُور نہ جاؤں اور جلدی سے واپس آ جاؤں۔ میں کالی گھاٹ کے علاقے میں گھر پہنچ گیا۔ یہ علاقہ ہندو اکثریت کا علاقہ تھا۔ ایک ہوٹل میں کانن بالا کار ریکارڈنگ رہا تھا۔ وہاں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ چائے پی کر میں نے پان کھایا اور سگریٹ سلگا کر بڑے مزے مزے واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک شخص میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے گھر دیکھا۔ وہ بھاری بدن کا پتلون قمیص والا ہندو تھا۔ شکل سے صاف سی آئی ڈی والا معلوم ہوتا تھا۔ میں تیز تیز چلتے لگا اور چچا کے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ میں نے چچا کو بتایا تو وہ پریشان ہو کر باہر بھاگنے لگا۔ سامنے درختوں کے نیچے پچھے ہوئے نیچے پروہی بھار شخص بیٹھا ہوا تھا۔ چچا نے کہا۔

”یہ تو پنجاب کی سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ یہ سپیشل سی آئی ڈی کا سٹاف یہاں آیا ہوا ہے۔ تم نے غلطی کی جو باہر چلے گئے۔ اگر چلے بھی گئے تھے تو واپس نہیں ادھر اُدھر کے چکر لگا کر آنا چاہیے تھا۔ لیکن خیر۔ دیکھا جائے گا۔

دیکھا کیا جانا تھا۔ دوپہر کو ہم کھانا کھا کے فارغ ہوئے تھے کہ بنگال پولیس کے سپاہیوں نے دروازے پر سامنے لاکر جیپ کھڑی کر دی۔ چچا نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا تو جیپ کمر بولا۔

”پولیس آگئی۔ پچھلی دیوار پھانڈ کر بھاگ جاؤ۔ یہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ صحن کی عقبی دیوار پھانڈ کر دوسری طرف گلی میں جھلانگ لگاؤ یہ گلی کچرا لگی تھی اور عمارتوں کے پچھواڑے یہاں لگتے تھے۔ میں بھاگتا چلا گیا اور کئی بلڈنگوں کو پیچھے چھوڑ کر گھوم پھر آخر ایک سڑک پر نکل آیا۔ یہ سڑک چھوٹی سی تھی۔ ایک ٹرام بڑی سست رفتاری سے چلی آ رہی تھی۔ میں بیک کر اس میں سوار ہو گیا۔ ٹرام مجھے لے کر کلکتے کے بازار میں سے گزرنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ جانے بے چارے چچا پر کیا گذر رہی ہوگی۔ ظاہر ہے پولیس اس سے ضرور میرے بارے میں پوچھ گچھ کرے گی۔ اسے تنگ کرے گی کہ بتائے میں کہاں ہوں لیکن میں کر سکتا تھا سوائے بھاگنے۔ چچا نے خود مجھے بھگا دیا تھا۔ بے چارے نے خود

مہیبت مول سے لی اور میری جان پھڑادی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایک بار میں پولیس کے قبضے میں چلا جاتا تو پھر اس سے رہائی بڑی مشکل تھی۔

ٹرام بازاروں میں سے گزرتی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ کہاں اتروں ٹرام سے؟ میری جیب میں پچاس کے قریب انڈین کرنسی تھی۔ میں خضر پور کی طرف نکل آیا تھا۔ یہاں میں ٹرام سے اتر گیا۔ اس جگہ رام بھروسے نام کے ایک ہوٹل کو میں جانا تھا۔ اس ہوٹل میں میں نے کرشن کمار کے نام سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کمرے میں آ کر میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دل نے کہا کلکتے سے نکل چلو اور دی کی طرف چلتے ہیں لیکن وہاں جا کر کیا کروں گا۔ کس سے مل کر سرحد پار کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیوں نہ ایک بار چچا کے پاس جا کر اس شخص کا پتا حاصل کروں جو سگمفون سے واقف ہے؟ جب رات ہو گئی تو میں کھانا کھا کر ہوٹل سے نکلا اور ٹرام میں بیٹھ کر کالی گھاٹ کی طرف آ گیا۔

چھپتا چھپاتا، اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے بچاتا میں عقبی دیوار پھانڈ کر چچا عبدالکریم کے کواٹر میں کود گیا۔ چچا مجھے دیکھتے ہی ایک کمرے میں لے گیا۔ اور بتانے لگا کہ پولیس میری تلاش میں ہے۔

”مجھے تو انہوں نے چھوڑ دیا ہے لیکن میرے گھر کی برابر نگرانی کی جا رہی ہے تم نے اچھا کیا کہ سامنے والے دروازے سے نہیں آئے۔ بہر حال تمہاری تلاش میں سارے شہر کی پولیس اور سی آئی ڈی کو خبردار کر دیا گیا ہے۔“

میں نے اس آدمی کا ایڈریس مانگا جس سے چچا مجھے ملوانے والا تھا۔ اس نے مجھے ایک کاغذ پر اس کا ایڈریس لکھ کر دیا اور تاکید کی کہ میں پھر ادھر نہ آؤں جب تک کہ حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ میں دیوار پھانڈ کر وہاں سے نکل گیا۔ ٹرام میں سوار ہو کر واپس اپنے ہوٹل آیا اور ایڈریس دیکھا۔ یہ کوئی گنگولی نام کا ہندو تھا جو شام بازار میں رہتا تھا۔ رات ہوٹل میں بسر کی۔ صبح سویرے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر کے باہر نکلا اور ٹرام میں بیٹھ کر شام بازار آگیا۔ گنگولی مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ میں نے اُسے چچا کا خط دیا۔ خط پڑھ کر اس نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور مسکرا بولا:

میں نے اسے بڑے ادب سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میرا یہاں ہے نکلنا بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں میرے بچے پریشان ہوں گے۔ انہیں میری زندگی اور موت کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اس لئے آپ مہربانی کریں اور مجھے کسی طرح سے بارڈر کراس کرا دیں۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ گنگولی نے مجھے سگریٹ پینے کو دیا اور اٹھ کر ایک الماری کھولی۔ اس میں سے ایک کاپی نکال کر اس میں سے کچھ پڑھا۔ پھر ایک کاغذ پینل لے کر اس پر کچھ لکھنے لگا۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا لیکن چہرہ بھرا بھرا اور صحت مند تھا۔ کاغذ تہہ کر کے مجھے دیتے ہوئے بولا:

”یہاں سے تم سیدھا دلی جانا۔ وہاں ایک محلہ ہے چلی قبر۔ یہ محلہ جامع مسجد کے ساتھ ہی ہے۔ وہاں تمہیں ہر نام سنگھ سکھ کی دکان تلاش کرنی ہوگی یہ ترکان ہے۔ اسے جا کر میرا یہ خط دے دینا۔ باقی کام وہ خود کرے گا۔“

پھر کچھ سوچ کر بولا: ”تمہارے پاس کرائے کے پیسے ہیں؟“

میں نے اُسے بتایا کہ صرف پندرہ روپے باقی رہ گئے ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے چچا سے رقم لے سکتا ہوں؟ میں نے اُسے بتایا کہ رقم تو میں ان سے لے لوں مگر وہاں جانا خطر سے خالی نہیں۔ وہاں سی آئی ڈی کا پہرہ ہے۔ اس پر گنگولی نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا اور کہنے لگا:

”یہ تم اپنے پاس رکھو۔ میں تمہارے چچا سے لے لوں گا۔ اب تم جاؤ۔ دوپہر کو پنجاب میل چھوٹی ہے۔ تم اس پر سوار ہو کر دلی پہنچو۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور شام بازار کا ایک ٹیکسی پر سوار ہوا اور سیدھا سیالکوٹ سٹیشن پر آگیا۔ یہاں بڑی رونق تھی۔ میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر ابھی نہیں لگی تھی۔ دوپہر کا کھانا میں نے سٹیشن پر ہی کھایا۔ کبھی اس اسٹیشن پر ہم شام کو سیر کرتے آیا کرتے تھے اور آج میں چوروں کی طرح چھپ کر سہما ہوا بیٹھا تھا۔ خدا خدا کر کے دلی جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس کے ایک چھوٹے سے ٹبے میں سوار ہو گیا۔ اڑھائی بجے دوپہر کو اس گاڑی نے دلی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ریل چھوٹے چھوٹے سٹیشن

”تم پنجاب جانا چاہتے ہو؟ میرا مطلب ہے پاکستان کے پنجاب جانا چاہتے ہو؟“

”ہاں اجی ماں۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ گنگولی ہنس پڑا۔ پھر اس نے مجھے نہایت اعلیٰ امر کی سگریٹ پینے کو دیا اور کہنے لگا:

”پرسوں رات کو آ جانا میرے پاس۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

میں اس کے مکان سے باہر آگیا۔ سیدھا واپس اپنے ہوٹل پہنچا۔ ابھی یہاں مجھے دو راتیں اور دو دن بسر کرنے تھے۔ میں زیادہ وقت ہوٹل کے کمرے میں ہی گزارتا۔ باہر نکلنے سے سی آئی ڈی کی نظروں میں آجانے کا ڈر تھا۔ میں ایک دشمن ملک میں تھا جہاں قدم قدم پر پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی یاد نہ آیا کہ بچتا بھی اسی شہر میں رہتی ہے۔ یا شاید اس نے کہا تھا کہ وہ بمبئی چلے گئے ہیں۔ نکلنے میں ان کا آباؤ گھر تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اپنی پڑی ہوئی تھی اور عشق و محبت سب کچھ بھول چکا تھا۔ بھارتی پولیس کی قید میں جانا موت سے بدتر تھا۔ میں نے ان لوگوں کی بڑی ہوئی تھی اور عشق و محبت سب کچھ بھول چکا تھا۔ بھارتی پولیس کی قید میں جا موت سے بدتر تھا۔ میں نے ان لوگوں کی بڑی درد انگیز کہانیاں سن رکھی تھیں جو بھارت میں جاسوا کے الزام میں پکڑے گئے اور پھر جیل خانوں میں پولیس اور سی آئی ڈی کی اذیتیں برداشت کرتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی لئے میں ہوٹل سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ صرف شام کے بعد تھوڑی دیر کو ٹھٹھنے کے لئے نکلتا۔ اب میرے پاس روپے بھی کم ہو رہے تھے۔ بہرہ اتنی رقم باقی تھی کہ ہوٹل کا بل ادا کر کے یہاں سے نکل سکوں۔ تیسرے دن میں صبح صبح ہوٹل سے نکل گیا۔

سیدھا شام بازار گنگولی سنگھ کے گھر جا پہنچا۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں اس نے پولیس میں میرا مخبری نہ کر دی ہو۔ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں داخل ہوا۔ نوکر نے اندر جا کر اطلاع دی۔ گنگولی نے مجھے اندر بلایا۔ وہ ناشتا کر رہا تھا۔

اس نے مجھے چائے بنا کر دی اور بولا:

”میں تمہارے چچا کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اس وقت ملک کے حالات

ایسے نہیں کہ میں تمہیں بارڈر کراس کرنے کا مشورہ دوں۔“

پاس ہی ایک آرام کرسی تھی دیوار پر گورڈناٹک کی فریم کی ہوئی تصویر لگی تھی۔ اس نے خالص اور ٹھیکہ پنجابی میں مجھ سے پوچھا کہ میں پنجابی ہوں کیا؟ میں نے کہا۔ ”جی ہاں سردار جی! پنجابی ہوں۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ مشرقی پاکستان میں کاروبار کرتا تھا۔ انقلاب کے بعد وہاں سے فرار ہو کر کلکتہ پہنچا۔ گنگولی صاحب سے ملا۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

ہزنام سنگھ ہنس پڑا۔ پھر میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔
”یار لاہور کا کیا حال ہے؟“

میں نے اُسے بتایا کہ لاہور نے بہت ترقی کر لی ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں بن گئی ہیں۔ نئی سڑکیں تعمیر ہو گئی ہیں۔ ہزنام سنگھ نے صندوق میں سے انگریزی شراب کی بوتل نکال کر کہا۔
”یار لاہور۔ لاہور سی اسے۔ پیو گے؟“
”شکر بہ سردار جی! میں نہیں پیا کرتا۔“

”یار تم لاہور کے ہو اور شراب نہیں پیتے؟ لاہور کے لوگ تو بڑے زندہ دل ہوتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔“
اس نے اپنا گلاس شراب سے بھرا اور اُسے غٹا غٹا پی لیا۔ پھر پیالی میں سے تھوڑا سا لکے کر زبان پر رکھا اور سر کو جھٹکا دے کر بولا۔
”تو پھر تم لاہور جانا چاہتے ہو بھائی جی۔“
”جی ہاں! میرے پھوٹے پھوٹے بچے بہت پریشان ہوں گے۔“

ہزنام سنگھ بولا۔ ”بچے سب کے سانچے ہوتے ہیں۔ ایک تو تم پنجابی ہو۔ اوپر سے لاہوری ہو۔ پھر تم میرے بڑے گھر سے یار رام گنگولی کا خط لائے ہو۔ میں تمہاری نذر مدد کروں گا۔“

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو کام بن گیا۔ اس نے شراب کا دوسرا گلاس پی کر مجھے بتانا شروع کیا کہ آج کل بارڈر پر دونوں طرف کی فوجیں ہر وقت گشت کرتی رہتی ہیں۔ جگہ جگہ فوجوں نے بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ سمگلروں نے آمد و رفت وقتی طور پر بند کر دی ہے۔

چھوڑتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ بنگال کا صوبہ ختم ہو گیا۔ میں ڈبے میں خاموشی سے دبکا بیٹھا رہا۔ منغل سرانے کے سٹیشن پر اتر کر میں نے پانی پیا۔ سگریٹ سلا کر اس کے کش لگائے اور دوبارہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ یہاں سے یوپی کی پولیس ٹرین میں سوار ہو گئی۔ سپاہی ہر ڈبے میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ میں نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ٹرین نے چلنا شروع کیا۔ ساری رات گاڑی سفر کرتی رہی۔ دوسرے دن دوپہر کو دلی کے مصفا فٹ شروع ہو گئے۔ دلی۔ جو کبھی مسلم تہذیب و ثقافت کا گہوارہ تھی۔ دُور سے مجھے جامع مسجد کے مینار نظر آئے۔ مسلم تہذیب کے اس نشان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیسے کیسے انقلاب دیکھتے ان میناروں نے! اکیسے کیسے طوفان گذرے تھے اس شہر پر سے۔ ٹرین دلی کے بہت بڑے اسٹیشن وسیع یارڈ میں سے گذر رہی تھی۔ جتنا کابل ہم عبور کر آئے تھے۔ مختلف ریل کی پٹریوں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک باروق پلیٹ فارم پر آکر رُک گئی۔ میں ڈبے میں سے دوسرے مسافر کے ساتھ نیچے اتر آیا۔

میں جانتا تھا کہ یہاں بھی سی آئی ڈی کے بے شمار آدمی ہوں گے جو ان لوگوں کی تلاش میں ہوں گے جو مشرقی پاکستان سے فرار ہو کر آئے ہیں۔ میں سب کی نظروں سے بچتا بچتا بڑی خانہ اور اعتماد کے ساتھ سٹیشن سے باہر آ گیا۔ یہ سا مارا علاقہ میرا دیکھا بھلا تھا۔ میں ایک رکشے پر سو ہوا اور سیدھا جامع مسجد آ گیا۔ مجھے چلتی قربازار کا راستہ معلوم تھا میں نے رکشا چھوڑ دیا اور پیدل ہی چلتی قبر کے بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ کبھی یہ خالص مسلمانوں کی آبادی تھی۔ مگر اب بے شمار ہندوؤں اور سکھوں کی دکانیں اور مکان تھے۔ مسلمان بڑے دب کر چل پھر رہے تھے ہر عورت برقعے کے بغیر نظر آ رہی تھی اور اس نے ماتھے پر تنک لگا رکھا تھا۔ ظاہر ہے ان میں عورتیں بھی تھیں۔ چند ایک بوڑھی عورتیں برقعوں میں نظر آئیں۔

بوچھتے بوچھتے آخر میں ہزنام سنگھ ترکھان کی دکان پہنچ گیا۔ یہ ہٹا کٹا سکھ رند نے اسے لکڑی کا تختہ پھیل رہا تھا۔ میں نے جاکر آداب عرض کیا تو اس نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ کام پھر بھی کرتا رہا۔ میں نے جیب سے کاغذ نکال کر اسے دیا۔ اس نے رقعہ پڑھا اور مجھے اپنے سا دکان کے اندر لے گیا۔ یہ پردے کے پیچھے ایک میٹھک سی بنی تھی جہاں ایک چارپائی بھی تھی

سے دیکھ رہا ہے۔ میں ڈر گیا۔ مجھے خواہ مخواہ یقین ہو گیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ مجھ سے اب وہاں بیٹھا نہ گیا۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ بل ادا کیا اور ہوٹل سے باہر آکر گراؤنڈ میں سے ہو کر ریلوے سٹیشن والی ہارڈنگ لائبریری کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

اس لائبریری میں کبھی میں دیر تک بیٹھا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ آج اس لائبریری کے قریب سے پریشان ہو کر گذر رہا تھا۔ میں نے یوں ہی کسی بہانے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہی آدمی برابر میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اب تو اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ شخص سی۔ آئی۔ ڈی کا ہے اور اُسے مجھ پر شک پڑ گیا ہے۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ ایک دم بھاگ اٹھوں۔ پھر سوچا کہ یہ بڑی خطرناک بات ہوگی۔ اس طرح تو یہ سارے لوگ مجھے پکڑنے کے لئے میرے پیچھے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ وہ آدمی تو برابر میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں ہارڈنگ لائبریری کے عقب سے ہو کر سامنے مزار والی سڑک پر آیا تو وہی آدمی میرے آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑی ذہانت تھی اور شکل صورت سے بڑا مکار آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ اس نے سیدھا سوز کی طرح حملہ کر دیا۔

”تم ڈھاکے سے آئے ہو؟“

ایک بار تو مجھے پینہ آگیا۔ پھر سنبھل کر کہا کہ میں ڈھاکے سے ہرگز نہیں آیا۔ بلکہ میں کلکتے سے آیا ہوں جہاں میں پیدا ہوا اور اپنے چچا کے ساتھ مل کر کاروبار کرتا ہوں اور دلی اپنے ذاتی کام سے آیا ہوں۔ میں بنگالی زبان بڑی روانی سے بول سکتا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

”تمہیں میرے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا۔“

یہ وہ جملہ تھا جو میری جان نکالنے کے لئے کافی تھا۔ اس ایک جملے سے ہی میں ڈرتا تھا۔ میں تھلنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ تھانے جانے کا مطلب یہ تھا کہ میری زندگی ختم ہو گئی اور میں پھر کبھی اپنے بال بچوں کا منہ نہ دیکھ سکوں گا۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے بھاگنے کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ارد گرد نظر دوڑا کر دیکھ

”اس لئے ہو سکتا ہے تمہیں امرتسر جا کر کچھ دیر انتظار کرنا پڑے۔ لیکن فکر نہ کرو۔ گوری کی کپڑے تم کو بارڈر کر اس کرا دوں گا۔ ابھی تم یہاں ہی ٹھہرو۔ دلی کی سیر کرو۔ مزے کرو۔“

میں نے کہا۔ ”سردار جی! میں بہت جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنے دوست کے پاس امرتسر بھجوا دیں تو میں بہت مشکور ہوں گا۔“

اس پر ہنرمہن سنگھ نے غصے میں کہا۔

”مرتے کیوں جاتے ہو۔ تمہیں اس طرح تو بارڈر کر اس نہیں کراؤں گا کہ

تمہاری لاش وہاں پڑی رہ جائے۔ ذرا صبر کرو۔ مجھے سوچنے دو۔“

میں چپکا ہو رہا۔ ہنرمہن سنگھ نے میز پر انگلی بجاتے ہوئے سوچنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سوچ رہا ہے یا صرف میز پر انگلی بجا رہا ہے۔ جب وہ سوچ چکا تھا تو اس کی انگلی رک گئی۔ اس نے اپنی پگڑی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا یا تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی سکھ سے پالا پڑا ہے۔ تم میرا خط لے کر یہاں سے سیدھے امرتسر چلے جاؤ۔ وہاں کٹرہ میاں سنگھ میں سیوا سنگھ سے مل لینا۔ شریف پورے کے باہر اس کی ریڈیو کی دکان ہے۔ بس یہ میرا خط اُسے جا کر دے دینا باقی سا کام وہ خود کرے گا۔“

ہنرمہن سنگھ نے مجھے گورکھی میں ایک خط لکھ کر دیا۔ جسے میں نے تہہ کر کے قیص جیب میں رکھ لیا۔ ہنرمہن سنگھ نے مجھے مسلمان ہوٹل سے کھانا منگو کر کھلایا۔ اب اُسے شراب چڑھ گئی تھی اور وہ اپنی ساس کو نہایت اچھے دارگالیاں دے رہا تھا کیونکہ اس نے ہنرمہن سنگھ کی بیوی کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اونگہ رہا۔ پھر وہ چارباٹی پر گر کر سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور بازار چٹا میں آگیا۔ یہ وہی گلی کوچے تھے جسے شاعر نے اوراقِ مصور کہا تھا۔ اب وہاں سکھوں کی شاکا بجا بل رہی تھیں۔ جامع مسجد کے باہر آ کر میں نے ایک رستوران میں بیٹھ کر چائے چائے پیتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ایک آدمی ذرا پرے میز پر بیٹھا مجھے

پس کھڑا ہونے لگا۔ پھر میں نے گلی میں کسی کے بھاگ کر آگے نکل جانے کی آواز سنی۔ میرا دشمن
 بڑی تلاش میں آگے نکل چکا تھا۔ اب میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ مکان کا صحن بالکل خالی
 تھا۔ کوئی ایک بختہ سیڑھی اوپر کھڑی ہے۔ اوپر چو بارہ تھا۔ جس کی کھڑکیاں بند تھیں۔
 غریب شاید کوئی بھی نہیں تھا۔ صحن میں ایک طرف چوہا بنا تھا اور پیپ بھی لگا تھا۔ اب میرا
 ہر گنا ٹھیک نہیں تھا مجھے اس گھر میں پناہ حاصل کرنی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ گھر کس
 تھا؟

میں کچھ دیر دروازے کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ پھر میں نے چو بارے کا اوپر والا دروازہ
 ملنے کی آواز سنی۔ اس کے بعد ایک ڈبلی تیلی، سانولی سی لڑکی جس نے گرم شال اوڑھ رکھی تھی
 تھ میں ایونیم کی چائے کی کیتلی لے نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے کیتلی گرتے گرتے
 بی۔ مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہ مسلمان کا گھر ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

”بیٹی! مجھے اپنے والد صاحب یا بھائی جان سے ملا دو۔ میں مسلمان ہوں
 اور اس گھر کی پناہ لینے آیا ہوں۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور واپس بھاگ گئی۔ میں شش و پنج میں تھا کہ اوپر سیڑھی پر
 ایک بھاری بھر کم سفید ریش آدمی نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں لٹھ تھا۔ اس نے کڑک دار
 آواز میں کہا۔

”کون ہو تم؟“

میں نے کہا۔ ”میرے محترم! اگر آپ مجھے اتنی اجازت دیں کہ میں آپ کے
 سامنے اپنی دردناک کہانی بیان کر سکوں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔
 میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میں ایک شریف مسلمان ہوں۔ اور اس وقت
 زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔“

میری باتوں نے اس شخص پر خاطر خواہ اثر کیا۔ اس نے وہیں سے اشارہ کر کے مجھے اوپر
 بلا لیا۔ میں نے احتیاط دروازے کی کڑی چڑھادی اور اوپر چو بارے میں آ گیا۔ یہ ایک
 سیدھا سادہ کمرہ تھا۔ جس میں ایک پلنگ، ایک تخت اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں

لیا کہ وہاں بھاگنے کو بہت جگہ تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ سارا علاقہ کھلا تھا۔ وہاں کوئی
 گلیاں نہیں تھیں جہاں میں نظروں سے اوجھل ہو سکتا۔
 میں نے کہا۔ ”آپ کے پاس اگر وارنٹ ہیں تو دکھائیں۔ اس طرح میں آپ کے ساتھ
 تھانے نہیں جاؤں گا۔“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بھائی صاحب مجھے معلوم ہے کہ آپ بنگال
 نہیں ہیں۔ آپ پنجابی ہیں اور ڈھاکے سے فرار ہو کر آئے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ سیدھے
 بھاؤ میرے ساتھ تھانے چلے چلیں نہیں تو مجبوراً مجھے تشدد سے کام لینا پڑے گا۔“
 میں نے دل ہی دل میں ایک سکیم بنائی اور کہا۔

”چلئے۔ میں تیار ہوں۔ تھانے جا کر سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہ ملے گا
 آپ کو۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر واپس چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھانہ اس علاقے کا جگت سینا
 کے بیچے ایک ننگ سے بازار میں ہے۔ ہم جگت سینا کے قریب آ گئے۔ وہ اس طرح میرے
 ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ میں بھاگ نہ سکتا تھا۔ لیکن اب میری سکیم پر عمل کرنے کا
 وقت آ گیا تھا۔ تھانہ دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ موت و دو قدم کے فاصلے پر تھی
 مجھے معلوم تھا کہ اگر ایک بار میں تھانے میں داخل ہو گیا تو دنیا کی کوئی طاقت پھر مجھے وہاں سے
 زندہ سلامت باہر نہیں نکال سکے گی۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ ایک چھوٹی سی گلی گھوم رہا
 تھی۔ سامنے تھانہ تھا۔ میں چلتے چلتے دائیں جانب ہو گیا۔ سی آئی ڈی والا بھی اس طرف ہو گیا۔
 میں اس کے پیچھے آ گیا۔ وہ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جب ایک بجلی سی چمکی اور
 میں نے پوری طاقت سے اُسے دھکا دے کر زمین پر گرادیا۔

اس کے گرنے ہی میں گلی کی طرف بھاگا۔ میں بجلی ایسی تیزی کے ساتھ گلی میں مڑ گیا۔ یہ گلی
 آگے جا کر بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ میں بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا۔ تین چار موٹر گھوم کر مجھے ایک
 جگہ گلی میں قریبی ہوئی نظر آئی۔ اس کے پیچھے شرنہہ کا درخت تھا ساتھ ہی ایک گھر کا
 دروازہ آدھا کھلا تھا میں بے دھڑک اس دروازے میں داخل ہو گیا اور پیٹ بند کر کے

میں میری بڑی ساکھ ہے۔ پولیس والے کبھی ادھر نہیں آئے۔ تم اطمینان سے بیٹھو۔ ہاں یہ بتاؤ کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟

میں نے انہیں بتایا کہ میں امرتسر جا رہا ہوں۔ وہاں ایک سنگمر کے نام میرے پاس خط ہے۔ اس کی مدد سے بارڈر کراس کرنے کی کوشش کروں گا۔

بڑے میاں بولے ”خدا کرے کہ تم اس میں کامیاب ہو جاؤ۔ ویسے تمہیں ہوشیار رہنا ہو گا۔ آج کل کا زمانہ کسی پر بھروسہ کرنے کا زمانہ نہیں ہے۔ اور پھر جس کے پاس تم جا رہے ہو وہ مسلمان بھی تو نہیں ہے۔“

بڑے میاں کا قیاس بالکل درست تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا کسی نہ کسی پر تو مجھے بھروسہ کرنا ہی تھا۔ اور پھر میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ یہ سنگمر لوگ بڑے بھروسے کے آدمی ہوتے ہیں۔ ان کا آپس میں بھی بڑا اچھا لین دین ہوتا ہے۔ جس کسی کو چاہیں یہ بڑی حفاظت سے بارڈر کراس کر دیا کرتے ہیں۔



شام کو بڑے میاں کا لڑکا بھی آگیا۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر اس کے والد نے میرا تعارف کروایا اور اسے بھی میری ساری کہانی مختصر سنائی۔ اس کی باتوں سے محسوس ہوا کہ وہ کچھ گھبرا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ سرکاری ملازم تھا۔ رات کا کھانا ہم نے مل کر کھایا۔ رات کو دیر تک یہ لوگ مجھ سے پاکستان کی باتیں سنتے رہے اور سقوط ڈھاکہ پر افسوس کرتے رہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بڑے میاں کا لڑکا میری آمد پر پریشان ہے، سونے کے لئے مجھے نچیلے کمرے میں چار پائی بچھا دی گئی۔ رات گزر گئی۔ صبح بڑے میاں کا بیٹا میرے پاس آیا اور کہنے لگا

”بھائی صاحب! میں دل کا صاف آدمی ہوں۔ آپ سے کوئی لٹی نہیں رکھنا چاہتا۔ بات یہ ہے کہ میں آپ کے یہاں رہنے سے پریشان ہو گیا ہوں۔ میں ایک غریب ہیڈ کلرک ہوں۔ سرکاری ملازم ہوں۔ آپ تو چلے جائیں گے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ آپ کو میں نے اپنے گھر میں پناہ دی ہے تو میرا سارا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اس لئے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں۔“

پرمکے مدینے کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ وہ لڑکی ایک طرف کھڑی مجھے حیرانی تک رہی تھی۔ اس بزرگ نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور لڑکی سے چائے لانے کی ہدایت کی۔ رات چلی گئی تو بزرگ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”ہاں بھائی صاحب! اب آپ بتائیے کیا ہے آپ کی درد بھری کہانی؟ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے اور یہ آپ کیوں شریف لوگوں کے گھروں میں گھسے چلے آ رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”سب سے پہلی بات جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ میں پاکستانی مسلمان ہوں اور ڈھاکے سے فرار ہو کر یہاں آ رہا ہوں۔“

”اے؟“ بڑے میاں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ وہ اپنی جگہ پر ہل گیا اور بڑے غور سے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھنے لگے۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے مجھے اٹھ کر اپنے گلے سے لگالیا۔ ان کے اس درد مندانہ رویے سے مجھے بے حوصلہ ہوا۔ پھر میں نے انہیں الفاظ سے لے کر یہ تک اپنی ساری کہانی سنا ڈالی۔ میری سن کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے لٹھ زمین پر مار کر کہا۔

”میاں! تم جب تک چاہو یہاں چھپے رہو۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس گھر میں آکر تمہیں گرفتار کرے۔ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔ وہ دفتر گیا ہوا ہے۔ یہ میری بہو تھی جو تمہارے لئے چائے پینے گئی ہے۔“

بڑے میاں کی بہو کا نام آمنہ تھا۔ بڑی شریف لڑکی تھی۔ وہ چائے لے کر آگئی۔ بڑے میاں اور میں چائے پینے لگے۔ انہوں نے ڈھاکے کے حالات کرید کرید کر مجھ سے پوچھے۔ بیچ بیچ میں ٹھنڈی آہیں بھی بھرتے رہے۔ انہیں ایک سچے مسلمان کی طرح سقوط ڈھاکہ کا صدمہ ہوا تھا۔ مجھے اندر ہی اندر یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں سی آئی ڈی والا یہ کچھ ابھی تک گلی میں نہ منڈلا رہا ہو۔ بڑے میاں پر میں نے اپنے دل کی بات ظاہر کی تو وہ بولے۔

”ارے میاں! گھبراؤ نہیں۔ یہاں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ میں ایک مشہور کتب خانے میں خزانچی تھا۔ اب ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ محلے

وہ بھی بے بس تھے۔ اپنے بیٹے کی مرضی کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں سارا دن اس مکان میں، اس انمول پناہ گاہ میں بیٹھا اخبار اور رسالے پڑھتا رہا۔ دوپہر کو کھانا کھا کر بیٹ گیا۔ مگر نیند کو سوسوں دُور تھی۔ میری منزل بھی کو سوسوں دُور تھی، ہزاروں، لاکھوں میل دور تھی۔ خدا دن کب لائے گا جب میں اپنے وطن، اپنی پہلی اور آخری پناہ گاہ پاکستان کی سر زمین میں قدم رکھوں گا؟

کوئی تین سچ رہے تھے کہ بڑے میاں کا لڑکا آگیا۔ اُس نے مجھے ٹمکٹ دے کر بتایا کہ پنجاب میں ٹھیک سوا پانچ بجے شام چھوٹ جاتی ہے۔ میں نے تیاری شروع کر دی۔ تیاری کیا کرنی تھی۔ ایک کبیل اور گرم کوٹ ان لوگوں نے مجھے سردی سے بچنے کے لئے دے دیا تھا۔ کبیل کو میں نے تہہ کر لیا۔ گرم پانی سے غسل کیا۔ چائے پی۔ سانولی بیٹی نے مجھے دوپڑاٹھے بنا کر ساتھ دیئے اب میں اس گھر سے نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے میں نے بڑے میاں کو اس کے رُکے اور ان کی بہو کو سلام کیا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور کوٹ کھول کر دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ بڑے میاں کا لڑکا باہر نکل گیا۔ اس نے گلی میں گھوم کر بھر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی دوسرے محلے کا آدمی نہیں تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور گلی میں آگیا۔

میں گلیوں کی اوپر سے ہوتا ہوا دوسری سمت کو ایک بازار میں نکل آیا۔ یہاں ایک ٹیکسی مجھے خالی مل گئی۔ اس کا ڈرائیور سکھ تھا۔ میں نے اُسے لیڈی ہارڈنگ لائبریری چلنے کو کہا میں قصداً اُسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں ریلوے اسٹیشن جا رہا ہوں اور لائبریری ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہی تھی۔ سکھ ڈرائیور نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ بس اپنے دھیان میں گاڑی چلاتا رہا۔ لائبریری کے سامنے جا کر گاڑی رُک گئی۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور نیچے اُتر آیا۔ میں یوں ہی جھوٹ موٹ لائبریری کے اندر چلا گیا۔ جب اس بات کی تسلی ہو گئی کہ ٹیکسی ڈرائیور دور نکل گیا ہو گا تو بڑی خاموشی سے لائبریری کی عمارت سے باہر نکلا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ دلی کاریلوے اسٹیشن بالکل ویسا ہی تھا۔ کہیں کہیں نئے بلاک تعمیر ہوئے تھے۔ باہر سے بناوٹ بالکل وہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ پلیٹ فارم پر بڑی رونق تھی بلٹ

..... مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن میں بے بس ہوں۔ مجبور ہوں۔ یہاں کے مسلمان پہلے ہی بھارتی حکومت کے غتاب میں ہیں۔ اب اگر انہیں معلوم ہوا کہ میں نے پاکستان کے ایک مفور مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ آبا جان نے جذباتی ہو کر آپ کو پناہ دے دی تھی۔ بہر حال ایک دو روز تو شاید میں بھی آپ کی مدد کر دیتا۔ لیکن اس سے زیادہ بڑا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔“

یہ بھارت میں رہنے والے ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔ یہ نوجوان بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ یہ اس کا دل بول رہا تھا۔ ناراض ہونے کی بجائے مجھے اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ واقعی مجبور تھا۔ بے بس تھا۔ میں نے کہا۔

”میرے بھائی! میں تمہاری پوزیشن کو بڑی اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ تم سچے ہو۔ میں آ ہی رہا ہوں۔ لیکن تم میرا صرف ایک کام کر دو۔ میرے لئے دلی سے امرتسر تک کا تھوڑا سا کالٹ خرید کر لے آؤ اور یہ بتا کر آؤ کہ گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ یہ لو ٹمکٹ پیسے۔“

اُس نے ہاتھ پیچھے کھینچ کر کہا۔

”ایسا نہیں ہے۔ میں پیسے نہیں لوں گا۔ کم از کم اتنی مدد تو مجھے کر لینے دیں میں آج دفتر سے آتے ہوئے ساری معلومات حاصل کر کے آؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ گاڑی پنجاب کی طرف شام کو جاتی ہے۔“

وہ دفتر چلا گیا۔ بڑے میاں نے مجھے ہلا کر پوچھا کہ اس کا بیٹا مجھے کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے اُٹال دیا اور کوئی بات بیان نہ کی۔ صرف اتنا کہا کہ میں آج شام جا رہا ہوں۔ اس نے تعجب کا کرتے ہوئے کہا کہ کہیں اس کے بیٹے نے تو مجھے جانے پر مجبور نہیں کیا؟ میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ میرے لئے آرام کا بہتر کا وقت ہے اور یہ کہ میں جلد از جلد اس ملک سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ بڑے میاں خاموش ہو گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے انہیں پتا چل گیا ہے کہ اُن کے بیٹے نے مجھ سے کیا باتیں کی ہیں۔

بائی انخروی دسل کے بعد ریل گاڑی شور مچاتی دلی کے ریلوے سٹیشن سے نکل کر باہر کھلے
رڈ میں آگئی اور امرتسر کی طرف روانہ ہو گئی۔ مجھے امرتسر کی طرف جاتے عجیب سا احساس
دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ میں اس شہر میں زندگی کے چھ سال بسر کر چکا تھا۔ پاکستان بننے
سے پہلے میں دہلی والد صاحب کے ساتھ سلولائیڈ کا کاروبار کرتا تھا۔ والد صاحب کی
کان ہال بازار میں مسجد خیر دین کے سامنے تھی۔ تب میری عمر بارہ برس کی تھی۔ ظاہر ہے
ب مجھے دہلی کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں نے ویسے بھی تھوڑی تھوڑی دائرہ ہی بڑھالی تھی
یسی کہ بنگالی عام طور پر بڑھالیا کرتے ہیں۔ گاڑی اڑی چلی جا رہی تھی۔

ساری رات گاڑی اپنا سفر کرتی رہی۔ دن چڑھتا تو ہم پنجاب میں داخل ہو چکے تھے۔
اتنے میں جانے کون سے سٹیشن پر گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔ جالندھر کا ریلوے سٹیشن
لیا۔ ہر طرف سکھ ہی سکھ تھے۔ یہاں سے گاڑی چلی تو اس نے بہت زیادہ رفتار پکڑ لی۔
بھم بھم کے فسادات کا زمانہ یاد آگیا۔ اس زمانے میں یہاں کھیتوں میں چاروں طرف مسلمانوں
لااشیں بکھری پڑی تھیں۔ مہاجرین کے قافلے بے یار و مددگار پاکستان کی طرف رواں تھے۔
اتنے میں ان پر جگہ جگہ حملے ہوتے تھے۔ چیخ و پکار مچتی اور حملہ آور ہندو سکھ انہیں گاجر مولی
ناظر کاٹ کر آگے نکل جاتے۔ مانا نوالہ سٹیشن بھی گذر گیا۔ اب امرتسر شہر کے مضامات شروع
ہو گئے تھے بائیں جانب کہیں کہیں کوٹھیاں اور مکان نظر آنے لگے۔ پھر شریف پورہ آگیا جو
کبھی امرتسر مسلمانوں کی بڑی طاقت و رستی تھی۔ عید گاہ بھی گذر گئی۔ گاڑی اُونچے پل کے نیچے
سے گذر کر امرتسر ریلوے سٹیشن کے اندر داخل ہو گئی۔

دن کے دس بجے کا وقت تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔ لیکن سرد
ہوا چل رہی تھی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی گاڑی سے اتر پڑا۔ ریلوے سٹیشن سے باہر
آگے کسی یا تا نگہ لینے کی بجائے میں پیدل ہی شریف پورے کی طرف چل پڑا۔ مجھے کھڑا جہاں سنگھ
والے سیوا سنگھ کی دکان کی تلاش تھی جو دہلی کی ریلوے کی دکان کرتا تھا۔ میں اُونچے پل پر سے
گذر کر مسلم ہائی سکول کو جانے والی سڑک پر ہولیا۔ (جو کبھی مسلم ہائی سکول تھا۔) یہاں بھی
اب بازارش ہو گیا تھا۔ تانگے، سائیکل، رکشا اور پیدل لوگ آ جا رہے تھے۔ میری طرف

میرے پاس موجود تھا۔ ریل پلیٹ فارم نمبر ۳ سے روانہ ہوتی تھی۔ میں وہاں آگیا۔ امرتسر
جالندھر کی سمت جانے والی سواریاں وہاں گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ ان میں زیادہ
سواریاں سکھوں کی تھیں۔ ہندو بھی تھے۔ یہ پنجاب کے لوگ تھے۔ لیکن مجھے ان کے ساتھ
اُردو یا بنگالی ہی بولنی تھی۔ مجھے یہی ظاہر کرنا تھا کہ میں بنگالی ہوں اور کاروبار کے سلسلے
میں امرتسر کا دورہ کر رہا ہوں۔ میں پنجابی میں ان کے ساتھ بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے
کہ مسلمان اپنی پنجابی سے فوراً پہچانا جاتا ہے اور بھارت کے پنجاب میں کوئی مسلمان نہیں تھا
میری پنجابی سے اُن کو شک پڑ سکتا تھا کہ کہیں میں پاکستان کا جاسوس تو نہیں ہوں۔

ٹھیک پانچ بجے ریل گاڑی چھک چھک کرتی پلیٹ فارم نمبر ۳ میں داخل ہو گئی۔ یہ
دس پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ ہر شخص کو اپنی پرگئی۔ لوگ سامان اٹھا کر ڈبوں کی طرف بھاگنے
لگے۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ میں کسی بھی ڈبے میں سوار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے
سیکنڈ کلاس کے ساتھ والا نوکروں کا ڈبہ پسند کیا اور اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ڈبہ اس لئے
بھی موزوں تھا کہ یہاں عام طور پر افسروں کے بیرے سفر کرتے تھے اور وہ سوائے اپنے افسروں
کی عادتوں اور بیگم کی برائیوں کے اور کسی موضوع پر بات نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا سفر میں
ساتھ میرے لئے نقصان دہ اور خطرناک نہیں تھا۔ مجھے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر کونے
میں جگہ مل گئی۔ یہاں پہلے ہی سے دو ہندوستانی بیرے بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے بنگالی
میں بات شروع کی تو وہ ہنس کر بولے۔

”بابا ہم کو بنگلہ بھاشا نہیں آتی۔“

میں ہنس پڑا اور ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بنگالیوں کی طرح باتیں کرنے لگا۔ میں نے
انہیں بتایا کہ میں کلکتے میں رہتا ہوں اور اپنے بھائی کے ساتھ پلاسٹک کا کام کرتا ہوں اور
امرتسر اس کام کی مارکیٹ معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ ایک بیرا بولا۔

”اُدھر پنجاب میں بڑی مانگ ہے۔ ہمارا صاحب تو کہتا ہے آج کے زمانے
میں ہر شے پلاسٹک کی ہو گئی ہے۔“

ہم اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور ریل کے انجن نے سیٹی بجادی۔ جاڑے بھی سیڑ

پہنچ سکوں گا؟ کیا یہ سبھی سیدھا سنگھ مجھے بارڈر کراس کرا دے گا؟ میرا وطن پاکستان، میرا شہر لاہور وہاں سے چند میلوں کے فاصلے پر تھا جہاں میرے ہم وطن، مجھ سے محبت کرنے والے لوگ اور میرے پیارے بچے اور میری بیوی میری راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ تو یہی سمجھ بیٹھی ہوگی کہ میں کہیں ٹرکھپ گیا ہوں یا بھارتی فوج نے مجھے قیدی بنا لیا ہے۔ وہ خون کے آنسو رو رہی ہوگی۔ مزاروں پر جا کر منتیں مانگ رہی ہوگی۔ میرے بچے مجھے یاد کر کے اداس ہو جاتے ہوں گے۔ کاش! میرے پر نکل آتے اور میں اڑ کر اپنے وطن پہنچ جاتا! لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں انسان تھا۔ پرندہ نہیں تھا۔ مجھے تکلیفوں اور تجربوں کی بھٹی سے نکل کر آگے بڑھنا تھا۔ چائے پی کر میں سگریٹ سلگانے لگا تو مجھے خیال آگیا کہ یہ سبھی کی دکان ہے اور سبھی سگریٹ نوشی کو پسند نہیں کرتے۔ میں نے ڈبیا جیب میں ہی رہنے دی۔ اتنے میں ایک خوش پوش گرم سوٹ میں ملبوس صحت مند نوجوان سبھی دکان میں داخل دکان میں داخل ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

”میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟“

میں نے اس سے کہا۔

”میں سیدھا سنگھ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں ہی سیدھا سنگھ ہوں جناب! فرمائیے۔“

”کیا آپ کٹڑہ مہاں سنگھ میں رہتے ہیں؟“

”جی ہاں! آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“

میں نے جیب سے خط نکال کر اُسے دے دیا۔ خط اس نے آدھا پڑھا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ دکان کے پیچھے لے گیا۔ اور پر وہ آگے کر دیا۔ یہاں ایک پلنگ بچھا تھا۔ ریڈیو میز پر رکھا تھا۔ اس نے مجھے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور غور کر سی پر بیٹھ کر خط پڑھنے لگا۔ خط پڑھ کر اس نے پھاڑ کر جلا دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”میرے یار نے مجھے بڑے مشکل کام کے لئے کہا ہے۔ مگر یہ کام کرنا بھی

ضرور ہوگا کیونکہ اوپر سے ننگولی کا حکم بھی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ پہلے آپ یہ

کسی نے بھی تعجب سے نہ دیکھا۔ میں ایک عام بنگالی ہندو کے لباس میں تھا۔ کالا بونٹ پاجامہ اور گرم کوٹ، بغل میں کبل لپٹا ہوا تھا۔ میں سگریٹ کا دھواں اڑاتا بظاہر بڑے پرواہی سے چلا جا رہا تھا لیکن اندر سے بہت ہوشیار اور چوکنا تھا۔ مجھے کوئی نہیں دے رہا تھا لیکن میں ہر آنے جاتے کو پورے غور سے نگ رہا تھا کہ کہیں کوئی سی آئی ڈی کا آڈا تو میرے پیچھے نہیں لگ گیا۔

اس شہر میں سی آئی ڈی کے بہت آدمی عام لباس میں گھوم پھر رہے تھے۔ کیونکہ بارڈر ٹاؤن تھا اور پاکستان کی سرحد یہاں سے سولہ سترہ میل کے فاصلے پر تھی۔ اب شراب پورے کی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ اس کا نام اب شاید سنگھ پورہ پڑ گیا تھا۔ وہی پرانے تھے۔ کئی جگہوں پر نئے مکان بھی بن گئے تھے۔ باہر کے رُخ پر جہاں کبھی ایک مکان بھی دا نہیں تھی۔ اب دکانوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ دکانوں کے سائے بورڈ گورکھی میں لکھے؟ مسلم ہائی سکول کے گیٹ پر بھی گورکھی کا بورڈ لگا تھا۔ ظاہر ہے اب یہ مسلم ہائی سکول ہندو پاتھی گراؤنڈ میں بھی مارکیٹ بن گئی تھی۔ شریف پورے کے جی ٹی بڈ والے دروازے۔ آس پاس دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ یہ تقریباً ساری دکانیں سکھوں کی تھیں۔ میں ریڈیو دکان کی تلاش میں تھا۔ آخر ایک دکان پر مجھے بہت سے ریڈیو اور ٹرانسپٹر الماریوں سے سجے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں اس دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک سکھ لڑکے نے مجھے ریڈیو شروع کر دیئے۔ میں نے اس سے سیدھا سنگھ کے بارے میں پوچھا۔

میں ٹھیک دکان پر آیا تھا۔ یہ سیدھا سنگھ کی دکان ہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سیدھا ذرا ہال بازار تک گیا ہے ابھی واپس آجائے گا۔ اُس نے مجھے کرسی دی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ دکان پر گورونانک اور گورو گوبند سنگھ کی تصویریں لگی تھیں۔ ریڈیو اور ٹرانسپٹر الماریوں میں قریب سے رکھے تھے۔ جاپانی عورتوں کے کیلنڈر بھی لگے تھے۔ سکھ لڑکے مجھ سے پوچھ لگا کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے اُسے یوں ہی بتایا کہ دلی میں میری ریڈیو کی دکان ہے۔ میں کچھ مال خریدنے امرتسر آیا ہوں۔ اس نے ساتھ والی دکان سے میرے لئے چا۔ منگوائی۔ میں چائے پینے لگا۔ دل یہی سوچ رہا تھا کہ کیا میں کبھی یہاں سے نکل کر لاہور

بتائیں کہ میں گے کیا؟

میں نے کہا۔ ”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی سرخارجی! میرا بارڈر کراس کرنا

بہت ضروری ہے۔“

”بھائی جی! ضروری تو ہے پر ہمیں بھی تو دیکھنا ہے کہ کہیں تمہیں بارڈر

کراس کراتے کراتے خود ہی نہ پکڑے جائیں۔ یا اگلے سنسار نہ پہنچ جائیں۔ میں تمہیں

خط لکھ دیتا ہوں۔ یہ خط لے کر ٹاری میں فوجا سنگھ ذیلدار سے ملو۔ وہ تمہیں

ٹھیک ٹھیک بتائے گا کہ بارڈر کی پوزیشن کیا ہے۔“

ڈھیلی ڈھالی پگڑی والے سکھ نے مجھے خط لکھ کر دے دیا۔ اس سے زیادہ بات کرنے

کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ٹاری کی طرف جانا کسی خطرے کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ کیونکہ ادھر

بارڈر شروع ہو جاتا تھا اور وہاں سے سی آئی ڈی قدم قدم پر تھی۔ لیکن مجھے ضرور جانا تھا یہ

ظہر مول لینا تھا۔ چنانچہ میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ دکان سے اٹھ کر سیدھا ریلوے اسٹیشن

پر آیا۔ گاڑی ادھر کوئی نہیں جا رہی تھی۔ وہیں سے مجھے ایک بس مل گئی۔ بس میں سوار ہو کر

میں ٹاری پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ کہیں یہ ایک بہت بڑا قصبہ ہوا کرتا تھا لیکن

بارڈر کے قریب آ جانے کی وجہ سے اس کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ بڑے بڑے جاگیردار سکھ

اپنی جائیدادیں فروخت کر کے امرتسر یا جالندھر کی طرف کوچ کر گئے۔ لاری اڈے پر اتر کر میں

ایک کھوکھلے دالے سکھ کی دکان پر جا کر کھڑا ہو گیا اور چائے کا ایک کپ طلب کیا۔ میں اس

سے فوجا سنگھ ذیلدار کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا کہتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ خدا

جانے وہ کتنا بڑا سمگلر ہوگا اور یہ کھوکھلے دالے مجھے کیا سمجھے گا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی

نہیں تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے دکاندار سے فوجا سنگھ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے میری

طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔

”اسی بازار میں سے ہو کر آگے چلے جاؤ۔ داہنی طرف آموں کا ایک باغ

آئے گا۔ اس باغ میں ایک پُرانی حویلی ہے۔ فوجا سنگھ اسی حویلی میں رہتے ہیں۔“

چائے کے پیسے دے کر میں سیدھا آموں کے باغ میں آ گیا۔ یہاں بیچ میں ایک پُرانی

حویلی کی اک منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ باہر چار پائی پر دو سکھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”شکریہ سرخارجی! میں نے ابھی چائے پی ہے۔“

مجھے وہیں بیٹھنے کو کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی میرے دل میں وہم

جاگ پڑا کہ وہ پولیس کو بلانے گیا ہے۔ اس وہم نے اتنی شدت پکڑ لی کہ میں اٹھ کر دکان میں آ گیا

اور پھر باہر سڑک پر بیٹھنے لگا۔ سردار سیوا سنگھ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس وقت مجھے سارا شہر دشمن

معلوم ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے دکان پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا

بس یہی خیال سن رہا تھا کہ ابھی پولیس کی جیب آئے گی اور مجھے گھیر ڈال کر گرفتار کر لیا جائے

گا۔ مجھے اتنی سردی میں بھی پسینہ آ گیا۔ سکھ لڑکے نے ریڈیو آن کر دیا۔ آواز آئی! ”یہ ریڈیو

پاکستان لاہور ہے۔“

میرے دل نے ایک آہ نکل گئی۔ یہ میرے شہر کی آواز تھی۔ میرے لوگوں کی آواز تھی۔ کیا

میں کبھی لاہور پہنچ سکوں گا۔ کاش! میں اس شہر سے کبھی باہر نہ نکلتا۔ لاہور سے پنجابی فلمی

گانے ہو رہے تھے۔ نور جہاں کی آواز پر سکھ جھوم رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس دکان سے

بھاگ جانا چاہیے۔ کیونکہ میوا سنگھ ضرور پولیس کو خبر کرنے گیا ہے۔ آخر وہ میری دشمن قوم

سے تعلق رکھتا ہے اُسے کیا پڑی ہے کہ میری خاطر اتنی مصیبت مول لیتا پھرے؟ وہ ضرور

مجھے گرفتار کروا کر نینامی حاصل کرے گا۔ پولیس کے محکمے سے بہتر کارکردگی کا سرٹیفکیٹ

لے گا۔ میں اپنی خدشوں میں گھرا ہوا تھا کہ مجھے سامنے سے میوا سنگھ آتا دکھائی دیا۔ اس کے

ساتھ ایک اور سکھ تھا۔ یہ نووارد سکھ ادھیر دھرم کا موٹی توند والا تھا۔ ڈھیلی ڈھالی سفید

پگڑی اس نے سر پر لپیٹ رکھی تھی۔ ہاتھ میں دو سونے کی انگوٹھیاں ضرور پہن رکھی تھیں۔

میوا سنگھ نے اشارے سے مجھے دکان کے پیچھے آنے کو کہا۔ میں اندر چلا گیا۔ نووارد سکھ کا

نام لیٹن سنگھ تھا۔ اُس نے مجھے سر سے پیر تک بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔

”بھائی جی! بارڈر کراس کرنا آج کل بڑا مشکل ہے۔ کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“

لیکن تمہاری جان جانے کا خطرہ بھی ہے۔ بارڈر پر فوج بہت گشت کرتی ہے۔ بارود دی

سُرنگیں بھی جگہ جگہ لگی ہیں۔ ہم خود مال لے کر نہیں جا رہے۔“

نو اطلاع دینے کے لئے ایک آدمی روانہ بھی کر دیا ہے۔

ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی تھی کہ جیب سے میں ڈھاکہ سے فرار ہوا تھا میرے اندر خطرے کو کچھ دقت پہلے بھانپ لینے کی چھٹی حس پیدا ہو گئی تھی۔ خطرے کو قریب آنے دیکھ کر میں غیر شعوری طور پر بے چین سا ہو جاتا تھا۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ رات کا پہلا حصہ گزر چکا تھا۔ یہی کوئی دس ساڑھے بجے کا وقت ہو گا میں کوٹھڑی میں خاموش بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ خدا کرے یہ آخری مرحلہ بھی خیر و عافیت سے گزر جائے۔ طاق بن مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں پیری بیوی اور بچوں کی شکلیں گھوم رہی تھیں۔ میں اُن کی یاد میں بے حد سو گوار تھا کہ اچانک بس نے فضا میں خطرے کی بومحسوس کی۔ میں نے جلدی سے سگریٹ بجھا دیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

حویلی کے عقبی حصے کی جانب سے کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دل نے کہا کہ اس کوٹھڑی سے باہر نکل جاؤ۔ میں نے تیزی سے لحاف پر سے پھینک دیا۔ کوٹ پنا۔ نیکل وہیں پھوڑا اور جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ سردی بہت شدید تھی۔ باہر سننا مچا یا ہوا تھا۔ حویلی کی طرف سے آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں لیکن خطرے کی بوتیز ہو گئی تھی۔ ضرور کوئی طوفان آنے والا تھا۔ میں نے ایک دم وہاں سے ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے احساس ہوا کہ میں کہیں غلط سمت تو نہیں بھاگ رہا؟ پھر کیا کروں؟ مجھے اپنے پیچھے لوگوں کی اونچی اونچی آوازیں سنائی دی۔ قریب ہی شیشم کا ایک گنجان درخت تھا۔ میں اس پر چڑھ گیا اور دور جا کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے لوگوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ کوئی دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ بھاگ کر نہیں جاسکتا۔ کہاں جائے گا؟ ہم اُسے گرفتار کر کے رہیں گے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ پولیس کے سپاہی تھے۔ وہ میرے درخت کے نیچے سے باتیں کرتے مجھے تلاش کرتے آگے لگ گئے۔ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اب خدا کی رحمت ہی مجھے دشمن کے جنگل سے بچا سکتی تھی۔ میرے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ اس سرزمین پر سوائے اس درخت کے

مجھے اپنی طرف آنا دیکھ کر وہ گردن گھا کر میری طرف تکتے لگے۔ میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا ایک سکھ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ میں نے کہا کہ میں فوجا سنگھ ذیل دار سے ملنے آیا ہوں۔ اس سکھ نے بتایا کہ فوجا سنگھ وہی ہے۔ میں نے جیب سے خط نکال کر اُسے دے دیا۔ سردار نے خط پڑھ کر پہلے سکھوں کو طرح مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔

”بیٹھ جاؤ بھائی صاحب! تو آپ ڈھاکے سے آئے ہیں؟“

یہ بات اس نے صاف آوازیں دوسرے سکھ کے سامنے بے دھڑک کہہ دی۔ کانپ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ اپنا ہی آدمی ہے۔“

پھر اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے بارڈر کراس کرا دے گا۔ مگر آج نہیں بلکہ کل۔ آج رات وہ مجھے اپنا ہیمان بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ سچی بات ہے میں اُس سے کچھ گھبرا گیا تھا میرا دل وہاں ٹھہرنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے فضا میں خطرے کی بومحسوس ہو رہی تھی۔ مگر انکار کی جرأت نہ تھی۔ انکار کر کے میں جاتا بھی کہاں۔ میں نے تو اپنے پتے اُن کے حوالے کر دیئے تھے انہیں صاف صاف پتا چل گیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ مسلمان ہوں اور ڈھاکہ سے آ رہا ہوں۔ میں ایک طرح سے اُن کے قبضے میں تھا۔ بس دل میں ایک ہلکا سا خیال تھا، ایک ٹمٹماتی ہوئی اُمید تھی کہ یہ لوگ مجھے بارڈر کراس کرا دیں گے۔

میں نے رات بھر کے لئے وہاں ٹھہرنے کی ہامی بھری۔ رات کو انہوں نے مجھے وال پراٹھے کھلائے۔ ایک کوٹھڑی میں چار پائی ڈال کر لیٹر لحاف لگا دیا۔ سردی بہت تھی۔ میں لحاف میں دبک کر سوچنے لگا کہ صبح کب ہوگی؟ یہ لوگ کب مجھے پاکستان کی سرحد پر داخل کرائیں گے؟ اتنا مجھے معلوم تھا کہ پاکستان کا بارڈر یہاں سے تھوڑی ہی دُور ہے یہاں شمال مغرب کی طرف دریائے راوی بہتا ہے یہی وہ دریا ہے جو آگے جا کر لاہور میں داخل ہو جاتا ہے۔ شاید یہ لوگ بھی مجھے دریا کے ذریعے دریا پار کرانا چاہتے تھے مجھے کیا خبر تھی کہ انہوں نے خفیہ طور پر مجھے گرفتار کروانے کی سکیم تیار کر رکھی ہے اور پولیس

رات اندھیری تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چاندنی نہیں تھی وگرنہ میں کھیتوں میں چلتا ہوا دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔ میں کہتے ہی کھیتوں میں سے گزر گیا۔ اب کچھ ایسے کھیت شروع ہو گئے جہاں شاید سبزیاں اُگی تھیں۔ میرا پا جامہ پنڈلیوں تک شبنم سے بھر گیا تھا۔ لیکن مجھے ایک پل کے لئے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تیز تیز چلنے سے میرا خون گرم ہو گیا تھا۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو سرکنڈوں کی جھاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُونچے اُونچے سرکنڈے جگہ جگہ اُگے ہوئے تھے۔ میں اندازے سے ہی اُگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں بارڈر کی طرف جا رہا ہوں یا مورچے کی طرف چلا جا رہا ہوں۔

سردیوں کا آسمان تاروں سے بھرا چمک رہا تھا۔ یہی آسمان لاہور..... میرے وطن میں بھی ستاروں کو لے کر چمک رہا ہو گا۔ میرے بیوی بچے سو رہے ہوں گے۔ اُنہیں کیا معلوم کہ اس وقت میں زندگی اور موت کی کش مکش میں آگ کا دریا عبور کر رہا ہوں۔ سرکنڈوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے گھوڑوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے سرکنڈوں کے اندر گھس کر چھپ گیا۔ گھوڑوں کی ٹاپ قریب آتی گئی۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ یہ سکتھ تھے جنہوں نے بارڈر پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔ گلے میں ٹین گنیں لٹک رہی تھیں۔ وہ آپس میں کسی ایسے شخص کے بارے میں بات کر رہے تھے جس کے بارے میں انہیں خبر ملی ہو کہ وہ خطرناک جاسوس ہے اور بھاگ رہا ہے۔

ظاہر ہے یہ سوائے میرے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ سکھ بارڈر پولیس والے اچانک رک گئے۔ ایک بلند آواز سے کہا۔

”اُونے اودہ بھاگ کر بارڈر کراس نہیں کر سکتا۔“

”اُگے تو جگہ جگہ بارودی سرنگیں بھی ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”مر جائے گا اِنے آپ ہی.....“

ایک نے کہا ”کہیں وہ ان سرکنڈوں میں تو نہیں چھپا ہوا؟“

اس جملے کے ساتھ ہی میں مٹن ہو کر رہ گیا ہے۔ اب مجھے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ موت میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ میں نے ایک دم سے اپنا سانس روک لیا۔ ایک سپاہی سرکنڈوں کی جھاریوں کی طرف بڑھا۔ دوسرے نے وہیں سے آواز دی۔

میرا کوئی اور دوست نہ تھا۔ اس درخت نے مجھے وقتی طور پر پناہ دے رکھی تھی۔ راز کے اندھیرے میں میں کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن دن کا اُجالا پھیلنے ہی لوگ ضرور مجھے دیکھ لیں گے اس خیال سے میرا خون خشک ہو گیا۔ بھارتی پولیس کے عقوبت پھانسی کا پھندا اور اذیت ناک موت میری آنکھوں کے اُگے گھوم گئی۔ میری بیوی بچوں کی شکلیں کہیں دُور..... بہت دُور جا کر خلاؤں میں کھو گئیں۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد پھر وہی آوازیں سنائی دیں۔ سپاہی واپس آ رہے تھے۔ میرا درخت کے قریب سے گزرے تو مجھے ان کے جملے صاف سنائی دیئے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

”ضروریہ کوئی بہت خطرناک جاسوس ہے اور ہماری حکومت کے راز لے کر واپس پاکستان جا رہا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”وہ بچ کر نہیں جاسکتا سردار جی! ہم نے بارڈر پولیس کو خبردار کر رہے۔ اگر وہ اس طرف گیا ہے تو ضرور پکڑا جائے گا۔ کیونکہ وہاں بارڈر پولیس گشت رہی ہے۔“

وہ لوگ واپس حویلی کی طرف چلے گئے۔ ان کی باتوں سے مجھے اس بات کا ضرور علم گیا کہ بارڈر اسی طرف ہے جہاں میں بھاگا تھا اور یہ کہ بارڈر زیادہ دُور نہیں ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے ہمت اور دلیری سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ ہمت با اور گھبرانے سے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا تھا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ مجھے کیا چاہیے۔ دل نے کہا کہ ابھی رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل چلو۔ دن نکل آیا تو تمہ پکڑا جانا ایک قدرتی بات ہے۔ کیونکہ صبح کو ساری پولیس تمہاری تلاش میں ادھر آ جا گی۔ میں خدا کا نام لے کر درخت پر سے نیچے اُتر آیا اور اندازہ لگا کر بارڈر کی طرف چل شروع کر دیا۔

یہاں اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ کماد کے اُونچے اُونچے کھیت تھے۔ تیز قدم اٹھاتا کھیتوں کے ساتھ ساتھ بگڑنڈی پر چلتا چلا گیا۔ ایک جگہ کھیتوں میں مجھے اُچارپائی نظر آئی جس پر کوئی شخص لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ میں اس سے دور ہٹ کر گزر

ہے میں دریائے کنارے پہنچ جاؤں تو اس میں سے ہو کر میں پاکستان کے علاقے میں داخل ہو
لیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دریا پانی سے لبالب بھرا ہوا ہوگا اور میں اس میں تیر کر آگے نکل
جاؤں گا یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ سردیوں کے موسم میں دریا خشک ہو جاتا ہے۔ اور
شک دریا کا مطلب یہ تھا کہ وہاں بھی بھارت کی سیکورٹی فورس کے سپاہی گشت کر
رہے ہوں گے۔ میں چلتا چلا گیا۔ اب مشرق میں دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میرے ارد گرد
ہاڑیاں، سرکنڈے اور دُور دُور تک بے آباد زمین نظر آنے لگی تھی۔ میں پھونک پھونک کر
دم اٹھا رہا تھا۔ مجھے ہر قدم پر گمان ہوتا کہ کہیں میرا پاؤں کسی بارودی سرنگ پر نہ پڑ
ائے۔ پھر ایک دھماکہ ہوتا اور میرے جسم کے پرچے اڑ جاتے۔ مشرق سے سورج نکل آیا۔
اردن طرف اس کی روشنی پھیل گئی۔ میں محتاط ہو گیا۔ میں جھک کر سرکنڈوں کے پیچھے سے
ڈر چلنے لگا۔ میں تھک بھی گیا تھا اور مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں دریا کی جستجو میں تھا۔ اچانک بھیانک دھماکہ ہوا
مازمین پر گر پڑا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے میرا پیر کسی بارودی سرنگ پر آ گیا ہے اور میرے
م کے کٹے ہوئے ہوا میں اڑ گئے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں صحیح و سالم زمین پر پڑا تھا۔
کسی جگہ ہوا تھا۔ اب گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے لیٹے لیٹے سرکنڈوں کے
بچے سے سراٹھا کر دیکھا۔ دُور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں ایک جگہ سے دھواں اور گرد
رہی تھی۔ یہاں کوئی بارودی سرنگ پھٹی تھی۔ ظاہر ہے اس پر کسی کا پاؤں آ گیا ہوگا۔ یہ
رائے کسی سمگلر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ بارڈر فورس کے سپاہی کبھی اس علاقے
نہیں جاتے جہاں بارودی سرنگیں دبائی گئی ہوں۔ اگر جانا بھی پڑے تو انہیں معلوم
ناک محفوظ راستہ کون سا ہے۔

فائرنگ کی آواز میرے اور قریب آرہی تھی۔ میں نے سرکنڈوں میں چھلانگ لگا دی
دم سادھے لاش کی طرح لیٹ گیا۔ گھوڑے دوڑتے ہوئے میرے قریب سے گذر
ئے کسی نے اونچی آواز میں پنجابی زبان میں کہا کہ اس کے ساتھی کو بکڑ لو۔ وہ بھاگنے
لگے اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سمگلر مر گیا تھا اور اس کا ساتھی بھاگ نکلا تھا۔

”اوئے یہاں کہاں آجائے گا وہ ماں کا یار۔۔۔۔۔
چل اگے چلئے۔ ابھی کتنی گشت باقی ہے۔“

جن سرکنڈوں میں میں چھپا ہوا تھا اس کے قریب آیا ہوا بارڈر پولیس کا سیکھ والپس چلا
گیا موت میرے قریب۔۔۔۔۔ بالکل قریب آ کر والپس چلی گئی۔ میں دم سادھے سرکنڈوں میں
سرکنڈا بنا کر بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دونوں سیکھ
گھوڑوں کو آگے بڑھا چکے تھے۔ میں نے یوں اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے پانی کے اندر لمبی ڈبو
مارنے کے بعد باہر نکلا ہوں۔ میں دیر تک انہی جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا رہا۔ جب گھوڑوں
کی ٹاپوں کی آواز کافی دور چلی گئی تو میں سرکنڈوں میں سے باہر نکل آیا۔ میں کچھ دیر وہاں
چپ چاپ کھڑا رہا۔ بارڈر پولیس کے سیکھ سپاہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ آگے بارودی سرنگ
کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آگے جانا موت کو آواز دینے کے برابر تھا۔
پھر کیا کروں؟ والپس جانا بھی موت کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے برابر تھا۔

مجھے آگے جانا تھا۔ آگے بارودی سرنگیں تھیں۔ لیکن اس کے بعد میرا پیارا وطن تھا۔ پاک
تھا۔ لاہور تھا۔ میری بیوی اور بچوں کے چہرے تھے جو مجھے ملنے کو بیتاب تھے۔ مجھے بارود
سرنگوں میں سے بچ کر نکالنا تھا۔ مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اللہ کا نام
اور آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ سامنے چلنے کی بجائے دائیں جانب کو ہو کر سرنگ
عبور کرنے لگا۔ اب رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ آسمان پر مشرق کی طرف نیلی نیلی روشنی
پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں سورج کا اجالا پھیلنے والا تھا۔ دن کی روشنی میرے
لئے انتہائی ہلاکت کا باعث بن سکتی تھی۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے پہلے بارڈر کر اس کرنا تھا۔
نے پاگلوں کی طرح فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے بارودی سرنگوں میں گھر کر مر جاؤں لیکن بھارت
سیکورٹی فورس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ خدا میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھ پر ضرور اپنا کرم کرے
گا۔ وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا۔ اس نے جگہ جگہ مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے۔ وہ
یہاں سے بھی مجھے بچا کر نکال لے جائے گا۔

مجھے دریائے راوی کی تلاش تھی۔ یہی دریا میری نجات کا وسیلہ تھا۔ اگر کسی طرف

باقی کا ہوا ہے۔ پھر اس نے میرے کان میں کہا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں بھی بارڈر کراس کر رہا ہوں۔ خبردار! ذرا بھی ادھر اُدھر نہ ہونا۔ میرا ساتھی نیا نیا مملک بنا تھا۔ یہ اس کا پہلا پیرا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ خطرناک علاقے میں نکل گیا۔“

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”کیا ہم ابھی تک بھارت کے علاقے میں ہیں۔“

”ہاں! یہ سارا علاقہ بھارت کا علاقہ ہے۔ اس کے آگے بارودی ٹرنگس بھی ہیں۔ پیچھے بھارتی فوجوں کے مورچے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم فوجوں کے مورچوں سے بچ کر یہاں تک کیسے آگئے۔ بہر حال تم خوش قسمت ہو۔ اب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“

وہ زین پر جھاڑیوں میں ریٹکنے لگا۔ میں بھی ریٹکنے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔ کوئی بن ایک فرلانگ جھاڑیوں میں ریٹکنے کے بعد اس نے ہاتھ سے مجھے رُک جانے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ ایک درخت کے پیچھے ہو گیا۔ میں نے بھی درخت کی آڑ لے لی۔ تھوڑی دیر بعد بھارتی پولیس کا ایک دستہ ہمارے سامنے سے گھوڑوں پر سوار تیزی سے گزر گیا۔ بب دستہ دوڑ چلا گیا تو میرے ساتھی نے آہستہ سے کہا۔

”ضروریہ لوگ تمہاری تلاش میں ہیں۔ وگرنہ یہاں کبھی بھارتی پولیس کا دستہ نہیں دیکھا گیا۔ ہمیں یہاں کسی محفوظ جگہ چھپ کر رات ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ ہم دن کی روشنی میں اب بارڈر کراس نہیں کر سکتے۔ یہاں بارڈر فورس کے علاوہ پولیس کے دستے بھی گشت کر رہے ہیں۔“

ہم ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں جا کر چھپ گئے۔ بھوک اور پیاس سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میرے ساتھی نے جیب میں سے خشک روٹی کا ٹکڑا نکال کر مجھے دے دیا۔ میں نے کھا لیا۔ روٹی کھانے کے بعد پیاس کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن وہاں پانی نہیں تھا۔ اس نے کہا:

میں دیر تک سرکنڈوں میں اپنے آپ کو چھپائے پڑا رہا۔ سورج اب میرے سر کے اوپر آگیا تھا۔ جب کافی دیر ہو گئی اور فائرنگ کی آواز بھی رُک گئی تو میں خدا کا نام لے کر سرکنڈوں میں سے باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ بنجر علاقہ بھی نہیں تھا۔ بنجر علاقہ دور تک دیران تھا اور چھوٹی جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے چھپ چھپ کر ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں گھبرا گیا تھا اور مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ اب میں اس قدر پریشان تھا کہ اپنی زندگی سے ناامید ہو گیا تھا۔ اور اس بات کے لئے بھی تیار تھا کہ دشمن کے سپاہی مجھے گرفتار کر لیں۔

چانک مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک خستہ حال دیہاتی کھڑا میری طرف حیرت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ایک پل کے لئے ہم دونوں بُت بن کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ایک بات سے ہم دونوں کو تسلی ہوئی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی سکھ نہیں تھا اور نہ ہی بارڈر پولیس کا آدمی تھا۔ میں نے اشارے سے اس دیہاتی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ جھکتا ہوا میرے پاس آگیا اور اس نے اشارے سے مجھے جھک جانے کو کہا۔ ہم دونوں ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئے۔ اس نے منہ میرے کان کے قریب لاکر سرگوشی میں پوچھا۔

”تم کون سا مال لے کر بارڈر کراس کر رہے تھے؟ میرا تو ساتھی مارا گیا ہے۔“

وہ مجھے مملک سمجھ کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں مال لے کر نہیں جا رہا۔ بلکہ ویسے ہی پاکستان جا رہا ہوں۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے اُسے بتایا کہ میں ڈھاکہ سے فراہم کر کے یہاں تک آیا ہوں اور اب بارڈر کراس کرنا چاہتا ہوں یہ معلوم ہونے پر کہ میں مسلمان ہوں اور ڈھاکہ سے معصیتیں مہتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ وہ بڑا متاثر ہوا۔ وہ بھی مسلمان تھا لیکن مملک تھا اور سکھ مملکروں سے مل کر اپنے ساتھی کے ہمراہ مملکنگ کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں بڑے غلط راستے پر جا رہا تھا۔ اگر ایک فرلانگ اُدھے نکل جاتا تو کسی نہ کسی بارودی ٹرنگ سے مملک کر میرا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کے

ہیں سے گیلی تھی۔ کچھ دور تک ہم دریا کے کنارے کنارے نیچے کی طرف جھاڑیوں میں ہو کر چلتے رہے۔ کافی دور اوپر جا کر اس نے آہستہ سے کہا۔

”اب ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ آخری مرحلہ ہے۔ یہاں سامنے دشمن کی فوجوں کے مورچے ہیں۔ اب ہمیں زمین پر رینگ کر دریا پار کرنا ہوگا۔ یہاں بھی بارودی سرننگیں بھی ہیں۔ لیکن میں تمہیں اندازے سے اس رات سے لے جاؤں گا جو بارودی سرننگوں سے خالی ہے۔ بس تم خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔“ میں نے سرگوشی میں پوچھا کہ آیا کوئی راستہ ایسا نہیں ہے جہاں بارودی سرننگیں نہ بھی ہوں۔ اصل میں مجھے اس شخص کی قیادت پر بھروسہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے ابھی ابھی وہ اپنے ایک ساتھی کو موت کے گھاٹ اتروا چکا تھا۔ اُس نے کہا

”ایک راستہ ہے جو جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ مورچوں کے نیچے سے ہو کر جاتا ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ تمہیں آنا ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میں جا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے دریا کے پاٹ میں ریت پر رینگنا شروع کر دیا۔ جانے وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے آگے جانے سے روک رہی تھی۔ میں نہ گیا۔ وہیں دریا کنارے جھاڑیوں میں لیٹا رہا۔ میرے سامنے وہ سمگلر دیہاتی دریا کی ریت پر اتر گیا۔ کچھ دور تک میں اندھیرے میں اسے کچھوے کی طرح رینگتا دیکھتا رہا۔ پھر وہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اب میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا مجھے دائیں جانب دشمن کے اوپن مورچوں کے نیچے اُگی ہوئی جھاڑیوں میں سے ہو کر دریا پار کرنا چاہیئے یا مجھے بھی خدا کا نام لے کر دریا میں اتر جانا چاہیئے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ زمین ہل گئی۔ میں زمین کے ساتھ چپٹ گیا۔ بارودی سرننگ پھٹ گئی تھی اور وہ ہر جگہ سے اڑ گیا تھا۔ اس وقت خوف سے میرے ہاتھ پر ٹھنڈے ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود بھک سے اڑ گیا ہوں۔ دھماکے کے ساتھ ہی مورچوں میں سے دھڑا دھڑا فائر آنے لگا۔ اس فائر کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے اُن سارے

دشمن پانی کے لئے اندھیرا ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا یہاں سے دریا دو میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم اندھیرا ہوتے ہی دریا کی طرف چل پڑیں گے۔ دریا سوکھا ہوا ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں پانی جمع ہے۔ تم اس سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہو۔“ خدا خدا کر کے دوپہر چلی۔ شام ہوئی اور پھر چاروں طرف رات کے سائے پھیل گئے۔ جھاڑیوں میں جھینگر بولنے لگے۔ میرے ساتھی نے آہستہ سے کہا

”چلو اب کوچ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ میرے پیچھے پیچھے جھک کر چلتے ہوئے چلے آؤ۔ خبردار کمزرا سی دیر کے لئے بھی سیدھی نہ کرنا۔ نہیں تو کسی نہ کسی طرف سے گولی اگر تمہیں ٹھنڈا کر دے گی۔ میں کئی بار یہاں سے بارڈر کراس کر چکا ہوں۔“ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور اس کے پیچھے پیچھے جھک جھکا چل پڑا۔ کوئی میل بھر چلنے کے بعد میں تھک گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں تھک گیا ہوں اور اب مجھ سے نہیں چلا جاتا وہ ٹرک گیا۔ اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کمزور سیدھی کی توپوں لگا جیسے وہ اڑ گئی ہو۔ کوئی آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم پھر آگے چل پڑے۔ میں نے چلتے چلتے اُس سے پوچھا۔

”ابھی ہمیں کتنی دور اور اسی طرح چلنا ہوگا؟“

اس نے کہا۔ ”بس دریا تھوڑی دور رہ گیا ہے۔“

آخر خدا نے میری بھی سُن لی۔ دریا کا کنارہ آگیا۔ یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ پانی کہیں بھی نہیں تھا۔ ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں دریا کی ریت دُور تک نظر آ رہی تھی۔ بیچ میں ایک جگہ پانی دکھائی دے رہا تھا۔ پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے میرے ساتھی نے کہا۔

”خدا کے لئے بے صبر سے مت ہو جانا۔ صبر سے کام لینا۔ اب لب بام دو

ہاتھ رہ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ منزل پر پہنچتے پہنچتے دشمن کی گولی کا ٹکڑا ہو جاؤ۔“

وہ مجھے ساتھ لے کر دریا کی ریت پر اتر گیا۔ دریا کی ریت کہیں سے خشک اور

کوئی دم میں صبح ہونے والی ہو۔ پھر اچانک ساری فضا روشن ہو گئی۔ جیسے دن چڑھ آیا ہو۔ میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ بھارتی فوج نے یہ روشنی کاراکٹ چھوڑا تھا۔ تیز روشنی کے لبدوں میں ایک بار پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں اسی طرح بے حس و حرکت ریت کے گڑھے میں بیٹا رہا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ میں اٹھ کر بھارتی مورچوں کے نیچے سے رینگ کر گذرتا۔ میں لیٹے لیٹے خدا کو یاد کر کے دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ اس مصیبت سے نکل جاؤں اور اپنے پیارے وطن پاکستان کی زمین پر پہنچ جاؤں۔ ان دوراتوں میں، میں نے بڑی بھیانگ ذہنی اذیت اٹھائی تھی۔ شاید میرے سر کے کچھ بال بھی سفید ہو گئے تھے۔ ایک بار پھر چاروں طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی طرف سے بھی لنگروں کے بولنے کی بھی آواز سنانی نہیں دے رہی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ وقت میرے لئے بے حد قیمتی تھا۔ اب میں اس مقام پر آ گیا تھا کہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی موت تھی۔ آگے صرف اتنی امید تھی کہ شاید میں بھاگ کر کسی نہ کسی طرح بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جاؤں۔ پیچھے تو میرے بچے کی کوئی امید نہیں تھی۔ میں نے دل میں ایک دم سے فیصلہ کیا کہ مجھے اب اللہ کا نام لے کر اپنی منزل کی طرف چل پڑنا چاہیے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ اب تو سچ مشرق کی طرف ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ یہ بہت بڑا خطرے کا نشان تھا۔ اگر دن چڑھ آیا تو میں ضرور پکڑا جاؤں گا اور پھر باقی ساری عمر بھارتی عقوبت خانوں میں زنجیروں میں جکڑا اسسک اسسک کر دم توڑ دوں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ یہاں سے نکل جانے کی کوشش کروں۔

میں نے آہستہ سے رینگنا شروع کر دیا۔ میں گڑھے سے باہر نکل آیا۔ اپنی سمت کا تعین میں کر چکا ہوں۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کنارے کی ریت پر سے لیکڑے کی طرح میں دریا میں اتر گیا۔ خشک ریت پر آتے ہی میں نے اس سمت کنارے کے ساتھ رینگنا شروع کیا جدھر بھارتی فوج کے مورچے تھے۔ یہ مورچے اُنچے میلے پر ساتھ ساتھ نیم دائرے کی شکل میں چلے گئے تھے۔ اُس کے نیچے سرکنڈوں کی جھاڑیاں آگی تھیں۔ میں نے ان جھاڑیوں کی طرف

مورچوں کو دیکھ لیا جو دریا کے پاٹ میں ریت کے اُونچے ٹیلوں کے ساتھ ساتھ چلے گئے تھے۔ کیونکہ آگ کے شزارے ایک ساتھ قطار کی شکل میں بلند ہو رہے تھے۔

قریب ہی ریت کا ایک گڑھا سا بن گیا تھا۔ میں نے اس میں پھلانگ لگادی۔ کیونکہ ایک بار پھر میری طرف گھوڑے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ بھارت کی بارڈر فورس کے سپاہی گھوڑے دوڑاتے گذر گئے۔ وہ زور زور سے باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ بارڈر پر منگروں کی بارڈر پولیس سے آنکھ چوٹی جاری رہتی ہے۔ منگلم بھی جاتے ہیں اور نکل بھی جاتے ہیں۔ میں چونکہ گڑھے میں چھپا ہوا تھا اور پھر رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس لئے مجھ پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ بارڈر پولیس اس لئے بھی مطمئن تھی کہ مفرد منگلم بارڈر کراس کرتا ہوا مارا جا چکا تھا۔ ان کے خیال میں ہی ایک منگلم تھا جو باقی بچا تھا یہ لوگ گھوڑوں پر سوار واپس آئے اور میرے قریب سے گذر کر آگے نکل گئے۔

ایک بار پھر وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ دشمن کی فائرنگ بھی رک گئی۔ اس گڑھے میں اتفاق سے تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ میں نے بڑی بے صبری سے پانی پیا۔ ٹھنڈے پانی نے میرے حواس کی حد تک کچا کر دیئے۔ پانی صاف نہیں تھا۔ لیکن ریت نے اُسے کافی حد تک صاف کر دیا تھا۔ میں گڑھے میں بیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ اگر مجھے بارڈر کراس کرنا ہے تو میں دریا میں اترنے کا خطرہ ہرگز ہرگز مول نہیں لے سکتا۔ مجھے بھارتی فوج کے اُونچے مورچوں کے نیچے سے ہو کر نکلنا ہو گا۔ یہ بھی بڑی خطرناک بات تھی۔ لیکن اگر میں زمین پر رینگ کر جھاڑیوں کے گھاس میں سے ہو کر نکلنے کی کوشش کروں گا تو کامیاب ہو سکتا تھا۔ کم از کم ایک بات طے تھی کہ وہاں بارودی سرنگیں نہیں بچھی تھی۔ میرے پاس صرف آج کی رات باقی تھی۔



اور رات بڑی تیزی سے گذرتی چلی جا رہی تھی۔

آسمان پر ایک بار پھر ستاروں نے جھلانا شروع کر دیا تھا۔ شاید یہ میرا دم تھا کہ مشرق کی طرف آسمان پر مجھے خواہ مخواہ صبح کی روشنی جھلکتی محسوس ہونے لگی تھی۔ جیسے ابھی

مے ہاتھوں گرفتار ہو جانے پر بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس بھاگ دوڑ اور مشکل کی پریشانی سے نجات ملی۔

پھر کسی نے مجھ پر جھک کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ اٹھو! ہمارے ساتھ چلو۔“ میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا جسم چور چور تھا۔ نہ اٹھنے کی ہمت تھی۔ نہ بولنے کی طاقت تھی۔ مجھے دھندلے دھندلے کچھ چہرے نظر آئے۔ یہ فوجی تھے۔ دو آدمیوں نے مجھے اٹھایا اور ڈولی ڈنڈا کر کے ایک طرف کو لے چلے۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میں پاک فوج کی قید میں ہوں۔ میں اسی وقت سجدے میں گر پڑا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دو فوجی جوان میرے پاس آگئے میں نے انہیں اپنی ساری کہانی سنائی۔ انہوں نے مجھے بارڈر پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہاں جب میں نے اپنے پاکستانی ہونے اور ڈھاکہ میں بزنس کرنے کا بین ثبوت ہم پہنچا دیا تو مجھے رہا کر دیا گیا۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ بیوی بچوں سے میری پہلی ملاقات کا منظر کیسا پُر مسرت اور امل انگیز تھا۔ ہم خوش بھی تھے اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری تھے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ڈھاکہ کے سب سے چل کر یہاں تک آیا ہوں۔ لیکن یہ ایک بڑی ہی دردناک حقیقت تھی۔ آج اس بات کو چھ برس گزر گئے ہیں۔ لیکن ان دنوں کا آج بھی خیال آتا ہے تو میں خود بھی حیران ہو جاتا ہوں کہ میں کس قدر خطرات کا سامنا کرتا ہوں اپنے پیارے وطن پاکستان واپس پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میں اپنے وطن میں بیوی بچوں کے ساتھ پُر سکون زندگی بسر کر رہا ہوں۔

بڑھنا شروع کر دیا۔ کوئی آدھے گھنٹے میں میں ان مورچوں کے بالکل نیچے پہنچ گیا۔ میں بالکل ہوا کی چال چل رہا تھا۔ مجھے مورچوں میں بیٹھے بھارتی فوجیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ایک پل کے لئے رک گیا۔ اس کے بعد پھر آگے ریٹکے لگا۔ آہستہ آہستہ ریٹکے ریٹکے میں چھ سات مورچوں کے نیچے سے گذر گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن چونکہ یہ خطرے کے بیچ میں پہنچ چکا تھا اس لئے اب پھٹانے یا واپس مڑنے کا سوال ہی نہیں تھا آخر میں نے وہ نیم دائرہ عبور کر لیا جس پر بھارتی فوج کے مورچے تھے۔ مجھے تارور کی مدد روشنی میں دریا کا دوسرا کنارہ نظر آنے لگا۔ یہاں پانی کھڑا تھا۔ میں خدا کا نام لے کر پانی میں اتر گیا اور بیٹھ کر چلنے لگا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ سردی سے میرے دانت جھنجھنے لگے۔ میں کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میں جھاڑیوں کا سہارا لے کر اوپر کنارے پر آگیا۔ کنارے پر آتے ہی میں زمین پر بیٹھ گیا کیونکہ ایک دم سے فضا پھر روشن ہو گئی تھی۔ شاید بھارتی فوجیوں کو شک پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دن چڑھ آیا اور مورچوں میں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے گولیوں کی سرخ کیریں اپنے اوپر سے گذرتی دیکھیں۔ موت میرے سر کے صرف ایک فٹ اوپر سے گذر رہی تھی۔ میں وہیں زمین پر لیٹا رہا۔ فائرنگ ذرا تھی تو میں نے اٹھ کر بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ایک گڑھے میں گر پڑا۔ روشنی کا گولہ ایک بار پھر چڑھا۔ سارا علاقہ روشن ہو گیا۔ فائرنگ پھر سے شروع ہو گئی۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور تیزی سے آگے کی طرف ریٹکے لگا۔ فائرنگ ذرا لڑکی تو پھر اٹھ کر بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔

سامنے ایک خشک نالہ آگیا۔ میں نے اس میں چھلانگ لگا دی۔ دوسرے کنارے پر چڑھ کر تیز تیز دوڑنے لگا۔ دوڑتا چلا گیا۔ دوڑتا چلا گیا۔ جیسے سارا بھارت، بھارت کے سارے لوگ میرے پیچھے دوڑ رہے ہوں۔ دوڑتے دوڑتے میں جب گرا تو کسی نے لٹکار کر مجھے ہینڈ زاپ کرایا۔ اب مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ دشمن آخر میرے سر پہنچ گیا۔ آخر اس نے مجھے گرفتار کر ہی لیا۔ چلو۔ اگر قسمت میں یہی لکھا تھا تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ میں اس قدر تھکن اور اذیت سے چور ہو گیا تھا کہ میں نے دشمن

چاند جنگل اور لڑکی

اس کتاب کی کہانی

آج سے پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ملک ملک، جنگل جنگل، دریا دریا گھومتا پھرتا دریا کے کنارے ایک قدیم برہمن قبیلے کے قبوہ خانے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ صبح سے برسات کی بھری گئی تھی۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی بارش تھی جو کئی کئی روز تک جاری رہتی ہے۔ میں جس قبوہ خانے میں بیٹھا تھا اور تیز چائے پی رہا تھا وہ بانس کا بنا ہوا تھا اور اس کے دروازے کے بانس پر کیسری پھولوں والی پیل چڑھی ہوئی تھی۔ میرے پاس میرا برہمن دوست بیٹھا میرے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ یہ شام کا وقت تھا، باہر اندھیرا ہو رہا تھا۔ دریا کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آرہے تھے ان جھونکوں میں دریا کے کنارے اگے گھاس کی بو تھی۔ میرے برہمن دوست نے مجھے بتایا کہ یہاں سے تھوڑی دور جنگل میں کئی ہزار سال پرانے راجہ کا محل ہے۔ جو اب کھنڈر بن چکا ہے۔ اس محل میں ایک مندر ہے، وہ بھی کھنڈر بن چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ سنگ دل راجہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر اپنی سب سے بڑھ کر خوب صورت اور نوجوان رانی کو اس مندر میں قتل کروا کر آگ میں پھینکوا دیا تھا۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“ اس قسم کے قتل تو شاہی محلات میں ہوتے ہی آئے ہیں۔“ اس نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ ”کہتے ہیں جس روز رات اندھیری ہوا اور بارش بھی ہو رہی ہو تو اس مندر سے کسی لڑکے کے رونے، سسکیاں بھرنے اور کسی وقت بین کرنے کی درد انگیز آوازیں آتی ہیں۔“

○ اندھیری رات، بارش اور ویرانے محلے کے کھنڈر میں سے ایک سے دردناک آواز بلند ہوئی۔ جیسے کوئی بھٹکتے ہوئے رُوح بینے کر رہی ہو۔

○ بحری کپتان کے بھٹکتے ہوئے رُوح اور ایک حسینے تریزے امریکے لڑکے کے لازوالے داستانِ محبت۔

اے حمید

جس انسان کو انہوں نے کھانا ہوتا ہے۔ اس کا پورا نام لے کر پیچھے سے آواز دیتی ہیں ہو سکتا ہے یہ میرا دم ہو۔ لیکن مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اپنا پورا نام سنا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اچانک کسی عورت کے رونے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز بارش کی آواز کے ساتھ مل گئی۔ میرے پیر پتھر گئے پیچھے سے ہلانہ جاتا تھا۔ اب بین کی آوازوں کے ساتھ ساتھ سسکیاں بھرنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں وہاں سے نہ بھاگا تو ایک پل کے اندر اندر دھڑام سے گروں گا اور مر جاؤں گا۔ میں نے پورا زور لگا کر جسم کو حرکت دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے دُور تک پیچھے اس قسم کی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی عورت بار بار کہہ رہی ہو۔ ”واپس آ جاؤ میں اکیلی ہوں، واپس آ جاؤ میں اکیلی ہوں۔“

پھر وہاں سے واپس کس طرح پہنچا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس واقعہ کے چھ برس بعد میں ایک لائبریری میں آئرلینڈ کی لوک کہانیاں پڑھ رہا تھا کہ ایک کہانی پڑھتے پڑھتے ٹک گیا۔ اس میں ایک ایسے بحری کپتان کی بھٹی ہوئی روح کے حالات لکھے تھے جو ممدرد کے کنارے ایک پیرانے کھنڈر میں رہتی تھی۔ ایک غیر ملکی عورت وہاں جا کر آباد ہو گئی۔ روح نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا لیکن عورت بھی ہسٹ کی پکی تھی۔ وہ پرانا محل چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ کپتان کی روح کو اس عورت سے پیار ہو گیا، لیکن یہ پیار زیادہ تک نہ چل سکا کیونکہ عورت اس روح سے شادی نہ کر سکتی تھی۔ عورت ایک مرد کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے اس مرد سے شادی کر لی۔ شادی کو چالیس برس گزر گئے اس کا خاندان بڑھ چکا تھا وہ بوڑھی ہو گئی۔ آخر ایک روز وہ بھی اللہ کو پیار سی ہو گئی۔ پھر کپتان کی روح نمودار ہوئی اور اس نے دونوں بازو پھیلا کر بوڑھی عورت کی جوان اور خوب صورت روح کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے لے کر آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر گئی۔ یہ کہانی مجھے بے حد اچھی لگی۔ اس کے بعد میں نے ایک ناول ”گھوسٹ اینڈ منز منیور۔“ پڑھا۔ یہ ناول بھی اسی آئرلش لوک کہانی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ پھر اس کی

میں اپنے برسی دوست کا منہ بکھارہ گیا۔ کیا وہ سچ کہہ رہا تھا یا مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ نوجوان کا زمانہ تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں یہ مندر دیکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ اتفاق سے بارش بھی ہو رہی ہے اور رات بھی اندھیری ہے۔ میرے اس خواہش پر وہ ڈر کر سمٹ گیا۔ اس نے کہا کہ وہ دریا کے ایلاؤتی میں چھلانگ لگا کر خود کشی کرے گا۔ لیکن پرانے آسیب زدہ مندر میں نہیں جائے گا۔ میں نے اسے اسی قہود خانے میں چھوڑا اور اس کی مخالفت کے باوجود اس آسپی مندر کی طرف چل پڑا۔ قہصے سے ایک بس مجھے مل گئی جس نے مجھے راستے میں سڑک پر ایک جگہ اتار دیا۔ یہاں سے اس محل کے کھنڈر دو فرلانگ کے فاصلے پر تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ رات اندھیری تھی۔ کسی وقت بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے برساتی اور ڈر رکھی تھی۔ دل میں جوش تھا کہ مندر میں جا کر رانی کی بھٹی ہوئی روح کی رونے کی آواز تو سنیں۔ آخر میں اس دیران کھنڈر میں پہنچ گیا۔ اس کھنڈر کو بارش والی رات کے آسپی اندھیرے میں دیکھ کر ایک بار تو مجھ کا منہ اٹھا۔ دل نے کہا کہ اگر جان عزیز ہے تو برعومدار سیدھے بھاڑ دیں سے واپس چلے چلو، مگر روح کے بین سننے کا شوق بھی سر پر سوار تھا۔ میں بے دھڑک کھنڈر میں داخل ہو گیا اور چپکے سے ایک شکستہ خراب کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو بالکل امریکی ایکٹر مٹھی بونگارٹ سمجھ رہا تھا جو کسی خفیہ مہم پر گھر سے نکلا ہو۔ میں نے قیص کی جیب سے گیلارنگریٹ نکال کر اسی امریکی ایکٹر کی طرح منگایا اور مندر کے لوٹے ہوئے دروازے کی طرف دیکھنے لگا یا جو میرے بالکل سامنے تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں وہاں تک آ تو گیا تھا، لیکن اب مندر میں جاتے ہوئے میرا دل بھی گھبرا رہا تھا۔ بجلی چمکی، بادل گرجا اور بارش تیز ہونے لگی۔

اب میں کچھ ڈر گیا۔ دل نے کہا کہ بیٹا ابھی یہاں سے واپس ہو چلو، نہیں تو رانی کی بھٹی ہوئی روح تو نہ آئے لیکن یہاں کہیں سے کوئی چمڑیل نکل کر میں ضرور ہار کرے گی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ مندر کی طرف سے مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے میرا نام سے کسے پکارا ہو۔ بچپن میں سُن رکھا تھا کہ چمڑیلین غلام طور پر جان جاتی ہیں اور

ظلم بھی دیکھی۔ حال ہی میں اسی لوک کہانی سے متاثر ہو کر امریکہ میں ایک ٹی وی سیریز بھی فلمائی گئی جسے لاہور ٹیلی ویژن پر ریکھوسٹ اینڈ منسٹرینور، کے نام سے دکھایا بھی جاتا رہا ہے۔ میں نے اس آئرش لوک کہانی کو سامنے رکھ کر اپنی زبان میں پوری داستان بیان کی ہے جس میں سارے واقعات اس کپتان کی روح کے ساتھ ساتھ کاغذ پر ابھرتے چلے آتے ہیں۔ امید ہے قارئین اسے ضرور پسند کریں گے کیونکہ اس قسم کی ایسی کہانیاں ہمارے وطن کی لوک داستانوں میں بھی ہمیں اکثر ملتی ہیں۔

(اے حمید)

گرین ہاؤس ایک عرصے سے ویران پڑا تھا۔

گرین ہاؤس ایک دو منزلہ مکان تھا جس کی ڈھلانی پھتوں کی سرخ سیلیٹیں کئی جگہوں سے اکھڑ چکی تھیں۔ دوسری ادنیٰ پہلی منزل کی لمبوتری کھڑکیوں پر اندر کی جانب جو بھاری پردے گرے تھے، ان رنگ اتر گیا تھا۔ پہلی منزل کی کھڑکیوں کو جنگلی گلاب کی جھاڑیوں نے اس طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ باہر سے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عمارت کا بڑا دروازہ لوہے کا تھا جس پر بھاری تالا پڑا تھا۔ پتھر یا دیوار جنگلی گھاس میں چھپ گئی تھی اور تالا زنگ آلود ہو چکا تھا۔ اس دو منزلہ ویران کوٹھی کے آستانہ ایک سو برس سے ٹھنڈے پڑے تھے۔ پھت پر اوپر کو اٹھے ہوئے دوکوش خاموش تھے اور ان میں سے کبھی دھواں اٹھتا کسی نے نہ دیکھا تھا۔ یہ دو منزلہ کوٹھی چڑھ کے گنجان درختوں میں گھری ہوئی تھی نایداں لئے اس کا نام گرین ہاؤس پڑ گیا تھا، کیونکہ درختوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں یہاں ہر وقت ندیرا چھایا رہتا تھا۔ کوٹھی کے ارد گرد چار دیواری کبھی تھی۔ یہ اونچی دیوار پرانے سیاہ پتھر کی بنی تھی۔ ن پر جگہ جگہ سے گھاس باہر بھانک رہی تھی۔

جنوبی انگلستان کے ساحلی علاقے میں دو منزلہ کوٹھی سمندر کے کنارے بھورے رنگ کی چٹانوں کے ساتھ گنجان درختوں میں ایک سو سال سے خاموش کھڑی تھی۔ سامنے ایک پھوٹی سی سڑک گذرتی تھی جو گاؤں کو بڑے قصبے سے ملاتی تھی۔ گاؤں کے لوگ اس دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس کی طرف آتے ہوئے ٹھہرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ گرین ہاؤس میں کسی بحری جہاز کے کپتان کا بھوت رہتا تھا اور وہ اس شخص کو ہلاک کر دیتا ہے جو گرین ہاؤس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بھوت عمل کے

میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ کوٹھی میں سمندری کپتان کی روح رہتی ہے۔

گاؤں کے لوگوں کو معلوم تھا کہ کوٹھی میں بڑا قیمتی سامان بڑا ہے۔ لیکن کسی کو اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ مگر جیسا کہ ہم بیان کر رہے تھے آج سے پچاس برس پہلے گاؤں کے ایک نوجوان نے ہمت سے کام لے کر گرین ہاؤس کے اندر چھلانگ لگا دی۔ وہ ڈرائینگ روم میں کارنس کے سامنے کھڑا تھا اور کوٹھی کے پرانے مالک سمندر ہی کپتان کی دیوار پر لگی ہوئی تصویر دیکھ رہا تھا۔ ویسے تو وہ نوجوان بڑا بہادر تھا پھر بھی بھوت محل کی پراسرار خاموشی اور چھپی فضا نے اس پر اثر کرنا شروع کر دیا۔ لیکن گھڑی کا سونے کا خول دیکھ کر اس کی طبیعت لطیف ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر سونے کے خول والی گھڑی کو اٹھا ناچا ہا۔ جونہی اس کا ہاتھ گھڑی سے لگا، اسے آسمانی بجلی کا کڑا کا اور بادلوں کی ہیبت ناک گرج سنائی دی اور ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ کپتان کی تصویر غائب ہو گئی ہے اور اس کی جگہ سمندری طوفان کی بڑی بڑی لہریں تصویر کے فریم سے ٹکرا رہی ہیں۔

نوجوان غش کھا کر گرتے گرتے بچا۔ وہ چیخ مار کر اٹھے پاؤں بھاگا۔ کھڑکی میں سے باہر باغ میں کودا۔ جنگلی بھائیوں میں گرتا پڑتا بھوت محل کی پتھریلی دیوار کے پاس پہنچا اور بڑی مشکل سے دیوار پھاڑ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ گاؤں پہنچ کر وہ ایسا بیمار پڑا کہ اس کی زبان بند ہو گئی اور بخار سے اس کا جسم پھڑکنے لگا۔ وہ کسی کو کچھ نہ بنا سکا کہ گرین ہاؤس کے اندر اس کے ساتھ کیا گزری اور اسی بخار اور زبان بندی میں چھ سات روز کے بعد مر گیا۔ اس اندوہناک حادثے کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ گرین ہاؤس کی طرف رخ کرنا۔ قصبے کی بلدیہ نے اس دو منزلہ آسپی کوٹھی کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، کیونکہ مرے ہوئے کپتان کی کوئی اولاد یا رشتہ دار موجود نہ تھا جو اس کوٹھی کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا۔ ویسے بھی ایسی پراسرار آسب زدہ کوٹھی کی ملکیت کا دعویٰ کون کرنا جس کے اندر ایک سو برس کے مرے ہوئے سمندری کپتان کی روح رہتی آرہی ہو۔

اس آسب زدہ دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس کے بھوت کے بارے میں دہشت ناک کہانیاں سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کوٹھی کے آس پاس بچہ تک نہ چھٹکتا تھا۔ رات کو تو الگ بھوت محل پر ایک ڈراؤنی خاموشی چھا جاتی۔ کہتے ہیں کسی روز ایسا ہوتا کہ آدھی رات کے وقت دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں اچانک روشنی ہو جاتی یہ روشنی ایسی ہوتی جیسی کسی پُرانے زمانے

بارے میں گاؤں کے لوگوں میں ایک سو سال سے طرح طرح کی وحشت ناک کہانیاں مشہور چلی آرہی تھیں۔ کہتے ہیں پچاس برس پہلے ایک بہادر نوجوان گرین ہاؤس میں رات کے وقت داخل ہو گیا شاید وہ اس نیت سے گیا تھا کہ کوٹھی کے اندر سے قیمتی سامان چوری کر کے لے جائے۔ اس نے گرین ہاؤس کی عقبی دیوار سے اندر باغ میں چھلانگ لگائی اور خود رو جھاڑیوں کو ہٹاتا کوٹھی کی ایک کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

کھڑکی کھول کر وہ اندر ڈرائینگ روم میں آ گیا۔ یہاں وکٹورین عہد کا بھاری فرنیچر سبز رنگ کی بڑی چادر سے ڈھکا پڑا تھا۔ سامنے کارنس پر پرانی طرز کی ایک بحری جہاز کی کھڑکی پڑی تھی جو کاخول سونے کا تھا۔ کارنس کے اوپر دیوار کے ساتھ بحری جہاز کے کپتان کی تصویر لگی تھی۔ دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس کبھی کپتان کی ملکیت تھی۔ وہ اکیلا اس کوٹھی میں رہا کرتا تھا۔ اس کی نہ کوئی بیوی تھی اور نہ بچے تھے۔ وہ جینے میں بیس دن سمندروں میں رہتا۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے لئے اپنے سمندری جہاز لے کر آتا اور اس کوٹھی میں قیام کرتا۔ گاؤں میں وہ کسی سے نہ ملتا۔ کسی کو اس کی پراسرار کوٹھی میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ کسی کو آج تک معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ اندر کیا کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ دور سے دیکھتے کہ گرین ہاؤس کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں۔ اندر سے کسی کی آواز نہ آتی تھی۔ رات کے وقت کوٹھی کی دوسری منزل میں ایک جانب ہلکی سی روشنی ہو جاتی۔ یہ روشنی رات کے بارے میں عجیب ہے۔ پھر روشنی بجھ جاتی ہے اور گرین ہاؤس پر بڑا عجیب و غریب اندھیرا چھا جاتا۔ کوئی ایک سو برس ہو کہ یہ سمندری کپتان اپنا جہاز لے کر سمندر میں منہ کر رہا تھا کہ ایک زبردست طوفان میں پھنس کر اس کا جہاز ڈوب گیا اور کپتان بھی ساتھ ہی غرق ہو گیا۔ اس کے بعد گرین ہاؤس پر ہمیشہ کے لئے تالا پڑ گیا، لیکن ایک عجیب بات ہونے لگی کبھی کبھی آدھی رات کی تاریکی اور خاموشی میں اس پراسرار کوٹھی میں سے ایسی آوازیں آتی ہیں جیسی کسی سمندری جہاز کا کپتان چیخ چیخ کر طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کے عملے کو ہدایات دے رہا ہو۔

پہلے پہل تو گاؤں کے لوگوں نے اسے اپنا وہم سمجھا، لیکن جب گاؤں کے بڑے بوڑھوں اور بچوں سب نے یہ آوازیں سنیں تو وہ ڈر گئے اور انہوں نے اس بھوت محل کی طرف آنا چھوڑ دیا۔ تب سے لے کر آج تک یہ دو منزلہ کوٹھی گرین ہاؤس بے آباد اور دیران پڑی تھی۔ اس کے بارے

ہاتھ فروخت کر دینے کا تھا۔ ڈاکو طوفانی رات گاؤں کے کسی ویران مکان میں بسر کرنا چاہتے تھے تاکہ صبح موسم اچھا ہو تو وہ پھر سے کشتی میں بیٹھ کر اپنا سفر شروع کر دیں۔

ڈاکو لڑکی کو لئے چٹانوں کے پاس کھڑے تھے۔ بجلی جھکی تو انہیں قریب ہی گرین ہاؤس کی پڑاوار عمارت دکھائی دی۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ رات بھر سر چھپانے کو ٹھکانہ مل گیا۔ ایک ڈاکو نے کہا۔

”میرا خیال ہے، ہم اس عمارت میں رات بسر کر سکتے ہیں۔“

دوسرا بولا۔

”ہاں! یہ کوئی بے آباد عمارت لگتی ہے۔“

پہلے ڈاکو کی نگاہ دوبارہ گرین ہاؤس پر لگی تو اچانک اس نے عمارت کی دوسری منزل کی کھڑکی میں ہلکی روشنی دیکھی۔ پھر یہ روشنی نچلی منزل کی کھڑکیوں میں آگئی۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”وہاں کوئی رہتا ہے۔ کھڑکیوں پر روشنی ہو رہی ہے۔“

دوسرے ڈاکو نے تہقہہ لگا کر کہا۔

”وہاں جو کوئی بھی ہوگا، اسے ہمارا خنجر چپ کرادے گا۔“

”چلو۔ اس مکان میں چلتے ہیں۔“

وہ لڑکی کو آگے دھکیلنے لگے۔ لڑکی نے گڑگڑا کر کہا۔

”خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میرے ماں باپ بہن بھائی میری جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں گے۔“

”ڈاکو تہقہہ لگا کر کہنے لگا۔“

”اب تو انہیں تمہاری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ تم بھی اپنے گھر والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ اب تم کبھی واپس نہ جاسکو گے۔“

لڑکی بے چاری رونے لگی۔ ایک ڈاکو نے اس کے پانی میں شرابوریاوں کو پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور بولا۔

”خبردار جسے بہائے۔ ہم قاتل اور خونخوار ہیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو قتل کیا ہے۔ اگر تم

کی بڑی موم جی کی ہوتی ہے۔ پھر یہ روشنی اوپر والی منزل کی کھڑکی سے انتر کر نچلی منزل کی کھڑکی پر آ جاتی۔ یوں لگتا جیسے کوئی جھٹکی ہوئی روح ہاتھ میں موم جی پکڑ کر آدھی رات کے سناٹے میں کوٹھی کے چکر لگا رہی ہو۔ کئی بوڑھوں نے یہ روشنی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور پھر اپنے مکانوں کی کھڑکیاں بند کر کے لحافوں میں دبک کر سو گئے تھے۔ خراب موموں میں جب شمال کی جانب سے انتہائی برفیلی، تیز اور تند ہوائیں چلتیں اور سمندر کی بڑی بڑی لہریں ایک ہیبت ناک شور کے ساتھ ساحل کی بھوری چٹانوں سے ٹکراتیں تو اس دو منزلہ عمارت کی اوپر والی منزل سے کسی کے چیخ چیخ کر کہہ کر گریں ہاؤس کی پڑاوار عمارت اسی طرح بارش میں بھیگی کھڑی ہے اور رات کی طوفانی ہوا نے کھڑکیوں پر چڑھی ہوئی جنگلی میلوں کو ایک طرف کو جھکا دیا ہے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔ گرین ہاؤس پر آہستہ آہستہ زندگی اور پڑاوار عمارت کے سائے مزید گہرے ہوتے گئے۔ دہشت اور وحشت کے پردے دبیز تر ہوتے گئے۔ گاؤں کی ایک نسل اپنے سینے کے راز دوسری نسل کے سینے میں منتقل کر کے گزر گئی۔ دوسری نسل نے یہ راز تیسری نسل کو دے دیئے۔ پھر اس پڑاوار محل کو ایک راز بھرے بادل نے اپنی آغوش میں لیا۔ کسی کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس کی طرف جائے، ایک رات کا ذکر ہے کہ آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سخت سردی سے سارے گاؤں پر کہرے کی چادر چھائی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے گھروں کے دروازے اندر سے بند کئے لحافوں میں دبکے سو رہے تھے۔ کسی وقت بجلی چمکتی، بادل گر جتا تو گرین ہاؤس کے گنجان درختوں میں سے ہونے پرندے اپنے پروں میں بچوں کو سمیٹ لیتے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ بارش میں ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہ دیتا تھا۔ ٹھیک اس وقت ساحل سمندر پر بھوری چٹانوں کے پاس ایک کشتی آکر رک گئی۔ کشتی میں سے دو خطرناک قسم کے مفرد قاتل اور ڈاکو اترے۔ ان کے ساتھ ایک دبلی پتلی نازک سی لڑکی بھی تھی اس لڑکی کے ہاتھ ڈاکوؤں نے پیچھے باندھ رکھے تھے۔ وہ اس لڑکی کو لے کر ساحل پر آگئے۔ کشتی انہوں نے بھوری چٹانوں کے پیچھے چھپا کر باندھ دی تھی۔ یہ ڈاکو اس لڑکی کو جنوبی آئر لینڈ کے ایک ساحلی شہر سے اغوا کر کے لائے تھے کہ طوفان میں گھر گئے۔ ان کا ارادہ لڑکی کو کمین کے ایک امیر تاجر کے

لیا ہے۔“

”معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

کونے میں تپائی پر کافی کی چینک اور دو تانبے کے گلاس پڑے تھے۔ انہوں نے چینک میں کافی رخو بھی پی اور لڑکی کو بھی پلائی۔ سخت سردی میں سمندری سفر کے بعد اس کمرے میں آکر وہ گرم ہوئے تھے۔ انہوں نے لڑکی سے کہا کہ وہ پلنگ پر چپ چاپ لیٹ کر سو جائے۔ لڑکی بے حد ڈری ہوئی ہے، اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ان کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ بڑے آرام سے اسے ہلاک کر دیں گے۔ وہ چابی پلنگ پر ایک پرانا سا مکمل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ دونوں ڈاکو آتش دان کے پاس زمین پر آلتی پالتی بیٹھے کافی پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ وہ یکن پہنچ کر امیر تاجو کے ہاتھ لڑکی کو فروخت کرنے اور اس کو مواصلہ کر کے دیاں سے ہانگ لگانے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش برس رہی تھی۔ رات کا سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا ڈاکو نے وقت دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

”میرا خیال ہے، ہمیں بھی کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔“

”ہاں! صبح پھر سفر کرنا ہے۔“

دوسرے ڈاکو نے کہا۔ ”تم سو جاؤ۔ میں جاگ کر پہرہ دوں گا۔ کوئی پتا نہیں اس گھر میں کوئی رہا ہو، ہم میں سے کسی کا جاگنا بہت ضروری ہے۔“

ایک ڈاکو آتش دان کے پاس ہی پڑ کر سو گیا۔ دوسرا جاگ کر خبر پتا تھ میں لئے پہرہ دینے لگا۔ لڑکی سے پرچیت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ سو نہیں رہی تھی، اسے اپنے ماں باپ کا خیال آ رہا تھا جو اس کی جدائی برباد رہے ہوں گے۔ لڑکی کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹھک پڑے۔ پھر اس کے ہونٹوں سے سلی نکل گئی۔ اس پر ڈاکو اپنی جگہ سے اٹھا۔ لڑکی کے پاس آیا اور جھک کر خنجر کی تیز نوک لڑکی کی دہان پر رکھ کر بولا

”اگر پھر تمہارے رونے کی آواز آئی تو یہ خنجر تمہاری گردن میں اتار دوں گا۔ سمجھیں؟“ لڑکی ہلکتے ہونٹوں سے کہا۔

”میں نہیں روؤں گی۔“

نے شور مچا یا تو یہ خنجر تمہارے سینے میں اتار کر تمہاری لاش سمندری پھلیوں کے حوالے کر دی جائے گی۔ غریب لڑکی ہم کو خاموش ہو گئی۔ ڈاکو اب گرین ہاؤس کے لوہے کے بند دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ انہوں نے نالا بڑا دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا کہ اگر اس گھر میں کوئی رہتا ہے تو پھر یہ تار کس نے ڈال دیا۔

”یار پھوڑو یہ باتیں۔ دیوار بھانڈ کر اندر چلو، رات بسر کرتے ہیں۔ ہمیں کیا کوئی یہاں رہ رہے یا نہیں۔“

سب سے پہلے انہوں نے لڑکی کو دیوار کے اوپر چڑھا کر دوسری طرف اتارا، پھر ایک ایک کر کے وہ خود بھی دوسری طرف اتر گئے۔ بارش بڑے زور شور سے ہو رہی تھی۔ کسی کسی وقت کچا چمکتی اور زور سے بادل گرجتے۔ گرین ہاؤس کے باغ میں بھڑیاں اور جھاڑ جھنکاڑا تنا گینا ہوا تھا کہ ڈاکو بڑی مشکل سے راستہ بنا تے عمارت کے عقبی حصے میں آ گئے۔ وہ بڑے دروازے سے اندر داخل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہاں چوکیدار پہرہ دے رہا ہو گا۔ انہیں خنجر بھی عمارت میں مموائے کتیاں کے بھوت کے اور کوئی بھی نہیں ہے۔

عمارت کے عقب میں انہوں نے ایک کھڑکی کا پٹ زور لگا کر کھول دیا اور خاموشی سے اندر چلے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک پیتل کے پالوں والا برانا لٹا پھوٹا پلنگ پڑا تھا۔ ڈاکو میں آتش دان تھا جس کے اوپر دیوار پر ایک پرانی ہندوق لٹک رہی تھی۔ آتش دان کے دائیں بائیں آرام کرسیاں رکھی تھیں جن پر گرد کی تہہ جی تھی۔ ڈاکو نے جیب سے موم بتی نکال کر روشن کی اور کارڈ پر لگا دی۔ آتش دان کے پاس ہی لکڑیوں کا ایک ڈھیر تھا۔ انہوں نے آگ جلائی اور اپنے کپڑے سکھانے لگے۔ پھر لڑکی سے بھی کہا کہ وہ اپنے کپڑے خشک کرے۔ وہ بڑے حیران تھے کہ اس عمارت میں ابھی تک کسی کو کانوں کا خبر نہ ہوئی تھی، حالانکہ کھڑکی کے پٹ کھلنے کی بڑی آواز پیدا ہوا تھی۔ ایک ڈاکو نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے، اس گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ دیکھتے نہیں ہر جگہ گرد جی ہوئی ہے۔“

دوسرا بولا۔ ”پھر کھڑکی میں موم بتی کی روشنی کیسی ہوئی تھی؟“

پہلے نے کہا۔ ”شاید وہ چوکیدار تھا جو گشت لگانے اور پر گیا اور اب اپنی کوٹھڑی میں جا کر

اب ڈاکو کچھ پریشان ہو گیا۔ اس نے خنجر ہاتھ میں لیا اور کمرے میں کھڑے ہو کر بولا۔ ”کون ہے؟“
کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف اس کے سوتے ہوئے ساتھی ڈاکو کے خراٹے گونج رہے تھے۔ اس نے سوچا شاید یہ اس کا وہم ہے۔ وہاں اور کون ہو سکتا ہے؟ بھلا کون اندر آ کر
موم تہی جلا سکتا ہے۔ وہ ہنس پڑا۔ اس نے موم تہی کو بھونک مار کر بجھایا اور لڑکی کے پاس آ کر بولا۔
”تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

لڑکی خوف سے کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سکیاں
بھرتے ہوئے کہا۔

”رحم کرو۔ رحم کرو۔ میں بے گناہ ہوں۔“

”بلکہ اس بند کرو، ڈاکو نے کہا۔“

وہ لڑکی پر جھک گیا اور اس پر دوسری بار حملہ کرنے والا تھا کہ دفعتاً ایک بار پھر موم تہی خود بخود
جل اٹھی اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اب تو ڈاکو کو پسینہ آ گیا۔ وہ پلنگ سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے
پاؤں کٹھو کر مار کر اپنے ساتھی کو جگا دیا وہ بڑبڑا کر اٹھا اور اُسے موٹی سی گالی دے کر بولا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

پہلے ڈاکو نے کہا۔

”کسی نے دوبار اس موم تہی کو جلا یا ہے۔“

”کیا بک بک کر رہے ہو؟“ دوسرے ڈاکو نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا

پہلے ڈاکو نے سرگوشیوں میں اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ دوسرا ڈاکو بھی حیرانی سے آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر موم تہی کو تکتے لگا۔

”ارے نہیں بد بخت! یہ تیرا وہم ہے۔“

”وہم نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ ایک بار موم تہی بجھی۔ پھر
جل اٹھی۔ دوسری بار میں نے اسے بجھایا تو پھر یہ روشنی ہو گئی۔“

”تو کیا اس کمرے میں کوئی بھوت رہتا ہے۔“

”خدا جانے..... لیکن میں اس کمرے سے چلے جانا چاہیے۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکو واپس اپنی جگہ آتش دان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرا ڈاکو
لے رہا تھا۔ آتش دان میں آگ مدہم پڑ گئی تھی۔ تپائی پر موم تہی روشن تھی۔ جاگنے والا ڈاکو موم
دھیمی روشنی میں پلنگ پر سوئی ہوئی لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے اندر کا شیطان بیدار ہو
شیطان نے اس کے جُڑے خیالات کو تحریک دی اور ڈاکو اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس کے چہرے پر سہیر
خواہشات کی تاریکی سی چھا گئی۔ اس نے اُٹھ کر پھونک مار کر موم تہی بجھا دی۔ موم تہی کے بجھتے
کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ لڑکی نے پلنگ پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہاں اندھیرا ہی
تھا۔ صرف کھڑکی کے اوپر روشندان میں سے باہر بارش والی طوفانی رات کی بے معلوم سی ہلکی
روشنی پڑ رہی تھی۔ بارش کی آواز بادلوں کی گرج کے ساتھ ساتھ اندر صاف سنائی دے رہی
لڑکی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ ڈاکو کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ اس
لیٹے ہی لیٹے خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا! میری عزت کی حفاظت کرنا۔ ڈاکو اپنی جگہ سے اُٹھ
آہستہ آہستہ پلنگ پر آیا اور پھر جلدی سے اس نے اپنا ایک ہاتھ لڑکی کے منہ پر رکھ کر کہا۔

”خبردار! اگر تو نے آواز بلند کی تو میں خنجر سے تمہاری گردن اتار دوں گا۔ چپکے سے لیٹی رہ
لڑکی کا خون خشک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُٹھائے۔ وہ ایک بے بس اور مجبور لڑ
اور اپنے شریف ماں باپ کے گھر سے دور دوغنی ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ ڈاکو
پر جھک گیا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو لڑکی کے گریبان میں ڈال چکا تھا کہ اچانک موم تہی روشن ہو گیا
اُچک کر چیخے ہٹ گیا۔

”بد بخت تو نے موم تہی کیوں روشن کر دی؟“

اس کا خیال تھا کہ یہ موم تہی اس کے ساتھی ڈاکو نے جلائی ہے۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کا
آتش دان کے پاس بے خبر سویا خراٹے لے رہا ہے۔ پھر یہ موم تہی کس نے روشن کی؟ ڈاکو ششدر سا
رہ گیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھا بڑے غور سے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کمرے میں اور کوئی بھی نہ
تھا۔ پھر یہ موم تہی خود بخود کیسے جل اٹھی۔ ضرور اُسے کسی نے جلا یا ہے، لیکن جس نے اسے جلا یا ہے
کہاں ہے؟ ڈاکو نے سوچا شاید اس نے موم تہی بجھائی نہیں تھی۔ مگر اس نے تو خود پھونک مار
بجھایا تھا۔

سے سر پر لوہے کی کوئی بھاری سی چیز کی ضرب پڑی اور وہ ہائے کہہ کر فرشتے کی تیرتا ہوا سمندر سے ہو گیا۔ دوسرے ڈاکو نے خنجر نکال کر ہوا میں لہرایا۔

”کون ہے؟“

لیکن کمرے میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر ڈاکو گر کر کیسے بے ہوش ہوا؟ دوسرے گورڈیت کا گڑھا کہ شاید وہ صدمے سے گر کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ وہ جھک کر بیٹل ڈاکو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر لگا۔ اتنے میں وہی لہجے کی بھاری شے اس کے سر پر بھی پڑی اور وہ بھی اپنے ساتھی کے اوپر گر کر ہوش ہو گیا۔ لڑکی خوف سے کانپنے لگی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے خیال آیا کہ خدا نے اس کی دُعا سن لی ہے اور یہ ڈاکو اپنے آپ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ہاتھ اتنی مضبوطی سے پیچھے باندھے گئے تھے کہ وہ کھول نہیں سکتی تھی۔ اچانک اس کے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کوئی اس کے پیچھے کھڑا اس کے ہاتھوں کی رسی کھول رہا تھا۔

لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے کوئی بھی تھا، لیکن دو انسانی ہاتھ اس کے ہاتھوں کی رسی کھول رہے تھے۔ اب لڑکی کے بے ہوش ہونے کی باری تھی اور وہ بھی بے ہوش ہو گئی۔ مگر وہ گری نہیں۔ کسی نے اسے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور رسی کھول کر اس کے ہاتھ آزاد کر کے اسے پلنگ پر آرام سے لٹا کر اوپر کبل ڈال دیا۔ پھر کمرے کی کھڑکی کھلی۔ کسی نے دونوں ڈاکوؤں کو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک کر نکل گیا۔

لڑکی کو ہوش آیا تو روشن دان میں سے صبح کی روشنی اندر آرہی تھی۔ آتشدان میں آگ بجھ گئی تھی مگر گرم تھا۔ اس کے سر ہانے تپائی پر گرم گرم دودھ کا گلاس رکھا تھا۔ لڑکی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رات کے واقعات اسے خواب کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے گرم دودھ کا گلاس پیا اور کھڑکی میں سے کود کر باہر آگئی۔ بھوری چٹانوں کے درمیان رات کی بارش سے گیلی ریت پر دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں پڑی تھیں۔ دونوں کے سران کے تن سے جڑا تھے اور ذرا پرے اوندھے پڑے تھے۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ ڈر کر گاؤں کی طرف اٹھ دوڑی۔ بڑی مشکل سے گرین ہاؤس کی دیوار پھانڈ کر وہ گاؤں پہنچی۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کو ساری کہانی بیان کی۔ پولیس آگئی۔ پولیس کے دو سپاہی ڈرتے ڈرتے گرین ہاؤس کی دیوار پھانڈ کر اندر گئے اور دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں لے کر واپس آ گئے۔

”اس طوفانی رات میں ہم کہاں جائیں گے۔ تھوڑی رات رہ گئی ہے آرام سے تم بھی سو جاؤ۔ یہ لڑکی ابھی تک کیوں جاگ رہی ہے؟ اسے بھی سلا دو۔“

انہوں نے لڑکی کو ڈانٹا کہ وہ سو جائے اور خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگے۔ پہلے ڈاکو نے موم بتی بجھائی چاہی تو دوسرے نے کہا کہ موم بتی روشن رہنے دو۔ موم بتی جلتی رہی۔ لڑکی پلنگ پر خاموش گم غم بھی ہوئی لیٹی رہی اور ڈاکو آتشدان کے پاس لیٹے سونے کی کوشش کرتے رہے۔ دوسرا ڈاکو ایک بار پھر خراٹے بھرنے لگا۔ لیکن پہلے ڈاکو کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دوبارہ موم بتی کو جلتے دیکھا تھا۔ باہر بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ بادل اب گر جانا بند ہو گئے تھے۔ دور سمندر کی طرف کسی وقت ہلکی سی بجلی چمک جاتی تھی۔ اتنے میں دروازہ چرچر آنے کی آواز آئی۔ ڈاکو نے خنجر تان لیا اور اپنے ساتھی کو جگا دیا۔

”شی! کوئی اندر آ رہا ہے۔“

”موم بتی بجھا دو۔“

”نہیں نہیں اسے روشن نہ مٹے دو۔ کرسیوں کے پیچھے چھپ جاؤ۔“

دونوں ڈاکو کرسیوں کے پیچھے چھپ گئے۔ موم بتی روشن رہی۔ وہ بڑے غور سے اس دروازے کی طرف دیکھنے لگے جو اندر کسی کمرے کی طرف کھلتا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کئی سالوں سے بند پڑا ہے۔ لڑکی بھی سانس روکے پلنگ پر لیٹی تھی اور ذرا سا سر اٹھا کر آنکھیں بھاڑے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازہ زور سے چرچر آیا، اور بھی کھل گیا۔ دروازہ کچھ دیر کھلا رہا۔ پھر اپنے آپ بند ہو گیا اندر کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کسی نے دروازہ کھول کر جھانک کر اندر دیکھا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا ہے۔ ڈاکو کرسیوں کے پیچھے سے نکل آئے۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”شاید چوکیدار تھا۔ چلا گیا۔“

”لیکن میں نے تو کسی کی شکل نہیں دیکھی۔“

”ہو سکتا ہے ہمیں شکل دکھائی نہ دی ہو۔ لیکن میرا خیال ہے، ہمیں اب یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔ طوفان بھی تھم گیا ہے اور رات بھی گزب چکی ہے۔“

انہوں نے لڑکی کو اٹھایا۔ اس کے ہاتھ پیٹھے پر باندھے اور اٹھ کر چلنے ہی والے تھے کہ ایک ڈاکو

”اس طوفانی رات“ نے ڈاکوؤں کی لاشیں برآمد ہونے کا واقعہ ارد گرد کے دیہات میں پھیل گیا۔ لوگوں کی ابھی تک کیوں جاگ ہو گئی۔ انہیں گرین ہاؤس کی پراسرار عمارت سے زیادہ خوف محسوس ہونے لگا انہوں نے لڑکی کو ساتھ ان کے دلوں میں گرین ہاؤس کے جھوٹ کی عزت بڑھ گئی کیونکہ اس نے بھائی چاہی تو دوسری لڑکی کی عزت بچاتے ہوئے ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے باوجود کسی میں کبہ گم نہ ہوئی تھی کہ وہ دوسرا جھوٹ محل کے قریب سے بھی ہو کر گذرے۔ دسمبر کی بچ راتوں کو جب برف باری ہوتی تو گرین ہاؤس کی ڈھلانی چھت برف سے لد جاتی مدت کو ہڈیوں میں دھنڑ والی برف آلود ہوائیں پھینچتی ہوئی گرین ہاؤس کی بند کھڑکیوں سے ٹکرا کر گزرتیں اور چاروں طرف ایک ڈھماں چھا جاتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ٹھنکی ہوئی بے چین روئیں عمارت کی سرد دیواروں سے سر ٹکرا کر گر رہی ہوں۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ گرین ہاؤس کی پراسرار و منزلہ عمارت پر، اسرار کے پردے بڑے ر طوفانی راتوں کے بحری کپتان کے جھوٹ کی اسی طرح آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی اندھیری راتوں کے نشہ میں عمارت کی دوسری منزل کی کھڑکی میں موم جی کی روشنی ہوتی اور پھر یہ روشنی پہلی منزل کی کھڑکیہ میں آکر بھر جاتی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جرمن جہازوں نے انگلستان کے شہروں پر اندھا دھمباری شروع کر دی۔ دشمن کے جہاز آتے اور گرین ہاؤس کی پراسرار عمارت کے اوپر سے ہو کر لندن طرف چلے جاتے۔ ایک دفعہ برطانیہ کا ایک جنگی جہاز گرین ہاؤس کے سمندر کے قریب سے گذرا۔ جاسوسوں مخبری کر دی۔ فوراً ہی جرمن ہوائی جہاز بھیج گئے اور انہوں نے جہاز پر بم باری شروع کر دی۔ ایک گرین ہاؤس کے باغ میں گرہ۔ جس کی وجہ سے گرین ہاؤس کی دیوار ایک طرف سے گر پڑی اور جنوب کی کھلنے والی کھڑکی ٹوٹ گئی۔ کسی نے ٹوٹی ہوئی دیوار اور کھڑکی کی مرمت نہ کی۔ راتوں کو ہر وقت بلیک آؤٹ ہوتا۔ لوگوں نے ایک حیرت انگیز تبدیلی یہ محسوس کی کہ اب راتوں کو گرین ہاؤس کی پراسرار عمارت میں موم جی کی روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شاید یہ برطانوی بحری کپتان کی روح کو بھی اپنے وطن دفاع کا اتنا خیال تھا کہ وہ بلیک آؤٹ میں روشنی کر کے دشمن کے جہازوں کی توجہ اپنی طرف نہیں بچا رہا تھا۔ جنگ زوروں پر تھی کہ جرمن فضائیہ کا ایک طیارہ زخمی ہونے کے بعد اس طرف آ گیا۔ جہاز کی دم پر گولہ لگا تھا اور وہ دھوئیں کی لکیر چھوڑتا سمندر کی طرف گر رہا تھا۔ بس اب وہ پھٹنے ہی تھا کہ اس کے ہوا باز نے جہاز میں سے پیراشوٹ کے ذریعے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کے باہر چھلانگ

انے کے فوراً بعد جہاز میں آگ لگ گئی اور وہ پھٹ کر رات کی فضا میں بکھر گیا۔ جرمن ہوا باز پیراشوٹ کے ذریعے سمندر میں جا گرا۔ رات کا وقت تھا۔ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جرمن یا ملٹ تیرتا ہوا سمندر سے ہر خشکی پر آ گیا۔ وہ دیر تک ریت پر ایک چٹان کے پیچھے دلکاحالات کا جائزہ لیتا رہا۔ جب اسے یقین آیا کہ کسی نے اسے گرتے نہیں دیکھا تو اس نے اپنے کاغذات کو آگ لگائی۔ پیراشوٹ کو ریت کا گڑھا مود کر اندر دبایا۔ پستول ہاتھ میں لی اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ساحل کی طرف چل پڑا۔ آسمان بادلوں کی اوٹ میں سے چاند نکل آیا گاؤں میں سمندر کے کنارے کنارے اس کی روشنی پھیل گئی۔

یہ گرین ہاؤس کی پراسرار عمارت تھی۔ جرمن ہوا باز نے سوچا کہ اس عمارت کے کسی کونے میں چھپ رات بسر کرنی چاہیے اور صبح کو یہاں سے انگریز مزدور کا بھیس بدل کر فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لئے مزدوری تھا کہ وہ کسی انگریز مزدور کو کپڑے کرے اور پھر اس کے کپڑے ہن کر وہاں سے نکل جائے۔ وہ گرین ہاؤس کی بمباری سے گری پڑی دیوار کے بلے پر سے گذر کر اندر بلن باغ میں آ گیا۔ عمارت پر گہری خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی، جرمن ہوا باز بڑی ہوشیاری سے باڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتا عمارت کے پیچھے اسی کمرے کے باہر آ گیا جہاں اس سے پہلے ڈاکو اغوا شدہ لڑکی کو کپڑے کرائے تھے۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی کا پٹ بمباری کی وجہ سے ٹوٹ کر نیچے گر رہا تھا۔ وہاں چھلانگ لگا کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے میں وہی پرانا پلنگ بچھا تھا۔ آتش دان میں جلی ہوئی لڑیوں کی راکھ پڑی تھی۔ دو آرام کرسیاں تھیں، کونے میں تپائی پڑکھی ہوئی موم جی پڑی تھی اور آرام رسیوں کے پاس ہی کافی کی چینک اور تین ڈونگے الٹے پڑے تھے۔ ہوا باز نے چینک اور ڈونگے اٹھا کر ایک طرف کئے۔ موم جی روشن کر کے آتش دان کے پاس رکھی اور حیرت سے انگلستان کے دیہات انقشہ اور کپاس نکال کر دیکھنے لگا کہ وہ کسی جگہ پر طیارے سے گرا ہے۔

وہ بہت جلد سمجھ گیا کہ یہ جگہ لندن سے پچاس میل مغرب میں سمندر کے کنارے پر ہے اگر اسے کسی انگریز مزدور پاکستان کے کپڑے مل جائیں تو وہ بڑی آسانی سے لندن پہنچ سکتا ہے۔ لندن میں جنگ کی زلفی مچی ہوئی تھی۔ وہاں سے وہ فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتا تھا اور اگر چاہے تو جنگ کے ختم ہونے تک گم بھی رہ سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ بھیس بدلنے کے لئے کپڑے کہاں حاصل کئے جائیں؟ اس

چکا تھا۔ جونہی وہ کھڑکی کے پاس آیا ایک بڑے زور کا گھونسا اس کے منہ پر لگا اور وہ پلٹ کر پیچھے پلنگ پر گر پڑا۔ ہوا باز بولکھلا کر اٹھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسے گھونسا مارنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دوسرا گھونسا اس کے سر میں لگا۔ وہ گر پڑا۔ اب اس کے ذہن میں انگریز مزدور کا جملہ گونج اٹھا:

”گرین ہاؤس کے بھوت! مجھے معاف کر دے۔“

تو کیا اس عمارت میں کوئی بھوت رہتا ہے؟ جرمن ہوا باز ایک جدید سائنسی دُور کا پڑھا لکھا نوجوان تھا جس کی تربیت جرمن فضائیہ کے بڑے سخت اور سائنٹیفک ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ جنوں ہوتوں پر اعتبار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن ایک یقین نہ آنے والی بات اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی تھی یعنی کسی نے اس کو دوز بردست گھونے مارے تھے اور مارنے والا اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے کتے اور سر کو مہلاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اٹھتے ہی اس نے قیص لے اندر سے پستول نکال کر کہا:

”کون ہو تم؟ سامنے آؤ۔ نہیں تو گولی چلا دوں گا۔“

اس کی بات کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے سنائی یوں دیا جیسے کوئی بھاری بھر کم قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہوا باز نے جدھر سے قدموں کی چاپ آرہی تھی ادھر کو پستول کا رخ کر کے نولی چلا دی۔ دھائیں کی آواز کے ساتھ گولی پستول میں سے نکل کر سامنے کی دیوار پر لگی۔ تانبے کی ایک بالی تھالی سے ٹکرائی اور تھالی ایک شور کے ساتھ اپنی جگہ سے اچھل کر فرش پر گر پڑی۔ اس شور کی آواز سے انگریز مزدور کو ہوش آگیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ہوا باز کو پستول تانے دیوار کی طرف نہر کے کھڑا دیکھا تو کچھ نہ سمجھ سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ بھاری بھر کم قدموں کی چاپ اب بھی ہوا باز لطف آرہی تھی۔ اس نے دوسری بار پھر گولی چلا دی۔ اس بار گولی کھڑکی کے پٹ کو چیر کر باہر نکل گئی۔ ہوا باز نے چیخ کر کہا:

”کون ہو تم؟ میں گولی مار دوں گا۔“

لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اندر سے ڈول گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر خوف سے پسینہ آگیا تھا۔ وہ مجھ گیا تھا کہ اس کا سامنا ایک بھٹکی ہوئی روح ہے۔ ایک ایسے بھوت سے ہے جو اس عمارت میں

کے لئے ضروری تھا کہ رات بسر ہو جائے پھر صبح وہ سڑک پر جا کر کسی مزدور کو اغوا کر کے اس کمرے میں لائے اور پھر اسے بے ہوش کر کے یا ریموں سے باندھ کر اس کے کپڑے اُتروا کر خود پہنے اور وہاں سے فرار ہو جائے۔ رات گزر گئی۔ دن کی روشنی نکل آئی۔ جرمن ہوا باز نے جرمن فضائیہ کی دردی پہنی ہوئی تھی جو دور ہی سے پہچانی جاسکتی تھی۔ اس نے جلیٹ اتار کر پھینک دی۔ وہ صرف نیلا سوئیڈ اور نیلی پتلون میں ہی گرین ہاؤس سے باہر آکر چٹانوں میں ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا جہاں قریب ہی سے ایک کچا لاسٹہ کھیتوں میں جاتا تھا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اسے ایک مزدور جساتا نظر آیا۔

جرمن ہوا باز نے پستول ہاتھ میں لیا اور ایک دم سے چٹانوں میں سے نکل کر مزدور کے آگے آگیا اس نے مزدور کے سینے پر پستول رکھ کر اسے اپنے ساتھ گرین ہاؤس چلنے کو کہا۔ مزدور ہکا بکا رہ گیا۔ جب اس نے سنا کہ پستول والا آدمی اسے گرین ہاؤس کی طرف لے جا رہا ہے۔ تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ یہی سمجھا کہ یہ پستول والا نوجوان گرین ہاؤس کا بھوت ہے جو انسانی شکل میں آکر اسے اغوا کرے گا اور پھر گرین ہاؤس کے اندر لے جا کر اسے ہڑپ کر جائے گا، اس نے باپ دادا کے وقتوں سے اس پر اسرار عمارت کے بارے میں جو کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اب وہ اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو کر آگئی تھیں۔ اس نے روکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا:

”گرین ہاؤس کے بھوت! مجھے معاف کر دے۔“

جرمن ہوا باز چکر کھا گیا کہ یہ انگریز مزدور اسے بھوت کس طرح سے سمجھ رہا ہے۔ اس کے بازو حیران ہونے کے لئے وقت نہیں تھا۔ اس نے پستول کی نالی مزدور کے سینے پر دباتے ہوئے کہا:

”جلدی میرے ساتھ چلو اتو کے پٹھے۔“

اگر مزدور تھر تھر کانپتے ہوئے آگے آگے چل پڑا۔ گرین ہاؤس کے کمرے میں آکر ہوا باز نے پیچھے سے مزدور کے سر پر پستول کا دستہ اتنی زور سے مارا کہ وہ بے چارہ مزدور جھک کر کھاکر زمین پر گر پڑا ہوا باز نے جلدی جلدی اس کے کپڑے اتار کر خود پہنے۔ نقشہ بھاڑ کر آتش دان میں جلایا۔ پستول۔ قیص کے اندر چھپائی اور مزدور کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے پلنگ کے ساتھ باندھ دیا۔ اب وہ باہر نکلنے کے لئے آزاد تھا۔ وقت ضائع کئے بغیر وہ کھڑکی کی طرف پرکاش کا ایک پٹ ٹوٹ

یہیں بچتے ہو گئیں گاؤں میں سیاحوں کے لئے ایک شاندار ہوٹل تعمیر ہو گیا۔ مگنٹری بسیں گاؤں کے
 میں آکر ٹھہرنے لگیں۔ لیکن گرین ہاؤس کی پراسرار و منزلی عمارت پر وحشت کے بادل چھائے رہے۔
 اس کی کھڑکیوں پر دھندلا ہوا موشی طاری رہی۔ اس کی دیواروں پر جنگلی جھاڑیاں چڑھتی چلی گئیں۔ اس
 ٹی ہوٹل دیوار کی کسی نے مرمت نہ کی۔ کسی کو حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ وہ گرین ہاؤس کے قریب سے
 رہے۔ دن میں پھر بھی کوئی اکا دکا مزدور پاکستان دور سے گذر جاتا تھا۔ لیکن رات کو وہاں ڈراؤنی
 روشنی کاراج ہوتا۔ آدھی رات کو پھر کسی کسی دن دوسری منزل کی کھڑکی میں اسی طرح سے موم جی کی
 نین ہوئی۔ پھر یہ روشنی دوسری منزل سے اتر کر پہلی منزل میں آکر بجھ جاتی۔ طوفانی راتوں کو اب بھی
 اس کے لوگ گرین ہاؤس کی طرف سے آتی ایسی آوازیں سننے جیسے کوئی بحری کپتان، طوفان میں گھرے
 بے جہاز کے ملاحوں کو چیخ بچھ کر ہدایات دے رہا ہو۔

ان حالات میں لوشیا نامی مالدار امریکی بیوہ اس گاؤں میں آئی۔

لوشیا کیلے فوریا کی ریاست کے ایک قصبے میں پیدا ہوئی۔ اس کے ماں باپ بڑے غریب تھے اور
 مشکل سے اپنا وقت پورا کر رہے تھے۔ لوشیا کا باپ ایک امیر امریکی زمیندار کے کھیتوں میں کام
 باتھا۔ لوشیا اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھی۔ اس غریبی میں بھی لوشیا کے ماں باپ نے اپنی بچی کو
 اعلیٰ بیار سے پالا اور اسے گھر پر ہی اچھی تعلیم دی۔ لوشیا بچپن ہی سے بڑی ذہین تھی۔ قدرت نے اسے
 تو ایسی مصومیت اور حوروں کیسا بھولا بھالانیک چہرہ دیا تھا۔ لوشیا اپنے ماں باپ سے بہت
 رکتی تھی۔ وہ جوان ہوئی تو ماں باپ کو اس کی شادی کی نکر ہوئی۔ لوشیا کی خوب صورتی کی سارے
 ان میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ امیر زمیندار نے لوشیا کی شادی اپنے بیٹے سے کرنی چاہی، لیکن لوشیا
 انکار کر دیا کیونکہ زمیندار کا لڑکا بڑا اوباش اور بڑے کردار کا تھا۔ زمیندار نے لوشیا کے باپ
 بچے کھیتوں سے نکال دیا۔ اس غریبی اور بے کاری میں لوشیا کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ غریب باپ
 جین اور فوجی بچی کو لے کر شہر میں آ گیا۔ یہاں اس کا ایک رشتے دار کسی کارخانے میں کام کرتا
 رشتے دار نے کارخانے میں لوشیا اور اس کے باپ دونوں کو کام دلادیا۔ یہ جہاں اور دنیا میں
 نئے لاہوت بڑا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے کے مالک کا نام مسٹر سمٹھ تھا۔ مسٹر سمٹھ کی عمر پچاس کے
 بائیس گلاس نے بھی تنگ شادی نہیں کی تھی۔ اس کا امریکہ میں بہت بڑا کاروبار تھا۔ اس

رہتا ہے۔ وہ غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ اب وہ باہر بھاگنے کی فکر میں تھا۔ ہوا باز نے کھلی کھڑکی کو سامنے رکھ
 کر سوچا کہ اسے اس کھڑکی میں سے باہر کود جانا چاہیے۔ وہ کھڑکی کی طرف ایک دم سے بھاگا۔ کسی نے
 اس کی ٹانگوں کے آگے اپنی ٹانگ کر دی۔ ہوا باز منہ کے بل دھڑام سے زمین پر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ
 سے چھوٹ کر دور گر پڑا۔ دوسرے لمحے ہوا باز نے اپنی زندگی کا پہلا حیرت ناک منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا
 کہ پستول اپنے آپ فرش پر سے اٹھ کر فضا میں ٹھہر گیا۔ پستول کی نالی کا رخ ہوا باز کے سینے کی طرف تھا
 اسے کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ پستول اس کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ مزدور لیٹا لیٹا تھر تھر لرز رہا تھا۔ وہ
 سمجھ گیا تھا کہ گرین ہاؤس کا بھوت آ گیا ہے۔ اب اس کی خیر نہیں۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ
 بھاری مضبوط ہاتھ اس کے منہ سے پکڑا باہر نکال رہے ہیں اور اس کے جسم سے بندھی ہوئی رسیاں کھول
 رہے ہیں۔ اب وہ آزاد تھا۔

دوسرے ہی لمحے جرمن ہوا باز کے دونوں ہاتھ کسی نے پکڑ کر پیچھے سے باندھے شروع کر دیئے ہوا باز
 نے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن باندھے والے کے ہاتھوں کی گرفت اس قدر مضبوط تھی
 کہ وہ اپنے آپ کو چھڑا نہ سکا اور بے بس ہو گیا۔ بھوت نے اسے باندھ کر اس طرح سے کس دیا کہ وہ
 بازو ذرا سا بھی ہلانہیں سکتا تھا۔ پھر انگریز مزدور کے کان میں جیسے سرگوشی سنائی دی:

”یہ ایک جرمن ہوا باز ہے۔ اسے جاؤ اور پولیس کے حوالے کر دو۔“

”اور خبردار! دوبارہ اس گھر کا رخ کیا تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

مزدور تھر تھر کانپ رہا تھا اس نے پھر بھی ہمت کر کے پستول کی نالی جرمن ہوا باز کی گردن پر
 رکھ دی اور اسے لے کر گرین ہاؤس سے باہر آ گیا۔ باہر سڑک پر آتے ہی اس نے شور مچا دیا کہ میں نے ہوا باز
 پکڑا ہے۔ دشمن کا ہوا باز پکڑا ہے۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے، اس کے ساتھ ہی انگریز مزدور کے
 ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر پڑا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ لوگوں نے دشمن کے ہوا باز کو پولیس کے حوالے
 کر دیا۔

جنگ ختم ہو گئی۔ بمباری سے تباہ شدہ انگلستان کے ڈھلپنے میں سے ایک نیا ملک جنم لینے لگا۔
 زوال شدہ معیشت پھر سے بحال ہونے لگی جیٹ ہوائی جہازوں کا دھڑا شروع ہو گیا۔ روس اور
 امریکہ نے چاند کی طرف سیارے بھیجنے شروع کر دیئے۔ گرین ہاؤس کا گاؤں بھی ترقی کرتا چلا گیا۔

» جناب! میں لوشیا سے پوچھ بیغ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ «

گھر واپس آکر اس نے لوشیا سے بات کی تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے معلوم تھا کہ سڑکتے ہوئے عرصے میں اس سے بہت بڑا ہے۔ اس کی عمر انیس برس تھی جب کہ مسٹر سمٹھ بچاس برس کا تھا۔ اسے بھی معلوم تھا کہ اگر اس نے شادی سے انکار کر دیا تو ہو سکتا ہے، مسٹر سمٹھ ان دونوں کو نوکری سے راب دے دے اور وہ لوگ ایک بار پھر شہروں کے دھکے کھاتے پھریں۔ اس نے اپنے باپ سے

ہوا:

» ڈیڈی! آپ کا کیا خیال ہے؟ «

باپ نے کہا: » بیٹی! فیصلہ تم ہی نے کرنا ہے۔ تم جو فیصلہ کرو گی، مجھے منظور ہوگا۔ «

بیٹی کو خبر تھی کہ اگر فیصلہ سمٹھ کی مرضی کے خلاف ہوا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس نے مسٹر سمٹھ سے نادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس خبر نے سارے کارخانے کے کارکنوں کو ایک بار توجہ ان کر دیا۔ وہ لوشیا کی قیمت پر رشک کرنے لگے۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ لوشیا اب کارخانے میں کام نہیں کرتی تھی۔ بلکہ کارخانے کے مالک کی امیر بیوی بن کر اس کے عالیشان بنگلے میں آگئی تھی۔ اس کا باپ اسی طرح کارخانے میں کام کرتا رہا۔ وہ ایک محنتی محنت کش تھا۔ اس نے ساری زندگی ہاتھ سے کام کر کے کمائی کی تھی اور وہ ساری عمر خود کم کر کھانا چاہتا تھا۔ شادی کے بعد لوشیا نے اپنے خاوند کی بڑی دانستندی اور ذمہ داری کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی۔ وہ ایک بڑی جی دار، بردبار اور متعل مزاج اور سلیقہ شعار بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے سارے کارخانے کی دیکھ بھال میں اپنے خاوند کی مدد کرنی شروع کر دی۔ دو برس بعد لوشیا کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ اپنے خاندان میں اکیلی رہ گئی تھی، لیکن اس کے خاوند کی محبت نے اسے باپ کا غم بھلانے میں بڑی مدد دی۔

شادی کو چند ہواں برس جا رہا تھا کہ لوشیا کا خاوند بھی اسے چھوڑ کر ملک عدم کو سدھار گیا لوشیا نے کالے کپڑے پہن لئے اور خاموش ہو گئی۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ دنیا میں بچہ اکیلی رہ گئی۔ صرف ایک خادمہ رہتا تھا جس کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اس کے غم اور غمیشوں میں اس کی دل سے شریک ہوتی تھی۔ مارتھا ایک حبشی لڑکی تھی اور قریباً لوشیا کی ہم عمر ہی تھی مگر سمٹھ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ساری جائیداد سمٹھ کے چاروں

کارخانے کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی کئی کارخانے تھے۔ مسٹر سمٹھ اپنے چار بھائیوں میں سب سے بڑا بھائی تھا۔

ایک روز وہ اپنے کارخانے میں گھوم پھر کر مزدوروں کو کام کرتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک کی نظر جمان اور حسین لوشیا پر پڑ گئی۔ وہ اپنی جگہ پر ٹھنک کر کھڑا ہو گیا مسٹر سمٹھ پر لوشیا کی معصومیت اور خوبصورتی نے اپنا بھرپور وار کر دیا تھا۔ لوشیا کی کوئی خبر نہیں تھی کہ بے خیالی میں اس نے کارخانے کے مالک کے دل میں اپنی محبت کا جادو بیدار کر دیا ہے۔ مسٹر سمٹھ نے لوشیا سے کوئی نہ کی۔ وہ بڑے انہماک سے اپنا کام کر رہی تھی۔ یعنی جرابوں کو ڈبوں میں بند کرتی جاتی تھی۔ سمٹھ میں آگیا کہ کسی پر بیٹھتے ہی اس نے اپنی سیکرٹری سے کہا کہ دن کی شفٹ میں کام کرنے والے مزدور فائل لے کر اندر آئے۔ سیکرٹری فائل لے کر اندر آگئی۔ مسٹر سمٹھ نے لوشیا کے بارے میں اند ساری معلومات حاصل کر لیں۔ پھر ایک روز اس نے لوشیا کے باپ کو ترقی دے کر فورین بنا دیا۔ اپنے گھر چلے پر بلایا۔

لوشیا کا باپ سمٹھ کی دعوت پر اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر آیا۔ لوشیا نے اگرچہ سادہ سا لباس رکھا تھا۔ مگر وہ بلاک جاذب نظر اور حسین لگ رہی تھی۔ چائے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں لکھنویوں سے لوشیا کو دیکھتا رہا۔ وہ بڑے سلیقے سے پیالی میں چائے ڈال کر چھ ہلا رہی تھی۔ وہ نور سلیقہ مندی اور اچھے آداب سے بڑا متاثر ہوا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ غریبی میں بھی اسے بڑی تربیت دی گئی ہے۔ چائے کے بعد مسٹر سمٹھ لوشیا اور اس کے باپ کو اپنی گاڑی میں خود گھر چھ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد لوشیا کے باپ کو شفٹ انچارج بنا دیا گیا۔ لوشیا کو بھی ترقی مل گئی۔ وہ غریب وارے سے نکل کر متوسط طبقے کی ایک صاف ستھری آبادی میں آگئے۔

آخر ایک دن مسٹر سمٹھ نے لوشیا کے باپ کو ایک اعلیٰ ترین ہومل میں کھانے پر بلایا اور امداد عایان کر دیا۔ مسٹر سمٹھ نے کہا:

» میں لوشیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے شاید آج تک اسی لئے شادی نہیں کی کہ ایسی لڑکی کا انتظار تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں لوشیا کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ «

لوشیا کے باپ نے کہا:

”دیکھو مارتھا! یہ ہے میرے خوابوں کی تعبیر۔ یہ ہے وہ مکان جس کی تلاش میں، میں ساری دنیا میں ماری
بھری تھی۔ بس اب باقی عمر اسی مکان میں بسر ہوگی۔“

مارتھانے ایک گہرا سانس بھر کر درختوں میں گھری ہوئی گرین ہاؤس کی پرانی، ٹوٹی پھوٹی نیم شکستہ
مارت کو دیکھا اور پھر اس کے گیٹ کے زنگ لگے تالے کو انگلی سے پھونک کر ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔
”ہیگم صاحبہ! یہ تو مجھے پرانے زمانے کی کوئی بیل معلوم ہوتی ہے۔ خدا کے لئے یہاں رہنے کے خیال

ل سے نکال دیجئے اور کوئی دوسرا مکان دیکھئے۔“

لوشیانے کہا: ”نہیں مارتھا! میں رہوں گی تو اسی مکان میں، نہیں تو ساری زندگی کسی مکان میں
قدم نہ رکھوں گی۔“

مارتھا خادمہ تھی۔ وہ اپنی مالکن کے آگے کیسے بول سکتی تھی۔ ہیگم صاحبہ کے حکم کے آگے سر جھکا کر خاموش
رہی۔ ویسے وہ لوشیا کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لوشیا جس بات کے بارے
ایک بار فیصلہ کرے وہ اس پر اڑ جاتی ہے اور پیچھے نہیں ہٹتی۔ ہر چند کہ خادمہ مارتھا گرین ہاؤس
آئے کچھ نہ بھائی تھی، پھر بھی وہ لوشیا کے ساتھ وہاں رہنے پر اپنے آپ کو تیار کرنے لگی تھی کیونکہ اسے معلوم
اب باقی عمر اسی پر اسرار بے ڈھنگے مکان میں رہنا پڑے گا۔ لوشیانے خادمہ کو اپنے ساتھ گاڑی میں
مایا اور سیدھی قصبے کی کیٹی کے دفتر میں آگئی۔

مائیکل اس کلرک کا نام تھا جو کیٹی اور کارپوریشن کی متروکہ املاک کے بارے میں کام کرتا تھا۔ یہ
بچی عمر کا گنچہ سا انگریز تھا جو امریکنوں کی طرح چاق و چوبند اور پھر تھلا تھا۔ وہ تھا تو انگریز لیکن اپنا
ایک ایسے امریکی خاندان سے جوڑتا تھا جو کبھی میکساس میں تیل کے کنوؤں کا مالک تھا لیکن پھر اہل
ایگیا۔ اس نے جب معلوم کیا کہ ایک امریکن کرورٹیٹی کی بیوہ اس سے ہاتھ ملارہی ہے تو وہ اپنی کرسی
سے اچھل پڑا۔ اور جیب سے رو مال نکال کر کرسی جھاڑتے ہوئے جھجک کر بولا:

”تشریف رکھیں! ہیگم صاحبہ! میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ میرے اس ٹوٹے پھوٹے دفتر میں
زلیف لائیں۔ آپ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوگی کہ میں میکساس کے مشہور کسبل خاندان سے ہوں جو
مائیکل بادشاہوں کا خاندان تھا لیکن گردش زمانہ کے ہاتھوں منتشر ہو گیا۔ فرمائیے میں آپ کی کیا
مدد کر سکتا ہوں۔“

بھائیوں، ان کے بچوں اور دوسرے متعلقہ رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے بعد بھی لوشیا کو اپنی
جائیداد مل گئی تھی کہ وہ ساری زندگی آرام سے گزار سکتی تھی۔ دولت بے پناہ تھی اور وہ خود اکیلا
تھی۔ اس نے شہر میں کئی ایک ہسپتال اور رہائشی ادارے بنائے اور انہیں ہر سال بڑی بڑی فیس
ملنے لگیں۔ لوشیا کا دل اب کارخانے کے جھمیلوں اور کاروبار کی الجھنوں سے اکتا چکا تھا۔ وہ چاہتی
تھی کہ باقی زندگی کسی پرسکون جگہ پر لکھنے پڑھنے میں گزار دے۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سمندر کے کنارے کسی ایسے تنہا کالٹیج میں جا کر بس جائے جہاں اسے کوئی
لئے نہ آئے۔ بس وہاں بیٹھ کر وہ ناول پڑھا کرے اور ناول لکھا کرے اس کے اندر ایک ناول اپنی زندگی کا
لکھنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ لوشیانے کسی ایسے ہی پرسکون مقام کی تلاش شروع کر دی۔ وہ
ہوائی جہاز میں سفر کرتی ہوئی جگہ جگہ گئی لیکن کوئی بھی مقام اس کے دل کو نہ لگا۔ اس کے دل
میں کسی خیالی پر اسرار و مانوی مکان کی تصویر تھی۔ ایک ایسا مکان جو سمندر کے کنارے ہو اور
سوسال پرانا ہو۔ اس کے ساتھ شادی کرنے پر کئی ایک نوجوان تیار تھے۔ مگر لوشیانے ایک پرلر
کالفرنس میں سب کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ اب ساری زندگی شادی نہیں کرے گی اور اپنی بازا
زندگی کسی پرفضا خاموش مقام پر لکھنے پڑھنے میں بسر کر دے گی۔ لوشیا اپنی خادمہ مارتھا کے ساتھ
تلاش سکون میں گھومتی گھومتی انگلستان بھی آگئی۔ یہاں اس نے ان علاقوں کا دورہ شروع کر دیا
جو سمندر کے کنارے واقع تھے۔ ایک روز اپنی روزمرائیں میں وہ پھرتے پھرتے گرین ہاؤس کے
سامنے سے گزری تو اچانک اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔

جس چیز کی اسے تلاش تھی، وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔
”مارتھا! مل گیا!“

جسٹی خادمہ نے جلدی سے پوچھا۔
”کیا ہیگم صاحبہ۔“

”میرے خوابوں کا گھر۔ دیکھو وہ سامنے دیکھو!“

جسٹی خادمہ نے بڑے غور سے مکان کو دیکھا۔ لوشیا گاڑی ڈرائیور کے گرین ہاؤس کے
گیٹ کے سامنے آگئی۔ گاڑی سے اتر کر وہ مارتھا کے ساتھ گرین ہاؤس کے آہنی دروازے پر اگلی

لوشیا اس گنجے پھر تیلے اور چرب زبان کلرک کی باتوں سے بڑی محظوظ ہوئی۔ وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنی سونے کے فریم والی ٹھنڈی عینک اتار کر بولی۔

”یہ بتائیے کہ گرین ہاؤس کس کی پراپرٹی ہے؟“

کلرک مائیکل اس وقت اپنی دراز میں سے قلم اور دو دات نکال رہا تھا۔ گرین ہاؤس کا نام سننے ہی اس کا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا:

”گرین ہاؤس۔ وہ۔ وہ بھوت۔ میرا مطلب ہے گرین ہاؤس۔“

”ہاں ہاں۔ میرا مطلب اس تنہا گھر سے ہے جو یہاں سے دور مندر کی بھوری پٹانوں کے غقبہ میں چڑھ کے گنجان درختوں میں خاموش کھڑا ہے۔“

مائیکل نے سر کھاتے ہوئے کہا:

”وہ۔ وہ اس وقت کمیٹی کی ملکیت میں ہے۔ فرمائیے آپ کی شکایت کیا ہے؟“ مائیکل یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کو روپتی بیوی کو ضرور وہاں سے گذرتے ہوئے کوئی حادثہ پیش آیا ہوگا۔ گرین ہاؤس کے بھوت نے ضرور اسے بھی تنگ کیا ہوگا۔ لوشیا نے مسکراتے ہوئے کہا:

”مجھے کوئی شکایت نہیں اس دو منزلہ مکان سے۔“

گنجے مائیکل نے رک رک کر پوچھا:

”تو پھر۔۔۔ میرا مطلب ہے پھر آپ گرین ہاؤس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

لوشیا نے کہا:

”میں اس دو منزلہ عمارت کو خریدنا چاہتی ہوں۔“

”خرید۔۔۔ خیر۔۔۔ میرا مطلب ہے کیوں؟“

”میں وہاں رہنا چاہتی ہوں۔“

گنجے مائیکل نے اپنی کہنی میز پر لٹا رکھی تھی۔ اس کی کہنی میز پر سے پھسل گئی اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس کی آنکھوں کے اندر نسواری رنگ کے ڈیلوں نے گول گول گردش کی اور پھر اپنی جگہ پر واپس آکر حسرت بھری اور حیرت بھری نگاہوں سے کروڑ پتی امریکی بیوہ کو نکلنے لگے۔

”محترمہ! آپ نے اس ملک میں اتنی ڈھیر سادی خوب صورت جگہوں کے ہوتے ہوئے اس

نا ہاؤس کو کس لئے پسند فرمایا؟“

لوشیا نے بڑے آرام سے سانس بھر کر کہا:

”اس لئے کہ مجھے گرین ہاؤس پسند آ گیا ہے۔ میں کیلے فرنیچے ہوئی آئی لینڈ، جاپان، ہانگ کانگ، ام، برما، آسٹریلیا اور یورپ کے خوب صورت شہر میں اپنے رہنے کے لئے کسی پرسکون اور اپنی

مذہب کے مکان کی تلاش میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ کیلئے اس مکان کے دام کیا ہیں؟“

گنجے مائیکل ایک بار گھبرا کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ایک چکر لگایا۔ اپنے گنجے سر پر پھیرا پھر دونوں ہاتھ میز پر لٹا کر لوشیا کو بخور سے دیکھا اور واپس اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ لوشیا

کہا:

”معاف کیجئے، آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔“

گنجے کلرک ایک بار پھر اٹھا۔ پھر بیٹھ گیا اور میز پر لوشیا کی طرف جھک کر بولا۔

”محترمہ! اس دو منزلہ مکان میں ایک بھوت رہتا ہے۔“

”بھوت!“ کالی مشن مارتھا کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی اور وہ بے ہوش ہوتے ہوئے رہ گئی۔

ا تو پہلے ہی اس بے ڈھنگے پرانے مکان سے نفرت کرتی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ اس میں کوئی بھوت

نہ ہے۔ وہ تو سرے پاؤں تک کانپ اٹھی۔

”بیگم صاحبہ! خدا کے لئے اس مکان کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔“

”ہوش کرو مارتھا۔ تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟“

لوشیا کی ڈانٹ پر مارتھا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ لوشیا نے گنجے کلرک مائیکل کی طرف متوجہ ہو کر

اس سے پوچھا کہ گرین ہاؤس میں کون سا بھوت رہتا ہے۔ گنجے مائیکل نے اٹھ کر کمرے میں ہاتھ

لگے رکھ کر بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ پھر میز پر جھک کر لوشیا کو بتایا کہ گرین ہاؤس میں کسی

بڑی جہاز کے کپتان کا بھوت رہتا ہے۔ جو سو ڈیڑھ سو برس پہلے ایک سمندری طوفان میں اپنے

ہزار سمیت غرق ہو گیا تھا۔

”یہ مکان اسی نے بنوایا تھا۔ تب سے لے کر اب تک اس دو منزلہ عمارت میں کپتان کا بھوت رہتا

ہے۔ وہ تین آدمیوں کو ہلاک کر چکا ہے، طوفانی راتوں میں اس کے چہنچہ چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔“

رہ گیا۔ ایک بار تو اسے شک ہوا کہ شاید یہ کروڑپتی بیوہ پاگل ہے پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ میں بھی امریکی ہوں۔ امریکی پاگل نہیں ہوتے۔ رات کے کھانے پر سودا ملے ہو گیا۔

کروڑپتی بیوہ لوشیانے گرین ہاؤس کی دو منزلہ سوسالہ پرانی عمارت خریدی اور اس کی قیمت نقد ڈالروں میں ادا کر دی۔ گنجے مائیکل نے پچھلے کا قتلہ کھاتے ہوئے لوشیا کی طرف جھک کر اپنی ٹینک ناک کے بانے پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا،

”محترمہ! کیا واقعی آپ گرین ہاؤس میں رہ لیں گی؟“

”میرا خیال ہے، مسٹر مائیکل اب ہمیں اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ مرغ کا شور بہ بھی لیجئے ناں۔“

”شکریہ شکریہ۔“

گنجے کلرک مائیکل بڑی خاموشی سے مرغ کا شور بہ پینے لگا۔ دوسرے روز لوشیا اپنی خادمہ مارتھا کے ساتھ موٹریں بیٹھ کر گرین ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئی۔ گرین ہاؤس کے پرانے رنگ آلود تالے کی اسے ایک پرانی رنگ آلود چابی دی گئی تھی۔ لوشیانے گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی کی۔ اور اپنے ساتھ لائے ہوئے مستری سے کہا کہ وہ چابی لگا کر تالا کھولے۔ مستری رنگ سے بھری ہوئی سیاہ رنگ کی چابی گیٹ کے تالے میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ تالا الگ کر کے اس نے زور زور سے دھکے لگا کر گرین ہاؤس کے گیٹ کو کھولا۔ صرف آدھا گیٹ ہی کھل سکا۔ باقی آدھا گیٹ زمین میں اگی ہوئی گھاس میں دب گیا تھا۔ لوشیانے اسے ہدایت کی کہ آج ہی آدمیوں کو بلا کر گھاس وغیرہ کاٹ کر باغ کی ساری جگہ صاف کر دی جائے۔ وہ باغ کی اجڑی ہوئی روشیں پر سے گزر کر گرین ہاؤس کے لکڑی کے براؤن رنگ کے پرانے دروازے پر آئی۔ جہشی خادمہ مارتھا پیچھے ٹڈی ڈری سی چلی آ رہی تھی۔ گنجے کلرک مائیکل ڈر کے مارے نہیں آیا تھا۔ اس نے نہ آنے کا کوئی بہانہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ وہ دوپہر کو رجسٹری کے کاغذات لے کر پہنچ جائے گا۔ حقیقت میں وہ چاہتا تھا کہ مکان میں داخل ہونے پر بھوت نے جو شور مچا دیا تھا اسے وہ مجھے تو جاؤں۔

گرین ہاؤس کا دروازہ کھول کر سب سے پہلے لوشیا اندر داخل ہوئی۔ اس کے بعد مارتھا اور

اندھیری راتوں میں اس کی ایسی کھڑکیوں پر کوئی ہم تنی جلا کر ادھر ادھر چکر لگاتا ہے۔ کیا آپ اب بھی عمارت کو خریدنا پسند کریں گی؟

گنجے مائیکل کا خیال تھا کہ کروڑپتی امریکی بیوہ یہ سن کر بھاگ جائے گی۔ مگر جب لوشیانے اپنا پرزور آواز میں مسکرا کر کہا،

”ہاں! میں یہی مکان خریدنا پسند کروں گی۔“

تو گنجے کلرک ایک بار پھر کرسی پر سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے آواز میں سے پائپ نکالا اور اس کی حالت میں اسے تمباکو کے بغیر ہی سلگانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے جیب میں سے تمباکو نکالا اور پائپ میں بھرنے لگا۔ اس کے ہاتھ پکپکا رہے تھے یہی حالت جہشی خادمہ مارتھا کی تھی مگر د اپنی مالکن کے ڈر سے دہکی بیٹھی تھی۔ لوشیانے کہا

”میں قصبے کے سب سے بڑے ہوٹل گرینڈ می ٹھہری ہوئی ہوں۔ میں خوش ہوں گی۔ اگر آپ رات کھا نا میرے ساتھ کھالیں اور وہیں رجسٹری وغیرہ بھی ہو جائے گی۔“

کروڑپتی بیوہ کے ساتھ کھانے کی دعوت کا سن کر گنجے کلرک خوشی سے کھل اٹھا۔ پائپ بار بار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا،

”بیک صاحبہ! یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ میں آج رات آپ کے ہاں کھا نا کھاؤں گا۔ میں خود ایک نہایت اونچے امریکی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس قسم کی دعوتوں کو ترس گیا ہوں یہ لوگ ہمارے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ میں ضرور حاضر ہوں گا۔“ لیکن — پھر اس لوشیا کی طرف جھک کر کہا۔ ”لیکن میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ آپ اس عمارت کا خیال دل سے نکال دیں۔“

لوشیانے کہا، ”مسٹر مائیکل! میں اپنے ارادے کی پکی عورت ہوں۔ میں جب کسی شے کے بارے میں فیصلہ کر لیتی ہوں تو پھر اس پر ڈٹ جاتی ہوں۔ میں آج شام کھانے پر آپ کا انتظار کروں گا رجسٹری کے کاغذات ساتھ لانا نہ بھولے گا۔ میں گرین ہاؤس خرید کر اس کی ادائیگی فوری طور پر نقد ڈالروں میں کر دوں گی۔ خدا حافظ۔“

لوشیا خادمہ کو ساتھ لے کر چلی گئی اور گنجے مائیکل منہ میں پائپ تھا مے بت بنا دے دیکھتا ہ

”آپ گاؤں جا کر کچھ آدمی ساتھ لائیں۔ میں ان سے اس سارے گھر کے کمروں کی صفائی کرانا چاہتی ہوں۔“

مستری نے سرگھبائے ہوئے کہا:

”بیگم صاحبہ۔ مجھے افسوس ہے۔ گاؤں کا کوئی آدمی بھی اس پراسرار مکان میں داخل ہونے کی جرات نہ کرے گا۔ میں خود گھر رہا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے اجازت ہی دے دیں۔ میں چار بچوں کا باپ ہوں۔ ابھی مجھے کچھ دیر زندہ رہنا چاہیے۔ خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر مستری چلا گیا۔ مارتھا اپنی مالک کو کھنکھاتی گئی۔

”بیگم صاحبہ۔ بڑا طوطا چشم آدمی تھا یہ۔ مگر وہ بھی سچا تھا۔ اس گھر سے سبھی ڈرتے ہیں۔“

لوشیانے کہا۔ ”تم تو نہیں گھبرا رہی ہوناز؟“

حبشی خادمہ نے اپنے سیاہ خام چہرے پر سفید سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں مالک ہرگز نہیں۔ آپ کے ساتھ مجھے ڈر نہیں لگتا۔“

اصل میں مارتھا بھی اندر سے سخت ڈر رہی تھی کہ جانے کب بھوت ان پر حملہ کر دے۔ اگرچہ

ابھی تک اس نے اپنی ایک بھی نشانی نہیں دکھائی تھی۔ تاہم اس کے کسی وقت بھی ظاہر ہونے کا خطرہ

سر پر بدستور منڈلا رہا تھا۔ لوشیانے کہا کہ وہ خود مل کر سارے گھر کی صفائی کریں گی۔ چنانچہ وہ جھاڑ

پونچھ میں مصروف ہو گئیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ کپتان کے بھوت نے ابھی تک ان کے کسی کام میں

مداخلت نہیں کی تھی یا تو وہ اس گھر میں نہیں تھا اور سر سپاٹے کے لئے باہر گیا ہوا تھا اور یا وہ بڑی

خاموشی سے اس تبدیلی کا جائزہ لے رہا تھا۔ دوپہر تک مارتھا نے لوشیا کے ساتھ مل کر ڈرائنگ روم

بیڈ روم اور ایک سائیڈ روم کی صفائی کر دی تھی۔ دوسری منزل کے دوسرے کمرے اسی طرح

بند پڑے تھے۔ لوشیا کو ابھی ان کمروں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ باورچی خانے کی بھی جھاڑ پونچھ کر

کر دی گئی۔ یہاں پرانی طرز کا ایک بڑا سا چوبہانا تھا۔ قریب ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹی

ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ بجلی اس دو منزل عمارت میں نہیں لگی تھی۔ لوشیانے مارتھا سے کہا۔

”گنجہ کلرک مائیکل آئے تو اُسے کہیں گے کہ مکان ہمیں بجلی لگا کر دے۔ بجلی اور گیس کے بغیر ہمارا

گزارہ نہیں ہو سکتا۔ باورچی خانے میں ہم کب تک لکڑیاں جلاتے رہیں گے۔“

پھر مستری اندر آیا۔ مستری بھی گھبرا رہا تھا۔ اس نے بھی بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ اس عمارت میں کپتان کا بھوت رہتا ہے۔ جو تین آدمیوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ ڈرائنگ روم گھر سے بھرا تھا۔ پرانے وکٹورین عہد کے فرنیچر پر گر دی تہہ جہی تھی۔ کارنس پر ایک بحری جہاز کا ماڈل پڑا تھا۔ زمین پر تالین بچھا تھا جو گر کر آلود تھا۔ کارنس کے اوپر ایک بحری کپتان کی تصویر تھی۔ یہ کپتان بڑا وجیہ اور باوقار شخصیت کا مالک تھا۔ تیکھی ناک، چمکیلی نیلی آنکھیں، ہر ادن رنگ کی پھوٹی سی ڈاڑھی اور سر پر سمندری کپتانوں والی ٹوپی۔ لوشیانے بڑے شوق سے اس تصویر کو دیکھا اور مستری سے پوچھا:

”یہ کس کی تصویر ہے؟“

مستری نے کہا۔ ”یہی وہ کپتان ہے میڈم جو کبھی اس گرین ہاؤس کا مالک تھا۔“

لوشیانے مسکرا کر کہا۔ ”اب سبھی۔ تو کیا اسی کپتان کا بھوت یہاں لوگوں کو تنگ کرتا پھرتا ہے دیکھو

گی۔ جب یہ بھوت مجھے تنگ کرے گا۔“

مستری اور مارتھا ہم گئے۔ لوشیانے انہیں حکم دیا کہ فرنیچر، تالین اور دوسری چیزوں کو صاف

کیا جائے۔ وہ خود بیڑھیاں چڑھ کر اوپر بیڈ روم میں آگئی۔ اُسے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا، اس

لئے کہ وہ ایک دلیر اور نڈر خاتون تھی۔ ویسے بھی چونکہ اسے یہ مکان بے حد پسند آگیا تھا، اس

لئے اس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ گرین ہاؤس کے بھوت سے مقابلہ کرے گی۔ مگر اس کے

آگے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔ وہ گرین ہاؤس میں باقی زندگی بسر کرنے کا عزم سے کرا آئی تھی۔ بیڈ روم

میں ایک بہت شاندار گدتوں والا پلنگ تھا جس کا فریم کانسی کا تھا۔ پلنگ کی چادروں پر بھی

گرود کی موٹی تہہ چڑھی تھی۔ تپائی پر زرد چینی کا ایک منہ ماتہ دھونے والا جگ اور زرد رنگ

کا تسلا پڑا تھا۔ بیڈ روم کی جو کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی، وہاں میز پر ایک لمبی دور بین رکھی

تھی۔ شاید سمندر میں آنے والے جہازوں کو دور سے دیکھنے کے لئے۔ لوشیانے دور بین میں سے

سمندر کی طرف دیکھا۔ سمندر میں دور آسمان کے کناروں تک ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ آتش

میں خدا جانے کب کی آگ جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ کمرے میں ٹھنڈک تھی۔ کارنس پر ایک شمع دان پڑا

تھا جس میں جلی ہوئی آدھی موم تہی لگی تھی۔ لوشیانے آگئی۔ اس نے مستری سے کہا:

لوشیا نے رجسٹری کے کاغذات کلرک سے لے کر الماری میں رکھ لئے۔

”آپ کیا یہیں گے مسٹر مائیکل؟ کافی یا چائے؟“

”کافی — کافی ہی ٹھیک رہے گی۔“

گنجے کلرک نے رومال سے گردن پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔ وہ گھبرا رہا تھا۔ اسے پکا یقین تھا کہ باغ میں بھوت نے ہی ٹانگ اڑا کر اسے گرا دیا تھا۔ وہ اب اس گھر سے جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن کروڑپتی امریکی بیوہ کی حسین صحبت بھی اسے بہت پسند تھی۔ وہ اتنی جلدی اس سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کافی کی چسکی لیتے ہوئے گنجے کلرک نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد لوشیا سے پوچھا:

”دیکھ صاحبہ! بھوت نے تو آپ کو نہیں ستایا؟“

لوشیا قہقہہ لگا کر منہں بڑی۔

”مسٹر مائیکل! ابھی تک تو کسی بھوت دوت سے میری ملاقات نہیں ہوئی، ہاں اگر اس نے شرف ملاقات بخش دیا تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ دونوں کی یہ بڑی اہم اور دلچسپ ملاقات ہوگی۔“

”کمال ہے۔ کمال ہے۔“ آپ بڑی بہادر خاتون ہیں۔ امریکی بڑے دیر ہوتے ہیں۔ میں بھی امریکی ہوں۔ ٹیکساس میں میرے پردادا کا تیل.....“

اور گنجے مائیکل کوئی سترہویں باری اپنا امریکی شجرہ نسب کھول کر بیٹھ گیا۔ لوشیا نے مارتھا سے کہا کہ باورچی خانے میں جا کر فروٹ لیک لے آئے۔ مارتھا نے سر پر سفید ٹوپی اور گلے میں سفید فرل والا اپر پہن رکھا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی سر جھکا کر باورچی خانے کی طرف آگئی۔

باورچی خانے کی الماری سے فروٹ لیک نکال کر اس نے میز پر رکھا اور خود میز کے دراز میں بے تھک کر چھری تلاش کرنے لگی۔ چھری ہاتھ میں لے کر وہ لیک اٹھانے لگی تو لیک وہاں نہیں تھا۔ بڑی بڑی سفید آنکھیں کھول کر اس نے گھوم کر دیکھا۔ لیک دوسرے میز پر پڑا تھا۔ وہ سر جھکا کر فروٹ لے لگی کہ اس نے لیک پہلے میز پر رکھا تھا۔ یہ دوسرے میز پر کون لے گیا؟ ہمیں یہ کارستانی بھوت کو تو نہیں؟ گھبرا کر اس نے جلدی سے فروٹ لیک اٹھایا اور باہر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ مائیکل لوشیا کو ابھی تک اپنے امریکی آباؤ اجداد کے بارے میں بتا رہا تھا۔ فروٹ لیک دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا۔

”فروٹ لیک میری دادی بہت اچھا بنایا کرتی تھی۔ میری بڑی بہن بھی کمال کا فروٹ لیک بناتی

اتنے میں باہر موٹر کے مارن کی آواز سنائی دی۔ کلرک مائیکل اپنی پرانی پھٹی چری موٹر خود چلا کر چلا آ رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اس نے ہیڈ کا کچھ کر رکھا تھا۔ گرین ہاؤس کے بڑے آہنی گیٹ کے باہر ہی اس نے گاڑی کھڑی کر دی۔ کھڑکی میں لوشیا کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ مائیکل نے ہاتھ ہلا کر مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ پھر اس نے گھبراہٹ کے انداز میں ایک جیب میں سے پائپ نکالا۔ اسے سلگانے کے خیال کو ملتوی کر کے دوسری جیب میں ڈالا۔ رومال سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کر کے گاڑی سے اتر کر گرین ہاؤس کے اجڑے ہوئے ویران باغ میں داخل ہو گیا۔ وہ بھوت کے خیال سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ مگر لوشیا پر وہ اپنے خوف کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس پر اپنی دوسری اور بہادر سی کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ گنجے کلرک ایک بھاڑی کے پال بھینچا تو جیسے کسی نے اس کے آگے ٹانگ کر کے اسے زمین پر لٹا کر دے مارا۔

گنجے کلرک کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی گئی۔ وہ کپڑے بھاڑ کر اٹھا اور پیچھے بھگنے ہی والا تھا کہ سامنے سے لوشیا آتی دکھائی دی۔

”مجھے بہت افسوس ہے مسٹر مائیکل کہ آپ گر پڑے۔ کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“

”جی نہیں۔ شکریہ شکریہ۔ گھاس پر سے پھسل گیا تھا۔“

گنجے کلرک نے مسکراتے کی زبردستی کوشش کی اور ہلکاتے ہوئے کہا۔ لوشیا اسے اپنے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ یہاں ہر شے اب صاف ستھری اور چمک دار ہو گئی تھی۔ مائیکل نے ہنس کر کہا:

”نیا مکان مبارک ہو خاتون! آپ نے تو بڑی جلدی اسے صاف ستھرا کر لیا۔ اس مکان میں تو صدیوں کی گرد چڑھ چکی تھی۔“

لوشیا بولی۔ ”جی ہاں۔ ابھی اس کی مرمت وغیرہ بھی کرنی ہوگی۔ صفائی تو صرف ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی ہے ابھی۔“ تشریف رکھیں مسٹر مائیکل! کیا آپ کاغذات لے آئے ہیں؟“

”جی ہاں! جی ہاں! یہ لے لیجئے۔ یہاں دستخط کر کے اس کی ایک کاپی آپ اپنے پاس رکھ لیں۔ دوسری کاپی کمیٹی کے ریکارڈ میں محفوظ رہے گی۔“

”دفع ہو جاؤ بد بخت چو ہے۔“

ایک روز کی دھپ گنچے کلرک کے سر پر پڑی۔ اس کا ہیٹ پچک گیا اور وہ دہائی دیتا تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنی سٹارٹ کر دیا اور اسی میل کی رفتار سے وہاں سے رُو جھک ہو گیا۔ دوپہر گزر گئی، شام ہو گئی۔ لوشیانے ڈرائنگ روم میں اپنے کپڑوں کا صندوق کھولا اس میں سے کپڑے نکال نکال کر الماری میں رکھ رہی تھی۔ مارتھا باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ گنچے کلرک نے وعدہ کر لیا تھا۔ کہ وہ بہت جلد باورچی خانے میں گیس بھی لگوا دے گا اور بجلی کا بند دہست بھی کر دے گا۔ شام کو سمندر کی طرف سے سرد ہوا چلنے لگی۔ سمندر کی طرف سے سرد ہوا چلنے لگی۔ سمندر کی طرف کھلنے والی تمام کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ لوشیانے مارتھا کو کمرے کا جھاڑو روشن کرنے کے لئے کہا۔ اس پرانے جھاڑیں کوئی پیاس کے قریب موم بتیاں لگی تھیں۔ مارتھانے دیا سلائی جلائی ہی تھی کہ وہ بچھ گئی۔ جشی خادمہ گھبرا کر لوشیا کے پاس آئی۔

”مرگیم صاحبہ! دیا سلائی نہیں جل رہی۔“
 ”وہ کیسے نہیں جل رہی۔ لاؤ میری طرف۔“
 لوشیانے دیا سلائی جلائی تو وہ جلنے لگی۔

”تم تو یونہی گھبرا ہی ہو مارتھا۔“ جواؤ اب فالوں روشن کر دو۔“

مارتھانے ڈرتے ڈرتے دیا سلائی رگڑی تو وہ جل اٹھی۔ اس دفعہ اسے کسی نے پھونک مار کر نہ بچایا۔ فالوں روشن کر کے چھت کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ سویرس کے بعد پہلی بار گاؤں کے لوگوں نے گرین ہاؤس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر پوری روشنی دیکھی۔ گاؤں میں یہ بات تیزی سے پھیل گئی تھی کہ گرین ہاؤس کسی کروڑپتی امریکی بیوہ نے خرید لیا ہے اور وہ خود اس میں رہنے کے لئے آگئی ہے۔ لوگ خوش بھی تھے کہ چلو ایک ویران بھوت گھر آباد ہوا۔ شاید اس طرح سے بھوت وہاں سے چلا جائے۔ اور ان کی جان عذاب سے چھوٹے اور انہیں اندیشہ بھی تھا کہ کہیں یہ امریکی بیوہ بھوت کے انتقام کا شکار نہ ہو جائے۔ اب گاؤں والوں نے دو گرین ہاؤس کی کھڑکیوں پر روشنی دیکھی تو بس دیکھتے ہی رو گئے۔

رات کا کھانا لوشیانے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ کر کھایا۔ ابھی ڈرائنگ روم گندہ تھا اور اس

تھی لیکن.....

جشی خادمہ نے کہا۔

”ابھی ابھی میں نے باورچی خانے میں میز پر کلک دکھا تو وہ غائب ہو گیا اور.....“

اتنا سنا تھا کہ گنچے کلرک کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک کانگڑا اچھل کر دوڑ جا کر۔ وہ جیب رومال نکال کر ہاتھ صاف کرنے لگا اور کھڑے ہو کر بولا۔ ”اچھا بیگم صاحبہ! مجھے اجازت دیں۔ کل وقت حاضر ہوں گا۔“

لوشیانے کہا۔ ”ارے مسٹر مائیکل! آپ نے تو کافی بھی پوری نہیں پی۔“

”شکریہ بیگم صاحبہ! کل پی لوں گا باقی کافی، خدا حافظ! خدا حافظ!.....“

گنچے کلرک مائیکل سر پر ہیٹ جمانے کی کوشش کرتے ہوئے گھبراہٹ کے عالم میں کمرے سے باہر نکلے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا لان میں سے گزرنے لگا۔ باورچی خانے میں گرین ہاؤس کا بھوت ظاہر ہو گیا تھا اور مائیکل کی جان گھبرا ہی تھی کہ کہیں بھوت اس پر حملہ نہ کر دے کیونکہ اس نے بھوت کا مار کر ڈرپتی بیوہ کے حوالے کیا تھا۔ وہ لان میں سے نکل کر گیٹ سے باہر آیا ہی تھا کہ جیسے کسی نے پیچھے زور سے دھکا دیا۔ مائیکل اچھل کر گھاس پر گر پڑا۔ اس کا ہیٹ پرے جا پڑا۔ عینک اتر گئی۔ وہ ہو کر ترا گھبرا کر اٹھا۔ ٹوپی سر پر رکھی۔ ناک پر عینک جائی اور ہاتھ اٹھا کر بولا:

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے اسے منع کیا تھا۔ میں بے قصور ہوں۔“

اسے معلوم تھا کہ بھوت اس کے سر پر آن پہنچا ہے۔ پھر اسے ایک تیز اور کڑخت آواز سنا

دی:

”تم کون ہوتے ہو۔ میرا مکان فروخت کرنے والے؟ تمہیں یہ سچی کس نے دیا؟ کیا تم جانا

نہیں ہو کہ یہ میرا مکان ہے۔ میں اس کا مالک ہوں؟“

مائیکل نے پہلی بار بھوت کی تیز، بھاری اور گھبرا آواز سنی تھی۔ وہ تھر تھر کا پینے لگا۔ اس ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”مسٹر سمیٹھ ضدی خاتون ہیں۔ میں نے بہت منع کیا مگر وہ اپنی بات پراڑی رہیں۔ میں بے

ہوں۔ مسٹر بھوت! میں بے گناہ ہوں۔“

”مٹر بھوت! تم جہاں کہیں بھی کھڑے ہو۔ ایک بات کان کھول کر سن لو کہ میں تمہاری ان
 زوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔“ تم چاہے جو کچھ کرو۔ میں اس گھر میں ہی رہوں گی۔ سمجھے؟
 لوشیا نے چوتھی بار موم بتی روشن کی تو اسے کسی نے نہ بجھایا۔ وہ پلنگ پر آرام کر نیم دراز
 پڑی اور پڑھنے لگی۔ اسے کتاب پڑھتے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ کمرے میں جیسے بھونچال سا آ
 ہا۔ اس کا پلنگ زور زور سے ہلنے لگا۔ وہ ایک دم سے پلنگ پر سے اچھل کر فرش پر آ گئی۔
 ش بالکل ساکت تھا۔ ظاہر ہے یہ کام بھی بھونچال کا نہیں بلکہ بھوت کا تھا۔ پلنگ ابھی تک
 رہا تھا اور اس کا سنہری فریم پیچ رہا تھا۔ لوشیا نے کہا:

”مٹر بھوت! تم مجھے پریشان نہیں کر سکتے۔ میں بڑے مضبوط اعصاب کی عورت ہوں۔ میں
 فزددہ نہیں ہوں گی۔“ لوشیا نے پہلی بار بھوت کی آواز سنی۔

”محترمہ! یہ گھر میرا ہے۔ میں اس گھر کا مالک ہوں۔ میں نے آپ کا بہت لحاظ کیا ہے آپ
 نے بہتر ہی یہی ہے کہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر صبح یہاں سے چلی جائیں۔“
 لوشیا نے غصے میں کہا:

”مٹر بھوت! تم کون ہوتے ہو، ایک زندہ انسان سے اس طرح باتیں کرنے والے تم بھوت
 ہو۔ میں زندہ انسان ہوں۔ تم مجھے شکست نہیں دے سکتے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے اور اب
 بھی کہتی ہوں کہ میں یہاں سے ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گی۔ اب جاؤ اور مجھے سونے دو۔“
 کپتان کے بھوت کی تیز آواز سنائی دی:

”آپ کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا محترمہ! آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ یہاں سے
 لی جائیں۔“

لوشیا نے پر عزم لہجے میں کہا:

”میں نے یہ مکان چھوڑنے کے لئے نہیں خریدا۔ میں نے اس لئے خریدا ہے کہ اس میں
 ماری زندگی بسر کروں گی۔ تمہیں میرے خلاف جو کرنا ہے کرو۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی،
 ٹیبا بجز۔“

لوشیا پلنگ پر کھیل لے کر لیٹ گئی۔ اس کا منہ کھل سے باہر تھا اور بڑے غور سے کمرے میں

قابل نہیں ہوا تھا کہ اس میں لوشیا بیٹھ کر کھانا کھا سکے۔ مارتھا نے بڑے مزے دار کھانے پکائے تھے۔
 لوشیا نے کہا:

”مارتھا! کہتے ہیں اس سمندری ساحل کی پھلیاں بڑی لذیذ ہوتی ہیں۔ کل مارکیٹ جا کر پھلیاں
 خرید کر لانا اور ان کے کباب بنانا۔“
 ”بہتر ہے بیگم صاحبہ۔“

کھانے کے بعد لوشیا کافی پیتے ہوئے شام کا اخبار پڑھتی رہی جو گاؤں میں رات کے پہلے پہر میں
 آجاتا تھا۔ اخبار میں کروڑ پتی بیوہ لوشیا کی تصویر چھپی تھی۔ ساتھ ہی گئے مایکل کی تصویر بھی چھپی تھی۔ نیچے
 خبر تھی جس میں لکھا تھا کہ کروڑ پتی امریکی بیوہ سمندر لوشیا سمٹھنے سے سوسالہ پرانا آسیبی گھر گرین ہاؤس خرید
 لیا ہے۔ لوشیا نے مارتھا سے کہا:

”دیکھو مارتھا! میرے ساتھ اس گنجانے ڈرپوک کلرک کی بھی تصویر چھپی ہے۔ تم کہاں بیٹھی تھیں۔ تمہارا
 تصویر بھی اتنی چلایئے تھی۔ اچھا میں گنجانے مایکل سے پوچھوں گی۔“
 مارتھا نے سفید امانتوں کی بھرپور نمائش کرتے ہوئے کہا:

”بیگم صاحبہ! میں اتنی کالی ہوں کہ شاید اخبار پر میری تصویر نہ آ سکے۔“

اور پھر خود ہی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ کچھ دیر اخبار پڑھنے کے بعد لوشیا اپنے بیڈروم میں اوپر
 چلی گئی۔ بیڈروم کو اچھی طرح سے صاف کر کے مارتھا نے سفید نئی نکور چادریں بچھادی تھیں۔ آتش دان
 میں آگ بھی روشن کر دی گئی تھی۔ کارنس پر شمع دان میں بڑی موم بتی جل رہی تھی جس کی سنہری روشنی
 سارے بیڈروم میں پھیلی ہوئی تھی۔ لوشیا پلنگ سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی اور کتاب پڑھنے لگی۔ سونے
 سے پہلے وہ ضرور کچھ نہ کچھ پڑھا کرتی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ ابھی اس نے چھ سات ورق ہی
 پڑھے ہوں گے کہ موم بتی ایک دم سے بجھ گئی۔ لوشیا نے چونک کر شمع دان میں کبھی ہوئی موم بتی میں
 سے دھوئیں کی پتلی می نکلیں اوپر اٹھ رہی تھی۔ لوشیا نے اٹھ کر دواسلائی سے موم بتی دوبارہ روشن
 کی اور پلنگ پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ موم بتی پھر سے بجھ گئی۔ صاف معلوم ہوا تھا کہ کسی نے اسے چونک
 مار کر بچھایا ہے۔ لوشیا نے تیسری بار شمع روشن کی۔ وہ پھر بجھ گئی اب تو لوشیا سمجھ گئی کہ یہ
 بھوت کی کارستانی ہے۔ اس نے اونچی آواز میں کہا:

چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے کپتان کے بھوت کو تلاش کر کے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ۱۰
کے بعد کپتان کے بھوت کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چلا گیا ہے۔ لوشیا نے پھر
کتاب پڑھنی شروع کر دی جب وہ تھک گئی اور اسے نیند آنے لگی۔ تو شمع دان میں جلتی موم جڑ
بجھانے کے لئے اٹھی۔ ابھی وہ پلنگ سے اٹھی ہی تھی کہ کسی نے پھونک مار کر موم بتی گل کر دی اور
ذرا مسکرائی اور بولی۔ ”مسٹر بھوت! تمہارا شکریہ!“

بھوت کی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ اچانک لوشیا نے منجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ ”مسٹر بھوت!
تم میں اتنی بھی شائستگی نہیں ہے کہ جب ایک شریف خاتون سونے لگے تو اس کے بیڈروم سے چلے جا
بھوت کی آواز بالکل نہ آئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیڈروم میں طاری رہی۔ پھر لوشیا
دیکھا کہ دروازہ اپنے آپ ذرا سا کھلا اور پھر اس زور سے بند ہوا کہ کارنس پر شمع دان کپکا اٹھا۔
ہنس پڑی اور پھر کبل اوڑھ کر سو گئی۔

صبح گرین ہاؤس کے لان کے درختوں میں چڑیوں کی گنجار کے ساتھ لوشیا کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑا
میں سے سفید سفید روشن دھوپ بیڈروم میں آ رہی تھی۔ لوشیا انگڑائی لے کر اٹھی اس نے اپنے عا
جسم پر پھیلے ہوئے ریشمی شب خوابی کے لباس کو درست کیا اور آئینے کے آگے بیٹھ کر بالوں میں برش
کرنے لگی۔ مارتھا اس کے لئے چائے کی پیالی لے کر آگئی۔ لوشیا نے اس سے پوچھا کہ رات کیسی گذری!
ڈرتھا کہ کہیں کپتان کے بھوت نے اسے بھی جا کر نہ ڈرایا دھمکایا ہو۔ اس کے الٹ مارتھا نے سفید دانہ
نکال کر کہا:

”میں تو گہری نیند سوئی رہی بیگم صاحبہ۔“

ناشتے کے بعد لوشیا لان میں آگئی۔ مارتھا نے بید کی سبز رنگ کی کرسیاں دھوپ میں ڈال
تپائی پر نہری رنگ کے سنگتروں سے بھری ہوئی سفید پلیٹ رکھ دی۔ لان کی جھڑیاں آگے آگے
صاف کر دی گئی تھیں۔ دھوپ بڑی چلیں اور گرم تھی۔ آسمان نیلا اور خوشگوار تھا۔ سمندر کی طرف
بڑی خنک اور نرم دار ہوا چل رہی تھی۔ لوشیا نے مارتھا سے کہہ کر اپنا ٹائپ رائٹر باہر ہی منگواد
اس کا خیال تھا کہ وہ خوشگوار نہری دھوپ میں بیٹھ کر اپنا ناول لکھنا شروع کرے گی۔ اس ناول
پلاٹ کئی دنوں سے اس کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ مارتھا نے کافی کی ایک پیالی لا کر اس کے پاس

رکھ دی۔ لوشیا نے سفید کاغذات رائٹر پر پڑھایا اور ابھی اس نے پہلی سطر ہی لکھی تھی کہ گونج کر ک
ایکل اپنی پچھڑکاریں اکں وار دہوا۔ صبح بخیر کہہ کر وہ کرسی کھینچ کر میز کے قریب ہو گیا۔ ہیٹ اتار کر
پیر پر رکھا اور سنگترہ اٹھا کر چھیلے ہوئے بولا:

”بیگم صاحبہ! آپ کیا لکھنے لگیں صبح صبح؟ کہیں میرے خلاف کوئی شکایت تو ٹائپ نہیں کر
ہیں؟“

لوشیا نے مسکرا کر کہا۔ ”میں اپنا ناول شروع کر رہی ہوں۔“

مائیکل بڑا غوش ہوا۔ ”بخدا بڑی اچھی بات ہے۔ ناول لکھنے کے لئے تو یہ جگہ بڑی آئیڈیل ہے
لال کی بات ہے کہ جب میں پہلی بار یہاں آیا تو میرا خیال بھی ناول لکھ کر روزی کمانے کا تھا۔ مجھے امید
ہے آپ یہاں اپنی زندگی کا بہترین ناول لکھ سکیں گی۔“

گنجنے مائیکل کی بے جا مداخلت سے لوشیا بور ہو گئی۔ مائیکل نے مارتھا کو آواز دے کر خود ہی کہا
کہ وہ اس کے لئے بھی کافی کی ایک پیالی لے آئے۔ لوشیا نے خندہ پیشانی سے ٹائپ رائٹر بند کر دیا۔
وہ اس بے ضرر سے مسخرے کلرک کو ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ وہ کس طرح آیا
ہے۔ مائیکل نے بتایا کہ اس نے گیس اور بجلی گوانے کا سارا انتظام کر دیا ہے۔ کل سے کار میکر لوگ اپنا
لام شروع کر دیں گے۔ لوشیا نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ گنجنے مائیکل نے دوسرا سنگترہ چھیل کر اس کی
ایک قاش منہ میں ڈالی ہی تھی کہ کسی نے ہاتھ مار کر سنگترہ ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ہڑبڑا گیا۔ سنگترہ گھا
بروزور جا گر۔ وہ سنگترہ اٹھانے کے لئے آگے کو جھکا ہی تھا کہ جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر زور سے لات
اری۔ مائیکل اور ندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ وہ خوفزدہ ہو کر اٹھا۔ اپنی ٹوپی گھاس پر سے اٹھا کر جھاڑی
اور سبھکا کر خدا حافظ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ لوشیا ہنستی رہ گئی۔ جب اس کی موٹر نظروں سے
اوجھل ہو گئی تو لوشیا نے ہوا سے باتیں کرنے کے انداز میں کہا:

”شکریہ مسٹر بھوت! — اب میں آرام سے اپنا کام کر سکوں گی۔“

بھوت کی بھاری اور چڑچڑی آواز سنائی دی۔

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں اس گھر میں رہنے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں تمہیں ایک
بھر پورا رنگ دیتا ہوں منہ سمجھ کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اس گھر سے واپس چلی جاؤ۔ نہیں تو

انجام کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی۔“
لوشیا غصے میں آکر بولی۔

”مسٹر بھوت! تم بار بار کی دھمکیاں دے کر مجھے ڈرا نہیں سکتے۔ میں بھی تمہیں آخری بار وارننگ دیتی ہوں کہ میرے معاملات میں دخل دینا بند کرو اور چپکے سے اس کے گھر اس کو نہ ملے جاکر سو جاؤ جہاں تم ایک سو برس سے سو رہے ہو۔ جاؤ اور اب مجھے کام کرنے دو۔“

بھوت نے کوئی جواب نہ دیا۔ مارتھا ٹھیک اس وقت کافی کی پیالی لے کر پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی سفید ٹیبلوں والی آنکھیں ہموں کی تھیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا اور پھر مالک سے پوچھا:

”میڈم! آپ کسی سے باتیں کر رہی ہیں؟“

لوشیا نے پلٹ کر مارتھا کو دیکھا اور مسکرا کر کہا:

”نہیں تو میں تو کسی سے باتیں نہیں کر رہی تھی۔“

مارتھا نے کہا۔ ”میڈم! میں نے خود آپ کی آواز سنی ہے۔ آپ کسی کو ڈرائٹ رہی تھیں۔“

لوشیا جلدی سے بولی۔ ”اوہ! دراصل میں ناول کے ایک کردار کی زبان سے مکالمے ادا کر رہی تھی۔ مجھے ناول لکھتے لکھتے بولنے کی عادت سی بڑھ گئی ہے۔“

مارتھا نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔ اسے لوشیا کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ بھوت کا خیال ایک بار پھر مارتھا کے دماغ میں پھرنے لگا تھا۔

”کیا مسٹر مائیکل چلے گئے؟“

”ہاں! نہیں جلدی جانا تھا۔ یہ کافی کی پیالی تم جا کر پی لو۔“

مارتھا کافی کی پیالی اٹھا کر سرکھینتی سے دائیں بائیں جھٹکتی مکان کے اندر چلی گئی۔ لوشیا نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد دروازہ بند آواز میں پوچھا۔

”مسٹر بھوت! کیا تم چلے گئے ہو؟“

بھوت کی آواز نہ آئی۔ ہاں دوسرے لمحے جیسے کسی نے زور سے پاؤں مار کر سنگتروں والی پیالی گرا دی۔ لوشیا ہنس دی۔

”میں جانتی ہوں، اب ستم جارہے ہو۔“

دوپہر کے کھانے تک لوشیا ناول لکھتی رہی۔ پھر کھانا کھانے اندر آ گئی۔ مارتھا نے اس دوران ڈرائنگ روم کی بجائے لوشیا کے اسے سجا بنا دیا تھا۔ لوشیا نے دوپہر کا کھانا ڈرائنگ روم میں ہی لیا۔ دوپہر کے بعد بجلی کا ایک انپکٹر یہ دیکھنے کے لئے آگیا کہ گرین ہاؤس میں کہاں کہاں بجلی لگوانی ہے مائیکل اس کے ساتھ ہی تھا۔ انپکٹر ڈرا ہوا تھا۔ اس نے گرین ہاؤس کے بھوت کے بارے میں بے شمار دُورے قصے سُن رکھے تھے۔ مگر لوشیا نے اُسے بھاری معاف شدہ دینے کا وعدہ کیا تھا جس کے لالچ میں وہ آگیا۔ میٹر روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ آتش دان کے پاس رکھا ہوا کڑھچا اپنے آپ اُپر اٹھا اور دھم سے کی پیٹھ پر پڑا۔ وہ چیخ مار کر میٹر روم سے بھاگ گیا۔ گننے مائیکل نے سنا تو وہ بھی گھبرا کر باہر آگیا۔

میں لوشیا نے انپکٹر کو ہتیرہ بھانے کی کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی اور اپنا فیتہ لیٹ کر نو دو گاہ لیا۔ گننے مائیکل نے ہیٹ اتار کر بڑے ادب سے کہا

”بیگم صاحبہ! اگر مسٹر بھوت کی یہی حرکتیں رہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اس مکان میں میں گیس اور بجلی نہ آسکے گی اور آپ کو باقی عمر موم بیٹوں کی روشنی میں بسر کرنی پڑے گی۔“

لوشیا نے مائیکل سے کہا کہ وہ کل کسی دوسرے انپکٹر اور کارکیروں کو لائے، وہ کوشش کرے کہ ایسا ناخوشگوار حادثہ پھر کبھی نہ ہو۔ مائیکل چلا گیا۔ لوشیا اسی وقت اپنے میٹر روم میں آئی اور نے کھڑکی کے پاس لگی ہوئی دو دریں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کہا:

”مسٹر بھوت! اگر تم نے اپنے رویے کی معافی نہ مانگی تو میں دُور میں ابھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی۔ میں جانتی ہوں۔ یہ تمہارے ٹوپیڑھ سو سالہ پرانے بحری جہاز کی یادگار دُور میں ہے اور تم اسے بادیہوت نہ دیکھ سکو گے۔“

میٹر روم کا دروازہ زور سے کھلا اور پھر بھوت کی بو بھل آواز سنائی دی:

”مسٹر سمیتھ! میں اگر چاہوں تو تمہارے ہاتھ سے بڑی آسانی سے دُور میں چین کر تمہیں کھڑکی سے ہر پھینک سکتا ہوں۔ مگر میں صرف تمہارے لئے ایسا نہ کروں گا۔ برائے مہربانی دُور میں کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دو۔“

لوشیا نے کہا۔ ”پہلے وعدہ کرو کہ تم میرے گھر میں آنے والے کاریگروں کو کچھ نہیں کہو گے۔“

”وعدہ کرتا ہوں۔“

”امی گھر میں تھا۔“

”پھر تم نے آواز کیوں نہیں دی؟“

”تم کس لئے آواز دیتا؟ مجھے ضرورت کیا پڑی ہے تمہیں بلانے کی۔ تم میری دوست نہیں بن ہو۔ تم نے میرے مکان پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ یہ میری مہربانی ہے کہ میں نے تمہیں نہیں کہا۔ کوئی اور ہوتا تو اُسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیتا۔“

لوشیا کا پارہ بھی ایک دم چڑھ گیا۔ اس نے فرش پر پاؤں مار کر کہا:

”کیپٹن جارج! تم بھی غور سے سن لو۔ میں بھی تمہیں اپنا دشمن سمجھتی ہوں۔ تم میرے دوست نہیں۔ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ فلا مجھے اٹھا کر سمندر میں پھینکنے کی کوشش تو کرو۔ خدا کی قسم نانی دکر دادوں گی۔“

”اوہ شٹ اپ۔“

اس کے ساتھ ہی کسی نے بڑے زور سے بیڈروم کا دواڑہ بند کر دیا۔ بھوت چلا گیا تھا۔ لوشیا تینک غصے میں ادھر ادھر ٹپکتی رہی۔ اس واقعے کو پھر دو ہفتے گزر گئے اور گرین ہاؤس کے بھوت پہلے جارج کی آواز پھر سنائی نہ دی۔ لوشیا نے اپنا ناول ختم کر لیا تھا اور اب وہ لندن جانے کی باریاں کر رہی تھی تاکہ وہاں ایک پبلشر کو جا کر اپنا ناول چھاپنے کے لئے دے۔ اس عرصے میں اسے ای بارگرین ہاؤس کے بھوت کا خیال آیا۔ ایک روز وہ ڈرائنگ روم میں کیپٹن جارج کی تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ جارج بڑا حسین اور پُر وقار شخص تھا۔ اگر زندہ ہوتا تو.... لوشیا کے گال شرم سے سرخ ہو گئے۔ کیپٹن جارج کی نیلی پراسرار آنکھیں لوشیا اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئیں۔ وہ باہر لان میں آگئی۔

موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ لان میں جگہ جگہ رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا میں پھولوں کی مٹھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مارتھا باورچی خانے میں رات کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی باورچی لانے کی کمر کی کے قریب سے گزرتے ہوئے لوشیا نے مارتھا سے کہا کہ وہ دروازے کے کنارے ٹپٹنے جا رہی ہے۔ لوشیا گرین ہاؤس کے لان سے گزر کر ساحل سمندر پر آگئی۔ سمندر کی لہروں پر کونکلیں لڑھکھوئیں ٹھنڈک تھیں مگر اس ٹھنڈک کو نہری دھوپ نے کافی حد تک اپنے اندر جذب کر لیا

لوشیا نے ہنستے ہوئے دور میں کھڑکی میں سے رکھ دی۔ بھوت کی بارعب آواز پھر گونجی۔ ”مگر میں یہ وعدہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ تمہیں اس گھر میں رہنے کی اجازت دوں گا۔ تم لوگوں نے اس گھر میں آکر میرے صدیوں کے سکون کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ آخر تم لوگ کسی دوسری جگہ کیوں نہیں چلے جاتے؟“

لوشیا بولی۔ ”اس لئے کہ مجھے یہ گھر پسند ہے۔ یہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اور اب تو مجھے تم بھی اچھے لگنے لگے ہو۔“

”شٹ اپ۔“

اس کے ساتھ ہی بیڈروم کا دروازہ زور سے جھنجھنا کر بند ہو گیا۔ بھوت چلا گیا۔ لوشیا ہنستی ہوئی نیچے آگئی۔ دوسرے روز گرین ہاؤس میں بجلی اور گیس آگئی۔ ایک ہفتے کے اندر اندرونی ٹیلیفون بھی لگ گیا۔ اس دوران میں کپتان کے بھوت نے وعدے کے مطابق کسی کو کچھ نہ کہا۔ اس نے لوشیا سے بھی کوئی بات نہ کی۔ لوشیا نے اپنا ناول اُدھے کے قریب لکھ لیا تھا۔ دو ہفتے گزر گئے کپتان کے بھوت کی آواز نہ آئی تو لوشیا بھی کچھ ادا اس سے ہو گئی ایک روز وہ شام کے وقت بیڈروم میں کھڑکی کے پاس بیٹھی چائے پتی رہی تھی۔ آتش دان میں ہلکی ہلکی آگ جل رہی تھیں۔ سمندر کی لہروں کو غروب ہوتی شام کی تاریخی روشنی میں سرخ ہو رہی تھیں کہ لوشیا کو کمرے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لوشیا کا دل یونہی دھڑکنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اس نے آہستہ سے کہا:

”مسٹر بھوت! کیا یہ تم ہو؟“

بیڈروم میں خاموشی بچائی رہی۔ لوشیا نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو بھوت کی آواز سنائی دی۔ آج پہلی بار اس کی آواز میں لوشیا کو ایک عجیب قسم کا باوقار ٹھہراؤ اور گھلاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے بھوت نے کہا:

”تم مجھے بھوت نہ کہا کرو۔ اگرچہ میں زندہ نہیں ہوں۔ مرنے والی ہوں اپنی لاش کا بھوت ہوں۔ اپنی لاش کی رُوح ہوں۔ مگر میرا نام جارج ہے۔ تم مجھے کیپٹن جارج کے نام سے پکار سکتی ہو۔“

لوشیا نے کہا۔ ”تمہارا نام معلوم کر کے مجھے خوشی ہوئی ہے کیپٹن جارج! تم اتنے دن کہاں رہے؟“

تھا۔ لوشیا کے سنہری بال سمندری ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اچانک لوشیا نے محسوس کیا۔ جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس نے گردن گھما کر بائیں جانب دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لگئی۔ ریت پر اس کے ساتھ ساتھ کسی مرد کے قدموں کے بھی نشان پڑ رہے تھے۔ مگر یہ ہاؤس کا بھوت کیپٹن جارج لوشیا کے پہلو پہلو چل رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ریت پر اس کے قدموں کے نشان پڑتے چلے جا رہے تھے۔ لوشیا نے مسکرا کر کہا۔ ”کیپٹن جارج! دن کتنا حسین ہے!“

بھوت نے کچھ نہ کہا۔ لوشیا نے دوبارہ موسم کی تعریف کی تو کیپٹن جارج کے بھوت نے کہا۔ ”میلڈم! میرے لئے موسم ہمیشہ خوشگوار رہتا ہے اور دن ہمیشہ حسین رہتے ہیں۔“

لوشیا سٹپٹا گئی۔ بڑا بد دماغ بھوت ہے یہ بھی۔ پھر اس نے کیپٹن جارج کے بھوت سے اپنے ناول کی باتیں شروع کر دیں۔ بھوت نے کہا،

”مجھے معلوم ہے تم کل لندن اپنے پلشر کے پاس جا رہی ہو، لیکن وہ تمہاری کتاب نہیں چھاپے گا، لوشیا نے تنک کر کہا،

”تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ میری کتاب نہیں چھاپے گا؟“

بھوت کی آواز سنائی دی۔ ”میں وہ کچھ بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتی میلڈم!“

”تم لندن جا رہی ہو۔ وہاں جا کر تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔“

”تو بچہ تم جہنم میں جاؤ۔“

لوشیا نے غصے سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ ریت پر اب کسی مرد کے پاؤں کے نشان نہیں پڑ رہے تھے۔ کیپٹن جارج کا بھوت غائب ہو چکا تھا۔ لوشیا کو کیپٹن جارج کے بھوت کی بات بڑی بُری لگی۔ وہ واپس مکان پر آگئیں اور لندن جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ اتنے میں گنجے مائیکل کی لڑائی کا رے بے ہنگم ہارن کی آواز سنائی دی اور حسب معمول اس کے ہارن کی آواز سن کر لان میں بیٹھ ہوئی سرخ چڑیاں پھر پھڑک کر اڑ گئیں۔ خادمہ مارتھانے باورچی خانے سے نکل کر گنجے مائیکل کو ڈانٹا کہ وہ برائے مہربانی اپنی کار کا اجماع ہارن نہ بجایا کرے۔ جس کی آواز سے بے چاری لال چڑیاں داند نہ کا چھتے چھتے ڈر کر اڑ جاتی ہیں۔ گنجے مائیکل نے ہیٹ اتار کر ادب سے جھکتے ہوئے کہا:

”محترمہ! میری موٹر کے ہارن کی آواز سن کر تو پرندے کا ناشروع کر دیتے ہیں۔ ہی ہی بی بی!

”شامی کبابوں کی خوشبو کہاں سے آرہی ہے۔“

لوشیا نے ہنس کر مارتھانے کو آواز دی کہ وہ شامی کبابوں کی ایک پلیٹ لاکر مائیکل کو کھائے۔ مارتھانے نے ناک بھون چڑھا یا پر کیا کر سکتی تھی۔ شامی کباب لاکر گنجے مائیکل کے آگے رکھ دیے۔ مائیکل نے خوشی ہو کر ایک شامی کباب اٹھا کر ہڑپ کیا اور دوسرا ہاتھ میں لے کر اٹھا اور رخصت لے کر باہر نکل گیا۔ لان میں اس نے دوسرا شامی کباب کھانے کے لئے ہاتھ منہ کے پاس کیا ہی تھا کہ کسی نے جیسے زور سے ہاتھ مار کر شامی کباب دوڑی میں گر دیا۔ مائیکل ہڑپا گیا۔ سمجھ گیا کہ بھوت سر پہنچ گیا ہے:

”معافی چاہتا ہوں مسٹر بھوت! معافی! معافی!“

اور وہ موڑ میں بیٹھ کر قصبے کو بھاگ گیا۔

اگلے روز صبح لوشیا ٹرین کے فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں سوار لندن کی طرف جا رہی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ کھیتوں میں دھوپ ابھی پیل پیل تھی، لیکن آسمان صاف تھا۔ لوشیا کی سیدٹ کے بالکل سامنے ایک بوڑھا انگریز بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ لیکن اس پر لوشیا کے جوان حسن اور سنہرے بالوں والوں والے گداز بدن نے کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اخبار کے پیچھے سے بار بار لوشیا کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بار لوشیا نے اسے اپنی طرف گھورتے دیکھا تو بڑھا انگریز گھبرا گیا اور یونہی سر پر ہیٹ اتار کر موسم کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کھستہ ہوا سیدٹ پر اتنا آگے آگیا کہ اس کے گھٹے لوشیا کے گھٹنوں سے ٹکرائے۔ لوشیا کو یہ بہت بُرا لگا۔ اس نے مسکرا کر بڑھے کو پیچھے کر دیا۔ مگر وہ بھی ایک ہی ہندی اور ہوس پرست تھا باتیں کرتے ہوئے پھر آگے کو کھستہ چلا آیا۔ لوشیا بڑی تنگ آگئی۔ اچانک کسی نے پیچھے سے بڑھے کا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ وہ گھبرا کر پیچھے پٹا۔ پیچھے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ بڑھا حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر سر جھٹک اخبار پڑھنا رہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس نے لوشیا سے نظر بازی شروع کر دی

رہا گا۔ بڑھا انگریز ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کسی نے اس کے سر پر سے ہیٹ اُچھال کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ گھبرا کر شور مچاتا باہر نکل گیا۔ لندن کے ایک سٹیشن پر گاڑی رک گئی۔

وہاں آتا ہجوم تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔ لوشیا بڑے حسین ہلکے سیلٹی رنگ کے لباس میں دس تھی۔ اس کے سنہری بال بڑی نفاست سے بنے ہوئے تھے۔ وہ ہجوم میں سے گذرتی بیٹش سے باہر ہوئی۔ اس نے ایک میکسینی اور شہر کی گنجان آبادی میں ایک پبلشر کے دفتر میں آگئی۔ اس پبلشر نے اس کی بات پہلے سے ہو چکی تھی۔ پبلشر بڑی خندہ پیشانی سے لوشیا سے ملا۔ لوشیا نے اسے بنا ناول دکھایا تو اس نے پہلے سے زیادہ خندہ پیشانی کے ساتھ انتہائی معذرت بھرے لہجے میں کہا: ”مے بہت افسوس ہے کہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے کل رات ہی فیصلہ کیا ہے کہ ایک برس کے لئے کوئی بھی نئی کتاب شائع نہ کی جائے اور پہلے چھپی ہوئی کتابوں کی فروخت کو منظم کیا جائے۔“ لوشیا کو ایک دم سے کمپن جارج کے بھوت کا خیال آگیا۔ کم بخت یہ ساری اسی کی شرارت ہے۔ دگر کل تک تو طے تھا کہ کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی جائے گی۔ لوشیا نے کہا کہ وہ اتنی دولت مند ہے کہ اپنے پلے سے رقم خرچ کر کے ناول چھاپ سکتی ہے مگر وہ چاہتی ہے کہ اس کا پہلا ناول لندن کے مشہور ناقدی ادارے کے زیر اہتمام چھپے۔ پبلشر نے ایک بار پھر معذرت کرتے ہوئے کہا:

”محترمہ! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے ناچیز ادارے کو اتنی اہمیت دے رہی ہیں۔ یقین کریں اگر ہمارے بورڈ آف ڈائریکٹرز یہ فیصلہ نہ کرتے تو میں بڑی خوشی سے آپ کی کتاب بھی پریس بھجوا دیتا۔“

اب لوشیا کو بھوت کا ہلکا سا طنز یہ قہقہہ سنائی دیا۔ بھوت کی آواز سوائے لوشیا کے دوسری کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ لوشیا بھوت کے طنز یہ قہقہے کی آواز سن کر جل ہی لوگی۔

بھوت نے کہا:

”میں نہ کہتا تھا، یہ ادارہ تمہاری کتاب نہیں چھاپے گا۔ ویسے تم اگر کہو تو یہ کتاب اب بھی چھپ سکتی ہے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کا فیصلہ بدلا جاسکتا ہے۔“

لوشیا نے سختی سے کہا:

”میں تمہاری کیا پروا کرتی ہوں۔“

اور آگے کو کھسنے لگا۔ اب اس کا ایک ہاتھ اخبار کے نیچے سے لوشیا کے گھٹنے پر آگیا۔ لوشیا نے گھٹنا پیچھے کر لیا ہاتھ اور آگے آگیا۔

کسی نے پیچھے سے بڑھے انگریز کے سر پر ایک دو تھڑ مارا۔ اس کی عینک دوڑ جا گری۔ وہ خوفزدہ ہو کر لڑکھڑا ہوا۔ کپار ٹنٹ میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا اور لوشیا اس کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ پھر یہ دو تھڑ کس نے مارا؟ بڑھا انگریز ابھی کچھ موج بھی نہ پایا تھا کہ ایک دو تھڑ اور اس کی پیٹھ پر پڑا۔ وہ اپنی سیٹ پر گر پڑا۔ گرتے ہی وہ اپنی ٹوپی، اخبار اور چھڑی سنبھال کر اٹھا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ لوشیا ہنس پڑی۔ اس نے آہستہ سے کہا:

”کیپٹن جارج! تمہارا شکریہ!،“

مگر یہ ہاؤس کا بھوت لوشیا کے ساتھ اس کے کپار ٹنٹ میں سفر کر رہا تھا۔ ہوس پرست بڑھے انگریز کی سرزنش اسی نے کی تھی۔ بھوت نے کہا:

”ایسے آدمیوں کو کڑی سزا دینی چاہیے شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”پھر بھی تم نے مجھے ایک بورٹش کی صحبت سے بچایا۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

”بھوت نے کہا۔“ لندن تم فصول جاری ہو مسز تمہارا تمہارا پبلشر تم سے کتاب نہیں لے گا۔“

لوشیا کو پھر بیٹش آگیا۔ اس نے کہا: ”نہیں لیتا تو نہ لے۔ تم کون ہوتے ہو میرے معاملات میں دخل دینے والے؟“

لوشیا اونچی آواز میں بول رہی تھی کہ کپار ٹنٹ میں وہی بڑھا انگریز ایک حبشی کنڈکٹر کو لے کر آگیا۔ کنڈکٹر نے اکیلے کپار ٹنٹ میں لوشیا کو کسی سے اونچی آواز میں باتیں کرتے سنا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”محترمہ! آپ۔ آپ کس سے باتیں کر رہی ہیں؟“

لوشیا نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے وہی خبیث انگریز اور کنڈکٹر کھڑا تھا اس نے کہا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ بڑھے انگریز نے کہا۔ یہ جھوٹ کہتی ہے۔ اس نے کوئی چڑیل قابو کر رکھی ہے جس نے مجھے دو تھڑ مارے ہیں میں ریلوے پر ہر جانے کا دعویٰ کروں گا۔ کنڈکٹر کو کھلا سا گیا تھا۔ اتنے میں ایک دو تھڑ بڑی زور سے حبشی کنڈکٹر کے سر پر بھی پڑ گیا۔ وہ تو بیچ مار کر کپار ٹنٹ سے

اپس گرین ہاؤس پہنچ جانا جاتا تھا۔ قصبے کی طرف گاڑی ٹھیک بارہ بجے جاتی تھی اور ابھی بارہ گیارہ بجے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ریلوے سٹیشن پر کچھ وقت چل قدمی میں گزار دے گی۔
نئے میں میکسی اس کے قریب آکر رک گئی۔

ٹھیک ایک بجے لوشیا اپنے گھر گرین ہاؤس پہنچ گئی۔ لان میں گنجر مائیکل بڑی بے چینی سے ایک بڑے کھوسٹ انگریز کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر ٹوپیاں اتار کر لوشیا کا خیر مقدم کیا۔ مائیکل نے طوطے کی طرح گردن گھما کر بڑھے انگریز کا لوشیا سے تعارف کروایا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس سارے علاقے کی کارپوریشن کا میئر ہے۔ گنجر مائیکل نے لوشیا کو بتایا کہ ڈارلنگٹن کے نواب نے بڑی مہمائی سے اس علاقے کا دورہ کرنے کی دعوت منظور فرمائی ہے اور کارپوریشن نے فیصلہ کیا ہے کہ گرین ہاؤس میں نواب صاحب کو ایک زبردست دعوت دی جائے، کیونکہ اس سارے علاقے میں گرین ہاؤس سے بڑھ کر کوئی بھی جگہ ڈارلنگٹن کے نواب کے خدایان شان نہیں ہے۔ بڑھے میئر نے ڈی عاجزی سے کہا:

”ہمیں خوشی ہوگی اور ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے، اگر آپ ہمیں اتنی اجازت دے دیں گے کہ ہم پرسوں شام نواب صاحب کو گرین ہاؤس میں کھانا کھلا سکیں۔“
لوشیا نے پوچھا۔ ”مہمانوں کی تعداد کتنی ہوگی؟“ گنجر مائیکل نے جلدی سے کہا۔
”ہی کوئی سو ڈیڑھ سو کے قریب۔“
بڑھا میئر بولا۔ ”آپ کے قیمتی مکان کی کسی شے کو گزند نہیں پہنچے گی۔“
”جہاں دوسری منزل کے ہال کمرے میں کھانا کھائیں گے اور بس اس کے بعد چلے جائیں گے۔“

”لوشیا انہیں انکار نہ کر سکی۔ اس نے کہہ دیا کہ مجھے منظور ہے۔ گنجر مائیکل اور بڑھا میئر نے خوش ہوئے۔ بھوت کی بارعب غصیلی آواز سنائی دی۔
”مجھے منظور نہیں۔ میں اس اتو کے پٹھے نواب کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ میرے مکان کے رے کمرے میں احمق قسم کے انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے اور فرش پر ہڈیاں پھینکے۔“
بھوت کی آواز سوائے لوشیا کے اور کوئی نہ سن سکتا تھا۔ وہ جلدی سے بولیں:

اس جگہ پر بے چارہ پبلشر لوشیا کا منہ تکتے لگا۔
”محترمہ! یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ میں تو.....“
لوشیا گھبرا گئی۔ جھٹ پبلشر سے معذرت بھرے لہجے میں کہنے لگی کہ وہ اس سے مخاطب نہیں تھی۔ پبلشر نے اور زیادہ حیران ہو کر کہا کہ پھر وہ کس سے مخاطب تھی؟ کیونکہ کمرے میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ لوشیا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بس وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ کبھی کبھی اسے دورہ سا پڑتا ہے اور بے اختیار منہ سے کوئی نہ کوئی جملہ نکل جاتا ہے۔ پبلشر بے چارہ حیران سا منہ لئے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا کہ ایک دم سے فون کی گھنٹی بجی۔ پبلشر نے فون اٹھا کر میلو کہا اور پھر بڑے ادب سے گفتگو شروع کر دی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ادارے کے سب سے بڑے افسر سے بات کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے فون بند کر دیا اور لوشیا کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا:

”آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی محترمہ کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا ہے اور ہم آپ کی کتاب شوق سے چھاپنے کو تیار ہیں۔“
لوشیا بہت خوش ہوئی۔ بھوت کی ہلکی سی ہنسی کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس نے کہا:
”مجھے تم پر رحم آگیا تھا مسز سمٹھ۔“
”شٹ اپ! لوشیا نے سمجھا کر کہا۔ بے چارہ پبلشر ایک بار پھر ہنگامہ مچا کر لوشیا کا منہ تکتے لگا۔ اب لوشیا کو سوائے اس کے اور کچھ نہ سوچا کہ وہ کتاب کا مسودہ پبلشر کی میز پر رکھ کر باہر بھاگ جائے۔ اس کے نکتے ہی ایک کلرک اندر آیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ پبلشر نے غصے میں جھنجھلا کر اسے ”شٹ اپ!“ کہا اور سر کیڑ کر بیٹھ گیا۔

لوشیا دواں سے نکل کر پیکا ڈلی سرکس کے چوک میں ایک کافی ہاؤس میں آکر بیٹھ گئی۔ اسے خوش تھی کہ اس کی پہلی کتاب ایک مشہور اشاعتی ادارے کی طرف سے چھاپی جا رہی ہے اور انفسوس! تھا کہ خواہ مخواہ پبلشر کو غلط فہمی ہوئی۔ اسے بھوت پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ کافی کا ایک پیالہ پی کر وہ ایک بار پھر لندن کے زبردست ہجوم میں گم ہو گئی اس نے جی بھر کے شہر کی مختلف سڑکوں پر گردش کی۔ پھر ایک ٹیوب سٹیشن کے باہر کھڑی ہو کر میکسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے

لجہ مائیکل اپنی کرسی پر کانپ گیا۔

”یا خدا خیر۔۔۔“

پھر کسی نادیدہ ہاتھ نے اس کی ٹائی اتنی زور سے پکڑ کر پھینچی کہ اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔
دراںکھیں باہر کوا بل آئیں۔ اب اسے بھوت کی غضبناک آواز سنائی دی:

”حرام خورد گردے! اگر پھر کبھی تم نے میرے گرین ہاؤس پر لوگوں کی دعوت کا انتظام کیا تو میں
تمہاری گردن طوطے کی طرح مروڑ کر گندی نالی میں پھینک دوں گا۔“

مائیکل سمجھ گیا کہ بھوت اکیلا ہے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ آنکھیں ابلی پڑی تھیں۔ موت
انکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر معافی
لگے۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بھوت نے ایک جھٹکا دے کر اسے فرش پر گرا دیا۔ دروازہ
بب بار پھر کھل کر بڑے زور سے بند ہوا۔ چڑاسی بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اس کا صاحب فرش پر
سے اٹھ کر لگے میں اپنی ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے بری طرح کھانسی رہا تھا۔ گنجے مائیکل نے ہاتھ کے
نارے سے اسے پانی لانے کو کہا اور کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کھانسنے لگا۔

بلوہا میر اپنے عالیشان آرام دہ کمرے کے آگے برآمدے میں بید کی کرسی پر گدے میں دھنسا بیٹھا
ای آن بان سے سگاریں رہا تھا اور ایک فائیل پر دستخط کر رہا تھا۔ دستخط کرنے کے بعد اس کو خیال
بالکہ ابھی تک کلرک مائیکل دعوت کے مہمانوں کی فہرست لے کر نہیں آیا۔ اس نے قریب ہی رکھے
وئے ٹیلیفون کا چوڑا گٹھایا اور کیسٹ کے دفتر فون کیا۔ ابھی وہ نمبر تلا ہی رہا تھا کہ میسج کسی نے جھنجھوڑ
رفون اس کے ہاتھ سے لے کر نیچے پھینک دیا۔ بڑھا میر صدمہ بگم ہو کر دائیں بائیں تکتے لگا۔ کون
ہے؟ کون ہے؟ مگر وہاں تو اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کیپٹن جارج کا بھوت بالکل اس کی کرسی
پر پاس کھڑا تھا۔ بڈھے میٹر کو بھوت کی ہیبتناک آواز سنائی دی۔

”سنو! اگر پریموں تم لوگوں نے میرے گھر گرین ہاؤس پر آؤ کے ٹھہے نواب اور دوسرے لوگوں
دعوت کی تو کارپوریشن کے ٹرک کو سارے کے سارے مہمانوں کی لاشیں اٹھانی پڑیں گی میں ان سب
ہاتھوں کو نواب اور تمہارے سمیت ہلاک کر دوں گا۔ میں گرین ہاؤس کا بھوت بول رہا ہوں۔
آنا سننا تھا کہ بڈھے میٹر کے ہاتھ سے مگر گر پڑا اور وہ مگر کے ساتھ ہی برآمدے کے فرش

”تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے؟“

”میں۔۔۔ میں کون۔۔۔“ گنجے مائیکل ہرکلاتے ہوئے بولا۔

لوشیا نے جلدی سے کہا۔

”نہیں نہیں میں تمہیں نہیں کہہ رہی تھی۔ میرا مطلب ہے میں ویسے ہی۔۔۔ ویسے ہی

کہہ رہی تھی۔ آپ لوگ بے شک نواب صاحب کو لے کر آجائیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔“

گنجے مائیکل فوری طور پر بڈھے میٹر کو لے کر گرین ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ اسے دال میں کچھ
کالا کالا دکھائی دینے لگا تھا اور پیشتر اس کے کہ ساری کی ساری دال ہی کالی ہو جائے، وہ وہاں
سے رونچہ کر رہا تھا۔ جب وہ دونوں چلے گئے تو لوشیا نے بھوت سے مخاطب ہو
کر کہا،

”تم جہاں کہیں بھی ہو کان کھول کر سن لو۔ یہ دعوت گرین ہاؤس کے ہال میں ہوگی اور
ضرور ہوگی۔ اس لئے کہ یہ میرا مکان ہے۔ میرا اس مکان پر پورا پورا حق ہے۔

”میں تمہاری دخل اندازی ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔“

”دیکھ لوں گا۔“

بھوت کی صرف اتنی آواز سنائی دی۔ آواز میں بڑا غصہ تھا۔ پھر کسی نے زمین پر پڑی
ہوئی گھاس میں پانی دینے کی نالی کو زور سے اٹھا کر دوڑتی دیا۔ لوشیا ہنس پڑی۔ مارتھانے
باورچی خانے کی کھڑکی میں سے پانی دینے والی ربڑ کی نالی کو اپنے آپ فضا میں بلند ہو کر زور
سے زمین پر گرتے دیکھ لیا تھا اور اس کا سر چپکا گیا۔ وہ پیالی میں دلیر ٹال رہی تھی۔ اس کا دل
ڈالنے والا ہاتھ وہیں کا وہیں رکھا گیا۔

گنجے مائیکل بڑا غوش تھا کہ اس کی کوشش سے میٹر کی عزت افزائی ہوئی ہے اور اب وہ
نواب صاحب کے آگے بھی سرخرو ہو سکے گا۔ اگلے برس ضرور اس کی ترقی کر دی جائے گی۔ میٹر
قبضے کے خوب صورت سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ گنجے مائیکل دعوت میں بلائے
جانے والے مہمانوں کی فہرست تیار کر کے اسے میٹر کے پاس لے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس
کے کمرے کے دروازے کو کسی نے اس زور سے کھول کر بند کیا کہ اس کے شیشے جھنجھٹا اٹھے

”کیپٹن جارج اٹم نے ٹھیک کہا۔ میں تو ایک روز مر جاؤں گی۔ پھر یہ مکان تمہارے پاس چلا جائے گا۔ شاید تم میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے لوشیا۔“

”خبردار جو مجھے لوشیا کے نام سے پکارا۔ تمہارے لئے میں مسرت سمجھتا ہوں۔“

”تو پھر جہنم میں جاؤ۔“

بھوت نے چیخ کر کہا۔ یہ آواز اتنی اونچی اور ڈراؤنی تھی کہ اس کی گونج نیچے باورچی خانے تک گئی جہاں مارتھا آلوؤں کا بھرتہ بنا رہی تھی۔ سچ اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور اس نے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر چھت کی طرف دیکھنے شروع کر دیا۔ سوائے گرین ہاؤس کے بھوت کے یہ آواز کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ لوشیا پلنگ پر اوندھی لیٹ گئی اور اپنا حسین چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا تناسب خوب صورت نازک بدن اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ ہل رہا تھا۔ اچانک لوشیا نے اپنے کندھے پر ایک ٹھنڈے ہاتھ کا بدن میں پکلی طاری کر دینے والا لمس محسوس کیا۔ اسے اپنے جسم میں موت کی سردی سرایت ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ بھوت کا ہاتھ تھا۔ لوشیا کو اپنے غرور کی تسکین ہوتی محسوس ہوئی۔ بھوت نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ لوشیا کو بھوت کی مذاہن بھری آواز سنائی دی،

”میں معافی چاہتا ہوں۔ مسرت سمجھ! میں نے تمہارا دل دکھا دیا۔ مجھے معاف کر دو۔ شین پھر“

لوشیا کچھ کہنے والی تھی کہ اسے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ بھوت جا چکا تھا۔ وہ پلنگ پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی اور باہر کھلے سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو بچکوں میں جذب ہو گئے اور ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھلنے لگی۔

اس رات لوشیا نے خواب دیکھا کہ وہ کیپٹن جارج کے ساتھ گہرے سمندروں میں بادبانی جہاز پر سفر کر رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بارش برس رہی ہے سمندر میں زبردست طوفان آیا ہوا ہے۔ ان کا جہاز سمندری موجوں کے رحم و کرم پر ہے کیپٹن جارج

پر گزر کر بے ہوش ہو گیا۔ بھوت کے اس کارنامے کی خبر لوشیا کو بھی ہو گئی۔

اسے بڑا غصہ آیا کہ گرین ہاؤس کی مالک تو وہ ہے۔ کیپٹن جارج کے بھوت کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کے مکان میں منعقد ہونے والی تقریبات کے بارے میں حکم صادر کرے۔ وہ اپنے بیڈروم میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ وہ ہر پانچ منٹ کے بعد بھوت کی آواز دیتی کرتا کہ وہ آگیا ہے۔ کوئی آدھے گھنٹہ بعد بھوت کی آواز سنائی دی:

”میں جانتا ہوں تم کس لئے غصے میں ہو۔“

لوشیا نے زمین پر پاؤں مار کر کہا:

”میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتی کہ تم میرے مکان پر ہونے والی تقریبات کے بارے میں حکم صادر کرتے پھر۔“

بھوت کی آواز بھی اسی تلخی سے بلند ہوئی۔

”اور میں بھی یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ تم ہر ایرے غیرے کو گرین ہاؤس میں کھانے کی دعوت دو۔“

لوشیا نے کہا۔ ”یہ گھر میرا ہے۔“

بھوت نے کہا۔ ”یہ گھر میرا ہے تم بچاؤں کے ساتھ برس بعد مر جاؤ گی۔ اس کے بعد پھر یہ گھر میری ملکیت میں آجائے گا۔ میں ہمیشہ سے زندہ ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ یہ مکان ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔“

بھوت کی اس بات پر لوشیا ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ وہ کچھ ادا اس بھی ہو گئی اسے خیال آیا کہ کیپٹن جارج کا بھوت ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ ایک روح تھی اور روح اذیت یافتہ بتلا ہو سکتی ہے، لیکن اسے موت کبھی نہیں آ سکتی۔ یہ بات بھوت نے بھی محسوس کی کہ اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی ہے جو اسے لوشیا کے سامنے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ وہ بھی پریشان سا ہو گیا۔ اس نے لوشیا کی دلجوئی کے لئے کہا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں مسرت سمجھ! میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں تمہارا دل دکھاؤں۔ اصل میں.....“

لوشیا نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

وقت سے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا جس وقت سے لوشیا بیدار ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نیچے گیا تھا اور اسے اپنی تصویر کو محبت سے گھورتے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس ساتھ ہی واپس بیڈ روم میں آیا تھا۔ اس نے لوشیا کی وہ دھیمی محبت بھری آواز بھی سنی تھی جب نے سر کوٹخی میں "جارج" کہہ کر اسے آواز دی تھی۔ لوشیا پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ اب کا دل محبت کے شیریں خیالات سے لبریز تھا۔ اس نے سر باندھ اپنے سینے سے لگایا اور اس کے نرم بدن میں اپنا حسین چہرہ چھپا لیا۔ ایک ہوک اس کے دل سے اٹھی۔

کاش! کیپٹن جارج زندہ ہوتا!

اس دن لوشیا کچھ اداس اداس سی رہی۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگا۔ رات کو لیٹر پر لیٹے بے اس نے جارج کو بہت یاد کیا۔ کئی بار اس کا نام لوشیا کے ہونٹوں پر آیا مگر اس نے آواز نہ بنایا شاید وہ اس کا غور و حسن یا تمکنت عشق تھی جس نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔ ایک بار دو دن چار دن گزر گئے۔ بھوت نے لوشیا کو آواز نہ دی۔ وہ غمگین سی ہو گئی لیکن وہ اوپر سے تھکے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی کہ اگر کہیں بھوت موجود ہو تو وہ یہی سمجھے کہ لوشیا بڑی خوش ہے اسے بھوت کی آواز کی کمی محسوس نہیں ہو رہی۔

ایک رات وہ اپنے دل میں کیپٹن جارج کے بھوت کا خیال لے پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک تازہ کی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ مارتھا سفید پرن باندھے کافی لے کر آگئی۔ کھانے کے بعد لوشیا کافی اپنے بیڈ روم میں ہی منگوالی تھی۔ چونکہ زیادہ تر کیپٹن جارج کے بھوت کی آواز بیڈ روم میں ہی آئی تھی۔ اس لئے اب وہ زیادہ وقت سونے کے کمرے میں ہی گزارتی تھی۔ بالکل اس بے چین عاشق اور لڑکی کی طرح جسے اس کے محبوب کے ٹیلیفون کا انتظار ہو۔ رات کا پہلا پہر بڑا حسین تھا۔ آسمان اُست کے بادل چھلے ہوئے تھے اور چٹانوں کی طرف سے سمندر کی موجوں کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا تھا۔ کافی بیتے ہوئے لوشیا اپنی وفادار خادمہ مارتھا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

تھا اپنی مالکہ کے لئے گرم شال بنی رہی۔ مارتھا نے بڑے بڑے ڈیلے کھا کر اچانک دائیں بائیں لجا اور پھر جیسے راز بھرے انداز میں کہا۔

"ہیکم صاحبہ! خدا کا شکر ہے پھر کبھی بھوت دکھائی نہیں دیا۔ لوگوں نے تو ہمیں بڑا ڈرایا تھا۔"

جہاز کو سنبھالنے کی پوری جدوجہد کر رہا ہے۔ پھر اچانک آسمان سے بجلی گرتی ہے اور جہاز دو ٹکڑے ہو کر سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔ لوشیا کیپٹن جارج سے پٹ جاتی ہے۔ دونوں سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ پھر لوشیا نے دیکھا کہ وہ کیپٹن جارج کے ساتھ ایک رتھ پر سوار چوڑا کی دھڑکتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ گھوڑوں کے تھنوں سے جھاگ اڑ رہی ہے۔ اچانک دو شیر بھاڑی بے سے ان پر حملہ کرتے ہیں۔ کیپٹن جارج نے فرعون مصر کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ تلوار کے ایک ہی دوا سے دونوں شیروں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ پھر یہ رتھ آسمان پر پھیلے ہوئے سنہری بادلوں میں گم ہو جاتا ہے۔

لوشیا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا، کھڑکی کے باہر رات کے آسمان پر صبح کی ہلکی روشنی کی چھلکی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ نیلے ستاروں کا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر کیپٹن جارج کا خیال چھایا ہوا تھا۔ اسے ایک پل کے لئے بھی احساس نہ تھا کہ کیپٹن جارج سویرس ہوئے مریچا ہے اور اب اس کی روح اس کا بھوت اس دو منزلہ عمارت میں رہتا ہے وہ لیٹر پر سے اٹھی اور بڑے خاموشی سے ننگے پاؤں بیڑھیوں کے قالین پر قدم رکھتی نیچے ڈرائنگ روم میں کیپٹن جارج کی تصویر کے سامنے آگئی۔ تصویر کے سامنے آتے ہی خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ واپس حقیقت کی دنیا میں آگئی۔

اس کے دل کو ایک ملال سا ہوا کہ کیپٹن جارج زندہ نہیں بلکہ مردہ تھا۔ کاش وہ زندہ ہوتا، وہ اس سے شادی کر لیتی۔ حقیقت میں اس نے پہلی بار اپنے دل کی دھڑکنوں میں کیپٹن جارج کی محبت کے دھیمے نغمے کی آواز سنی تھی وہ دیرینہ کیپٹن جارج کی تصویر کو دیکھتی رہی۔ تصویر میں کیپٹن جارج بھی لوشیا کو اپنی نیلی پیرا سرار آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ کارنس پر شمع دان میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ جس کی دھیمی روشنی میں لوشیا کو یوں محسوس ہوا جیسے کیپٹن جارج اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ہے۔ لوشیا نے شرما کر سر جھکا لیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر واپس اپنے بیڈ روم میں آگئی وہ یہ سوچ کر کچھ گھبرا گئی کہ کہیں کیپٹن جارج کے بھوت کو اس کے دل کا حال معلوم تو نہیں ہو گیا۔ اس نے اپنا شک و دودھ کرنے کے لئے آہستہ سے جارج کے کمرے کو آواز دی۔ بھوت نے کوئی جواب نہ دیا۔ لوشیا بڑی خوش ہوئی کہ بھوت کمرے میں نہیں اور اسے اس کے دل کا حال معلوم نہیں ہوا لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ کیپٹن جارج کا بھوت لوشیا کے بیڈ روم میں موجود تھا اور کونے میں کھڑا

دشیا دیر تک بستر پر کھڑی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بیڈروم پر اسرار اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں کسی کی پرانی یادوں کے سائے بھی سرگوشیاں نہ سنائی دیتے تھے۔ بجلی جبکی تو بیڈروم ایک بار چکا چوند ہو کر پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بے ساتھ ہی بادل اس زور سے گر جا کہ لوشیا اپنے بستر پر لیٹی لیٹ کر گئی۔ آج کی رات نے کیوں اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ آج کی رات اسے اکیلے پن کا احساس تھا۔ بارش بڑے زور سے ہو رہی تھی۔ فضا میں سردی بڑھ گئی تھی۔ لوشیا نے ایک اور کیمبل اوپر لے لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ یہی وہ وقت تھا جب چور کی کند لالوشیا کی کھڑکی کے باہر آ کر اٹک گیا۔

چور سی کے ذریعے آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا بارش میں بھینگتا لوشیا کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ پھر وہ بچنے بچنے آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا بارش میں بھینگتا لوشیا کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ پھر بادل گرجے اور اس کے شور میں وہ کھڑکی کھول کر کمرے میں داخل ہو گئے۔ تاکہ اگر کھڑکی کے کھلنے سے کوئی شور پیدا نہ ہو۔ بادلوں کی گرج میں دب کر رہ جائے۔ یہ چور اس علاقے کا بڑا نامی گرامی ڈاکو تھا۔ اس نے کھول دی اور ایک قتل بھی ہو چکے تھے۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ لیکن وہ مفور تھا۔ اس نے کروڑ پتی امریکی بیوہ کے بارے میں سن رکھا تھا کہ گرین ہاؤس کے اجاڑ مکان میں آکر ٹھہری ہے اور اس کے پاس لاکھوں کی مالیت کے ہیرے جواہرات ہیں چنانچہ چور کسی مناسب وقت مار کرنے لگا۔ آج موسم خراب تھا اور اس کے لئے بڑا خوشگوار تھا۔

بجلی بجی۔ اس کے بعد بادلوں کی گرج بلند ہوئی۔ اس شور میں ڈاکو نے دھکا دے کر بیڈروم کی کھول دی اور اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی وہ زمین پر بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا اور جائزہ لینے لگا۔ بالائی آنکھیں بند تھیں۔ کھڑکی کھلنے کی آواز سے اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس نے سوچا کہ لے زور کی وجہ سے کھڑکی کھل گئی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید اس کا محبوب کیپٹن جارج کا تہ کیا ہو۔ اس احساس نے اس کے دل میں ایک شمع کی ہی روشن کر دی۔ اس نے دھیمے نیچے میں جارج کو آواز دی:

”جارج! کیا یہ تم ہو؟“

مجھ تو یہ ہے کہ ڈر سے میں بھی شروع شروع میں کانپا کرتی تھی مگر اب بالکل نہیں ڈرتی۔ میرا ہے کہ بھوت ہمارے ڈر سے بھاگ گیا ہے۔“

مارتھا اپنے سفید دانت نکال کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ لوشیا کا خیال تھا کہ بھوت کو اس گستاخی کا مزہ چکھانے کے لئے ضرور آئے گا مگر وہ نہ آیا۔ اب لوشیا کا دل بہت ہی ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ کیپٹن جارج کا بھوت وہاں نہیں ہے۔ شاید وہ چلا گیا ہے۔ کہیں ہمیشہ کے لئے تو نہیں چلا گیا؟ لوشیا کا ننھا سادل اس کے خوب صورت سنگ مرمر ایسے پر اندر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

مارتھا کافی کا طشت اٹھا کر شب بخیر کہہ کر نیچے چلی گئی۔ بیڈروم میں لوشیا اکیلی رہ گئی۔ دیر بعد پلنگ پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر بیڈروم کی بجائی اور سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ بیڈروم کی جی بھیت ہی اند رات کی دھیمی دھیمی روشنی کا خاکستری رنگ کا بخا بھیل گیا جو اسے بہت پر اسرار لگا۔ دور دراز میں آسمان پر بجلی کی چمک لہرائی، تھوڑی دیر بعد بادلوں کی ہلکی سی گرج سنائی دی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ریشی گاؤں کے نیچے لوشیا کے عریاں بدن سے ٹکرا کر نکل گیا۔ اسے کپکپی آگئی۔ پھر بادل زور سے گر جا اور بارش شروع ہو گئی۔ لوشیا نے کھڑکی بند کر دی اور پلنگ پر لیٹ کر کیمبل اوپر کر بارش کی بوندیں کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ بھوری سمندری چٹانوں سے لہروں کے ٹکرائے کا شور بڑھ گیا تھا۔ لوشیا کے دل میں خوف کی ہلکی سی لہر اٹھی۔ وہ اکیلی تھی۔ آج پہلی بار اسے اپنے اکیلی ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس نے نیچے مارتھا کو فون کر کے پوچھا کہ مکان کے سارے دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح سے بند ہیں؟ مارتھا نے کہا کہ تمام دروازوں اور کھڑکیوں کی اندر سے چٹخیاں لگا دی گئی ہیں۔ لوشیا نے ایک بار پھر مارتھا کو شب بخیر کہا اور فون بند کر دیا۔ اسے پہلے کبھی لوشیا نے کھڑکیوں، دروازوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ شاید اسے غیر ضروری طور پر یہ احساس رہتا تھا کہ اس مکان میں اس کے علاوہ کیپٹن جارج کا بھوت بھی ہے۔ اب یہ احساس ماند سا ہو گیا تھا کیونکہ بیڈروم میں بھوت کی آواز کو گونجے پورے سات دن کے گئے تھے۔

”میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جواہرات میرے پاس نہیں ہیں۔ وہ قصبے کے بنک کے لاکر میں جمع ہیں۔“

ابھی لوشیانے فقرہ ختم ہی کیا تھا کہ ڈاکو نے پوری طاقت سے لوشیا کے گال پر اٹا ہاتھ دے اما۔ تھپڑ کی آواز کے ساتھ ہی لوشیا کی چیخ بلند ہوئی اور وہ پلنگ پر گر پڑی۔ بادل بڑے زور سے گرجا۔ ڈاکو نے بستول کی نالی لوشیا کے ماتھے پر رکھ کر غصے میں کہا،

”میں چار تک گنوں گا۔ اگر تم نے جواہرات کا بکس میرے حوالے نہ کیا تو گولی چلا دوں گا۔“

ایک دو تین۔“

لوشیا کی چیخ اٹھی۔ ”ٹھہرو۔۔۔۔ میں بچ کہتی ہوں۔ جواہرات قصبے لاکر میں ہیں۔ تم مجھ سے اس کی چابی لے سکتے ہو۔“

”بکواس بند کرو۔“ ڈاکو غرایا۔ وہ لوشیا کے منہ پر زور سے گھونسا مارنے ہی والا تھا کہ بادل بڑے زور سے گرجا، بجلی چلی۔ بادل ایک بار پھر شدت سے گرجا۔ اس کی گونج سے کمرے کی کھڑکیاں بج اٹھیں۔ معاشکی نے ڈاکو کو گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ اس نے پلٹ کر بستول مان دیا۔ ”ہینڈ ناپ۔“ کون ہے۔ میں گولی چلا دوں گا۔“

اس کے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ لوشیا کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ سمجھ گئی کہ جارج کا بھوت آگیا ہے، اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”جارج! کیا یہ تم ہو؟“

”کون ہے جارج؟“ ڈاکو چلایا۔

لوشیانے کوئی جواب نہ دیا۔ جارج کے بھوت نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ بڑے آرام سے ڈاکو کے بستول والے ہاتھ کو اپنی لوہے کے شکنجے ایسی طاقتور اور ٹھنڈی نگاہ میں لے کر اسے اتنی سختی سے دبا دیا کہ ڈاکو کے ہاتھ سے بستول نیچے گر پڑا۔ پھر بھوت نے اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھالیا۔ لوشیانے دیکھا کہ ڈاکو بیڈروم کی نیم روشن، نیم اندھیری فضا میں چھت کے قریب ہوا میں معلق ہو گیا ہے۔ ڈاکو ہوا میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ وہ دم بخود ہو گیا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اسے یہ کون ہے جس نے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا ہے۔ مگر وہ نظر نہیں آتا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ گرین ہاؤس کا

اس کے جواب میں بادل زور سے گرجے اور بارش کی بوجھاڑیں تیز ہو گئیں۔ لوشیانے دیکھا کہ کھڑکی کا کھلا پٹ زور زور سے چوکھٹ کے ساتھ بج رہا ہے۔ جارج کا بھوت کہیں ہو نہ تھا۔ کھڑکی ہوا کے زور سے کھل گئی تھی، اس کی آواز اب اسے پریشان کر رہی تھی وہ پلنگ پر سے اٹھی۔ تاکہ جاکر کھڑکی کو بند کر دے۔ ڈاکو کھڑکی سے ہٹ کر اندھیرے میں پرے ہو گیا۔ ڈاکو نے کھڑکی کے پٹ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ واپس آکر وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی کہ ڈاکو بستول تان کر اس کے سر ہانے آگیا۔

”محترمہ! میں اس علاقے کا مشہور قاتل ہوں۔ آپ کے پاس جو ہیرے جواہرات بڑے ہیں وہ میرے حوالے کر دیں نہیں تو مرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔“

لوشیا کے منہ سے حیرت اور خوف کے مارے چیخ سی نکل گئی۔ وہ کبل ہٹا کر پلنگ سے اٹھنے لگی تھی کہ قاتل ڈاکو نے بستول کی ٹھنڈی نالی لوشیا کی نرم و نازک گردن کے ساتھ رگ دی۔ وہ اسی جگہ پتھر بن کر رہ گئی۔

”محترمہ! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ کسی کو پکارنے، فون کرنے یا بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ میری ایک ہی گولی آپ کو بڑے اطمینان سے موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ کیا آپ کو اور جوانی میں مرتے ہوئے افسوس نہیں ہوگا؟ بہتر یہی ہے کہ اپنے تمام ہیرے جواہرات میرے حوالے کر دیں۔ آپ اتنی مالدار ہیں کہ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لائیے جلدی کیجئے۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“

لوشیانے کہا، ”میرے پاس جتنے بھی جواہرات ہیں وہ سارے کے سارے قصبے کے بینک میں جمع ہیں۔ اس وقت میرے سر ہانے کے نیچے صرف تین چار سو ڈالر کے نوٹ اور ڈرائنگ روم کی الماری میں ہزار دو ہزار کے نوٹ ہوں گے۔ وہ تم لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔“

ڈاکو نے سر دہلچے میں کہا،

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ محترمہ کروڑ پتی بیوہ صاحبہ! ہیرے جواہرات اسی بیڈروم میں ہیں۔“

لوشیانے روتے ہوئے کہا:

رہے جسم کو چھو کر گزر جاتا ہے۔ اگر تم میری زندگی کے لئے صرف ایک سائے کی حیثیت رکھتے جا رہے! تو پھر میں اس سائے سے ہی محبت کرتی ہوں۔۔۔۔۔
کیپٹن کے بھوت کی آواز پھر بلند ہوئی:

”اندھیرے میں اپنا راستہ تلاش نہ کرو لوشیا! میری محبت تمہیں سولائے محبت کے اور نہیں دے سکے گی۔“

”مجھے صرف محبت چاہیے جارح! تمہاری محبت! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔۔۔۔۔ خدا کے ایک بار میرے سامنے آ جاؤ۔ کیا تم مجھے نظر نہیں آ سکتے؟“
کیپٹن جارح کے بھوت نے ٹھنڈی سانس لیا اور کہا:

”کاش میں ایسا کر سکتا لوشیا! یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں اگر اپنی پستان کی دردی سامنے آ بھی جاؤں تو تمہاری دنیاوی آنکھیں مجھے نہیں دیکھ سکتیں۔“
”لیکن تم مجھے چھو تو سکتے ہو جارح!“

”ہاں۔ مگر میرا لمس اس قدر سرد ہے کہ تم زیادہ دیر اسے برداشت نہ کر سکو گی۔“
”مجھے اپنے ساتھ لگاؤ جارح! میں تمہاری محبت میں اتنی اداس ہوں کہ روتے روتے آنسوؤں طوفان میں بہہ جاؤں گی۔“

پھر لوشیا نے جارح کے لمس کو محسوس کیا۔ ٹھنڈے یخ ہاتھوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ جارح کے لمس میں بے انتہا سردی اور ٹھنڈک تھی۔ لوشیا کو یوں لگا جیسے وہ سردی کی ریل مانچے ہی نیچے اترتی جا رہی ہے۔ جارح کا بھوت لوشیا سے الگ ہو گیا۔ لوشیا سردی سے کانپ اٹھ گئی۔

”کبکل اوڑھ لو لوشیا! تم میرے لمس کو برداشت نہیں کر سکو گے۔ اس لئے میں تم سے دور ہا ہوں۔“

لوشیا نے دونوں کبکل اپنے اوپر کر لئے۔ سردی کی وجہ سے اس کے دانت جج رہے تھے۔ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ جس سے وہ پیار کرتی ہے، اسے ہاتھ سے چھو بھی نہیں سکتی۔ بھوت نے بڑی محبت سے لوشیا کے سنہری بالوں میں اپنا ہاتھ پھیرا۔

بھوت ہے۔ اسے پسینہ آ گیا۔ بھوت نے بڑے آرام سے بغیر کچھ سوچے سمجھے اٹھ کر کھڑکی سے باہر سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی بھوری چٹانوں پر پھینک دیا۔ قاتل کی ایک جج بلند ہوئی تو طوفانی رات کے شور میں کسی کو سنائی نہ دی۔ لوشیا کی جان میں جان آ گئی تھی۔ اس نے آنکھوں میں غم کے آنسو بھرتے ہوئے کہا:

”جارح! تم نے میری جان بچالی۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔“
کیپٹن کے بھوت نے کہا:

”شکریے کی کیا ضرورت ہے مسز مستح۔ یہ تو میرا فرض تھا۔“
”پھر وہی مسز مستح؟ میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے جارح کو مجھے مسز مستح کہنے کی بجائے صرف لوشیا کہنا۔“
”لوشیا!“

بھوت نے جیسے دل کی گہرائیوں اور محبت کی سرگوشیوں میں آواز دی۔ لوشیا کا دل کے ساتھ اس کے حسین جسم کا ایک ایک ذرہ دھڑکنے لگا۔ اس کے ہونٹ گرم ہو کر کیکپانے لگے۔ آگے بڑھی۔

”جارح! تم اتنی دیر کہاں رہے ہو؟“
بھوت نے آہستہ سے کہا:

”لوشیا! کیا تم میرا انتظار کر رہی تھیں؟“

”ہاں جارح! میں اعتراف کرتی ہوں کہ۔ کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“
بادل اتنی شدت سے گر جا کہ بیڈ روم کی ایک ایک شے جھجلا اٹھی۔ بارش کی آواز پہلے سے زیادہ بہتر ہو گئی۔ بھوت کی آواز آئی:

”مجھ سے محبت کر کے تمہیں کیا مل جائے گا لوشیا؟ مجھ سے محبت کرنا گذرتی ہوا کے جھونکے سے محبت کرنا ہے۔ جو صرف تمہیں چھو کر گزر جائے گا۔“

لوشیا نے ایک سرودھ بھر کر کہا:

”اگر ایسا ہے کہ تو پھر ایسے ہی سہی۔ میں گزرتے ہوا کے جھونکے سے پیار کرتی ہوں جو صرف

”لوشیا! میں اس وقت سے تمہیں پیار کرتا ہوں جب تم پہلی بار اس گھر میں آئی تھی۔ لیکن میں اپنی زبان سے اس محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ یقین کرو ایک سو سال میں پہلی بار میرا دل کسی نام پر دھڑکا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میں پھر سے زندہ ہو گیا ہوں اور دوسرے لوگوں کی طرح چلتا پھرتا ہوں۔ سانس لیتا ہوں۔“

”اودہ جارج! میرے جارج!“

یہ کہہ کر لوشیا نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ جارج کے ہونے کا ہاتھ لوشیا کے بالوں سے پھسل کر اس کے نرم و نازک ریشمی گالوں کو پیار سے مہلانے لگا۔ بھونے کا ہاتھ اس قدر ٹھنڈا تھا کہ لوشیا کے سارے بدن میں ایک سنسباہٹ اور تھر تھری سی دوڑ گئی۔ بھوت نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ بجلی چمک کر مجھ گئی بادل گرج کر اپنے پیچھے ایک بھیاٹا گونج بھونے کا خاموش ہو گیا۔ لوشیا نے جارج کو آواز دی:

”جارج!“

جارج کے بھوت نے جواب نہ دیا۔ وہ جا چکا تھا۔

اگلے روز قصبے کی پولیس کو مشہور مفور قاتل اور ڈاکوئج کی لاش چٹانوں کے پاس ملی۔ نوٹ نے پولیس کے سامنے ہی بیان دیا کہ ڈاکو آدھی رات کو اس کمرے میں قتل اور ڈاکے کی نیت سے آیا تھا کہ کھڑکی میں سے نیچے گر پڑا اور مر گیا۔ اس رات جارج کا بھوت پھر لوشیا سے ملنے آیا۔ کھڑکی سے باہر اگلے آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ اس کی چاندنی ایک رو پہلی چادر کی طرح کھلے سمندر کے سینے پہ پھیلی ہوئی تھی۔ جارج کا بھوت اور لوشیا کھڑکی کے پاس میز پر بیٹھ گئے اور بہترین اطلالہ دائیں کی چکیاں لیتے ہوئے پیار محبت کی باتیں کرنے لگے۔ جارج کا بھوت اسے سو سو برس پہلے سمندری مہموں کی کہانیاں سناتے لگا۔ اس طرح وہ اپنا جہاز سے کر جنوبی ہند کے جزائر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں طوفان آگیا۔ اس کا جہاز ٹوٹ کر غرق ہو گیا۔ وہ ایک لکڑی تختے پر تیرتا ہوا ارضی خوابوں کے جزیرے میں پہنچ گیا۔

لوشیا اپنی تھیلی پر اپنا نازک رخسار رکھے بڑی دلچسپی سے جارج کی باتیں سن رہی تھی اسے جارج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر اس کی گہری، باوقار محبت بھری آواز نے اس کا

پوری صورت لوشیا کے سامنے کھڑی کر دی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جارج اس کے سامنے کسی پر پیٹھا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ لوشیا جارج کے بھوت کی محبت بھری آوازیں کھوکھورہ گئی تھی۔ محبت کی آوازیں اسے سمندروں کے طوفان، طوفانوں کی گونج میں اور محبت بھرے دلوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں۔ اس نے اچانک جارج کی بات کاٹ کر کہا:

”جارج کیا تم ہمیشہ اسی طرح مجھ سے محبت کرتے رہو گے؟“

جارج کے بھوت کی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا:

”لوشیا! میں تو تمہاری زندگی کے بعد بھی تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ بلکہ تمہاری زندگی ختم ہونے کے بعد مجھ سے تمہارا سچا پیار شروع ہوگا۔ میں تو اس دن کی راہ دیکھ رہا ہوں جب تم اس دنیا میں اپنی طبعی عمر گزارنے کے بعد بوڑھی ہو جاؤ گی اور پھر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے پاس آ جاؤ گی۔“

لوشیا کے بدن میں ایک پکلی سی دوڑ گئی۔ کیا میں بوڑھی بھی ہو جاؤں گی؟ کیا بوڑھی ہو کر میرے چہرے پر چھریاں پڑ جائیں گی؟ پھر میں مر جاؤں گی؟ کیا میں زندگی کی لذتیں، مسرتیں اور روشنیاں حاصل کئے بغیر ہی بوڑھی ہو کر مر جاؤں گی؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں جوانی کی خوشیوں و لذتوں کے سمندر میں دوڑتے ہوئے نکل جاؤں گی۔ لوشیا کو یہ بات بڑی سی عجیب لگی کہ جارج اس کی موت اور اس کے بڑھاپے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا دل اداس ہو گیا۔

اب جارج کا بھوت روز رات لوشیا کے بیڈ روم میں آتا۔ وہ دونوں اطالوی دائی کے نیلے گلاس کے کمرندری طرف کھٹنے والی کھڑکی کے پاس میز پر بیٹھ جاتے اور پیار محبت کی جھیمی دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کیا کرتے۔ کسی وقت جارج اپنا ہاتھ لوشیا کے بالوں پر پھیرتا تو لوشیا کے سر میں سردی کی لہری دوڑ جاتی۔ وہ جارج کے بھوت کے ہاتھ کو مس کر سکتی تھی۔

بلکہ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو اس نے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ نہ ناک، نہ کان اور نہ آنکھیں۔ جرجی لوشیا اسے پیار کرتی تھی اور آدھی آدھی رات تک اس سے باتیں کرتی رہتی تھی، رشتوں، سمندری ہواؤں کے طوفانوں اور کرمس کی برف باریوں میں بھی دونوں کھڑکی

”اس عزت افزائی کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں آپ کی ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“ لوشیا نے جان بوجھ کر پوچھا۔ شاید وہ اس نوجوان سے اپنی تعریف مننا چاہتی تھی۔ آرٹسٹ نے مسکرا کر کہا

”اس لئے کہ آپ کا جسم زندگی کے تروتازہ جذبات سے بھرپور ہے۔ آپ کی آنکھوں میں مندروں کی گہرائی ہے اور آپ کے بال چنار کے پتوں کی طرح سرخ ہیں۔ شاید ایسے ہی بال بلکہ جوڈیا سلوجی کے تھے۔“

لوشیا نے کسی جیتے جاگتے گوشت پوست کے زندہ انسان کی زبانی اپنے حسن کی اتنی تعریف اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کانوں کی لومیں گرم ہو گئیں اس نے بے اختیار کہہ دیا:

”تم میری تصویر بنا سکتے ہو۔“

ازجوان آرٹسٹ خوش ہو کر بولا:

”کیا آپ میرے سٹوڈیو میں جانے کی زحمت گوارا کریں گی۔ میں آپ کو ماڈل بناؤں گا۔“

”لیکن میں تو تھوڑی دیر بعد لندن سے واپس گاؤں جا رہی ہوں۔“

”کیا آپ کل اسی وقت تشریف نہیں لاسکتے۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ شاید یہ تصویر میری زندگی کی بہترین تصویر ہو اور مجھے سالانہ نمائش میں پہلا انعام مل جائے۔“

لوشیا انکار نہ کر سکی۔ ویسے بھی اسے نوجوان آرٹسٹ کے گفتگو کرنے اور لمبے بالوں کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھک کر ادھر اٹھانے کا انداز بڑا پسند آ گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر کچھ سوچتے ہوئے کہا:

”بہت اچھا۔ میں کل اسی وقت یہاں ملوں گی۔“

آرٹسٹ نے جھک کر کہا:

”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں محترمہ!“

لوشیا مسکراتی ہوئی وہاں سے آگے چل دی۔ دوپہر کی گاڑی میں بیٹھ کر وہ واپس گرین ہاؤس

کے ساتھ لگے بیٹھے گرم گرم کافی کی پیالیاں سامنے رکھے باتیں کرتے رہتے۔

برفیں گھل رہی تھیں کہ لوشیا کو اپنی کتاب کے سسلے میں لندن جانا پڑ گیا۔ وہ صبح کی گاڑی میں بیٹھ کر لندن پہنچ گئی۔ اپنے پبلشر سے ضروری باتیں کرنے کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا پبلشر ہی کے ساتھ کھایا۔ واپس جانے سے پہلے وہ لندن کی سڑکوں پر پیدل آوارہ گردی کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے پبلشر کی گاڑی کو واپس بھجوا دیا اور اکیلی سڑک کے فٹ پاتھ پر ایک طرف کوچل پڑی۔ یہ سڑک آگے جا کر ایک بڑے ہی خوب صورت پارک میں نکل گئی تھی۔ یہاں بڑے ہی پرلے اور گھنے درختوں کے جگہ جگہ کھڑے تھے جن کے سایوں میں کہیں بچے کھیل رہے تھے اور کہیں بوڑھے بچوں پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ لوشیا کو سنہری دھوپ اور کھلے آسمان تلے یہ پارک بڑا ہی حسین لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اس پارک میں کچھ دیر تنہا بیٹھ کر موسم سے لطف اندوز ہو۔ لوشیا پارک کی ایک روش پر چلتی ہوئی اوک کے ایک گنجان درخت کے پاس آگئی۔ یہاں گل لالہ کی کیاریوں کے پاس سبز رنگ کا ایک بچہ خالی پڑا تھا۔ وہ اس بچے پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بچہ بیٹھے رہنے کے بعد لوشیا نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ دریا کی طرف آگئی۔ یہاں ایک خاموش اور پرسکون کُنچ میں اس نے ایک لمبے بالوں والے دبلے سے آرٹسٹ کو دیکھا جو سینڈ پر بورڈ رکھے تصویر بنا رہا تھا۔ لوشیا اس کے قریب سے گزری تو نوجوان آرٹسٹ کی اس پر نظر پڑ گئی۔ لوشیا کے سرخ بالوں اور متناسب جسم نے اسے بڑا متاثر کیا وہ لوشیا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا: ”اگر آپ بڑا نہ مائیں تو میں آپ کی تصویر بنانا چاہتا ہوں۔“

لوشیا نوجوان آرٹسٹ کی اس بے باکی پر دل میں بہت خوش ہوئی۔ وہ آرٹسٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس کی تصویر کو دیکھنے لگی۔ یہ تصویر پارک میں کھڑے ایک گنجان درخت کی تھی جس کے نیچے ایک بوڑھا بچہ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ لوشیا کو تصویر بڑی پسند آئی۔ تصویر کے رنگ بڑے شوخ اور زندگی سے بھرپور تھے۔ اس نے کہا:

”تم مجھے اچھے آرٹسٹ معلوم ہوتے ہو۔“

نوجوان آرٹسٹ نے جھک کر لوشیا کی تعظیم کی اور کہا:

آگئی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ بلیروم میں آئی تو اس کے کانوں میں نوجوان آرٹسٹ کی باتیں سرگوشیاں کر رہی تھیں اور اس کا یونانی دیوتاؤں جیسا بھرا بھرا خوب صورت چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا۔ جیسے کوئی اس کے پلنگ کے پاس جھکا ہوا ہے۔ لوشیا کو اپنے چہرے پر کسی کے ٹھنڈے سانسوں کی سردی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔

»جارج! کیا تم ہو؟«

»ہاں لوشیا! میں ہوں۔«

یکپٹن جارج کے بھوت کی پراسرار آواز سنائی دی۔ جارج کی آواز میں کچھ تھکن کچھ ادا می تھی۔ لوشیا کو خیال آیا کہ شاید بھوت کو پتا چل گیا ہے کہ وہ کل لندن میں نوجوان آرٹسٹ سے ملنے جا رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ اسے جارج کو ساری بات بنا دینی چاہیے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ لوشیا نے نوجوان آرٹسٹ کے بارے میں جارج کو ساری بات بتائی اور یہ بھی کہا کہ وہ کل لندن جا رہی ہے کیونکہ نوجوان آرٹسٹ اس کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔ جارج کی دھیمی سی ہنسی کی آواز آئی:

»بڑی خوشی کی بات ہے لوشیا! تمہیں ہر طرح خوش خوش زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

تم خوش ہوتی ہو تو مجھے بھی خوشی ہوتی ہے۔ شب بخیر!«

جارج کی آواز غائب ہو گئی۔ لوشیا نے ایک دو بار اسے آوازیں دیں۔ لیکن جارج کا بھوت کمرے سے جا چکا تھا۔ اس نے سوچا کہیں جارج نے حد تو محسوس نہیں کیا؟ کہیں وہ نوجوان آرٹسٹ کو اپنا رقیب تو نہیں سمجھنے لگا؟ لیکن لوشیا کیا کر سکتی تھی۔ وہ جارج کو کس طرح سمجھا سکتی تھی۔ جارج ایک روح تھی جسم کے بغیر اور لوشیا ایک روح تھی جسم کے ساتھ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ زمین پر وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھا کر نہیں چل سکتے تھے اور لوشیا کو ابھی زمین پر بہت دور تک سفر کرنا تھا۔ دوسرے روز وہ گاڑی میں سوار ہو کر جانے کی بجائے اپنی بڑی موٹر میں بیٹھ کر لندن کی طرف روانہ ہو گئی۔ آج اس نے بڑے شوخ رنگ کے فخر سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے گلے کا نیلا سکارف اور سر کے سرخ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ ستر میل

لنڈن کی رفتار پر سڑک پر لندن کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے اس کی برلن کے خوب صورت پارک کے گیٹ میں داخل ہو کر ایک طرف کار پارک پر کھڑی ہو۔ وہ وقت سے کچھ پہلے آگئی تھی۔ اس نے دریا کے کنارے بڑے درخت کے پاس جا کر جا کر نوجوان آرٹسٹ بھی وقت سے کچھ پہلے آگیا تھا اور ایک بیچ پر بیٹھا مگر بیٹ پی رہا تھا نیا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ تعظیماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھک کر لوشیا کو سلام کیا۔ بولا کہ اس کی مالک مکان بہت شور مچا رہی تھی۔ وہ اس سے تنگ آ کر وقت سے پہلے ہی۔ کچھ اسی قسم کا بہانہ لوشیا نے بھی بنایا۔ ان کی اس بہانہ سازی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک سرے کو ملنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ لوشیا کو ساتھ لے کر نوجوان آرٹسٹ کار پارک رٹ آ گیا۔ لوشیا کی بڑی گاڑی دیکھ کر وہ کچھ حیران سا ہوا۔ اس نے لوشیا کی سماجی حیثیت بارے میں کچھ ہلکی قسم کی رائے قائم کر رکھی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید یہ امر کی عورت لنڈن اسی دوست کے ساتھ سیر سپاٹا کرنے آئی ہے۔ لوشیا کی کار دیکھ کر وہ بولا:

»بڑی خوب صورت کار ہے آپ کی۔«

لوشیا مسکراتے ہوئے بولی۔ »تمہیں پسند ہے تو لے لو۔ میں دوسری گاڑی لے لوں گی۔« نوجوان آرٹسٹ کا آدھا منہ کھلا ہی رہ گیا۔ یہ ایک مذاق کا جملہ تھا، لیکن اگر نوجوان سٹ بائی کرنا تو لوشیا ضرور کار کی چابی اس کے حوالے کر دیتی۔ آرٹسٹ نے مسکرا کر کہا:

»میرا خیال ہے میرا غریبانہ سٹوڈیو اس لائق نہیں کہ وہاں آپ ایسی اونچے خاندان والوں کا ڈال بنے۔«

لوشیا نے نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا:

»مجھے تمہارے سٹوڈیو میں جا کر خوشی ہوگی۔«

لوشیا خود کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ آرٹسٹ اسے راستہ بتاتا چلا جا رہا تھا۔ فرخ سڑکوں سے ہوتے ہوئے گاڑی لندن کے گندے مندے علاقے میں داخل ہو گئی۔ لوشیا پہلے اس قے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ آرٹسٹ نے کھیانہ سا ہو کر کہا:

”مختصر میں ایک غریب آرٹسٹ ہوں۔ میں اونچے علاقے کے فلیٹ میں نہیں رہتا۔
مجھے امید ہے آپ میرے ساتھ اس علاقے میں آنے پر مجھے معاف کر دیں گی۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ آخر یہاں بھی انسان رہتے ہیں۔“
آرٹسٹ کا سٹوڈیو کاٹھ کباڑے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایک بیگی ٹیڑھی چار منزلہ عمارت
تیسری منزل پر تھا۔ جگہ جگہ رنگ بکھرے تھے۔ آرٹسٹ نے ایک کرسی کی گرد جھاڑ کر لوشیا
اس پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود ایک الماری میں سے ڈرائنگ کی چیزیں نکال کر میز پر رکھنے
پھر سگریٹ بجھا کر بولا،

”سب سے پہلے تو میں آپ کے لئے کافی بناؤں گا۔“

”مذکورہ“ لوشیا نے کہا۔ ”لیکن ہم نے ایک دوسرے کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔ میرا نام
ہے۔ میں امریکہ سے یہاں میرا سیاحت کرنے آئی ہوں۔“
نوجوان آرٹسٹ نے کہا:

”اور میرا نام الفرید ہے۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ ایک غریب آرٹسٹ۔ ایک غریب ریہ
مزدور کا بیٹا۔ جس کا اس دنیا میں اب کوئی نہیں اور خدا کا شکر ہے کہ میرا کوئی نہیں ہے
غریب اور آزاد ہوں۔ میں تصویریں بناتا ہوں انہیں بیچ کر جو دو چار پیسے مل جاتے ہیں
سے اپنی گذر اوقات کرتا ہوں۔“

لوشیا نے کہا۔ ”مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی الفرید! تم اگر چاہو تو مجھے صرف نو
کے نام سے پکار سکتے ہو۔“

”ہیلو لوشیا!“

”ہیلو الفرید۔“

دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور الفرید نے بڑی بے باکی کے ساتھ نو
کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے سرخ ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے لوشیا کو یہ بہت
لیکن وہ تڑپ کر پرے ہٹ گئی۔

”تم بڑے اکھڑ ہو گئے الفرید!“

الفرید نے اسی وقت ایک ٹوٹی ہوئی جینک میں کافی بنائی۔ دونوں کافی پیتے رہے الفرید
لوشیا کو اپنی بنائی ہوئی وائرڈ کلاور آبی رنگوں کی تصویریں دکھائیں جو لوشیا کو بہت پسند
آئی۔ لوشیا نے الفرید سے پوچھا:

”تمہارا کیا خیال ہے میرے بارے میں الفرید؟“

الفرید نے سگریٹ کا کش لگا کر دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے کہا:

”تم ایک بے حد خوب صورت جسم والی حسین عورت ہو اور میری طرح فاقہ زدہ نہیں ہو۔
یہ یہ گاڑی تمہاری ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے کسی دوست کی ہو۔ لیکن مجھے تمہاری
ی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے صرف تمہارے سرخ بالوں اور تمہارے خوب صورت جسم سے
پسی ہے۔ میں تمہیں بیٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ تم پیدا ہی اس لئے ہوئی کہ تمہیں بیٹ
یا جائے۔ تمہاری تصویر بنا کر اسے پرس کی سب سے بڑی گیلری میں رکھا جائے۔ میرا خیال
ہے میں نے اپنے خیالات تم پر اچھی طرح واضح کر دیئے ہوں گے۔“

لوشیا نے یہ باتیں ساری زندگی کسی سے نہیں سنی تھیں۔ اس کی نوجوانی غریب باپ کے
ائے میں غریبی سے جنگ کرتے گذری تھی۔ جوان ہوئی تو اسے ایک کرور پتی بڈھے خاوند
رہنہانا پڑا جس کے جذبات سرور چکے تھے۔ بیوہ ہوئی تو ایک ایسے شخص نے اس سے اظہار
بت کیا جو مرچکا تھا جو صرف اس کے کالوں تک اپنے ٹھنڈے سانس کا لمس پہنچا سکتا تھا
اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا اور جس کو وہ خود بھی نہیں چھو سکتی تھی۔ الفرید کی باتوں نے
لوشیا کو زندگی کے ایک انتہائی روشن اور حسین پہاڑ کی چوٹی پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ لوشیا
پنے جسم میں زندگی کی گرم اور تیز رو حرارت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کافی کا گھونٹ پی کر
الفرید کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا:

”الفرید! تمہاری باتوں سے مجھے بڑا سکون، بڑی خوشی مل رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں
کہ تم اسی طرح باتیں کرتے جاؤ اور میں منتی رہوں، پہروں بیٹھی منتی رہوں۔ ہماری ملاقات کو
خود سرا دن ہے۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔
الفرید نے آگے بڑھ کر لوشیا کے بالوں کو چوم لیا۔

الفریڈ نے بڑی مشکل سے بد مزاج مالک کو راضی کیا کہ وہ دو ایک دن کے اندر اندر کرائے رقم ادا کر دے گا۔

لوشیا گرین ہاؤس پہنچ گئی۔ مارتھالان میں الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے ڈال رہی تھی۔ لوشیا اس سے پوچھا کہ کوئی آیا تھا؟ مارتھانے سر ہلا کر کہا کہ کوئی نہیں آیا تھا۔ پھر حیرانی کے ساتھ

”کوئی ایک گھنٹہ پہلے ڈرائنگ روم میں لگی اس نیلی آنکھوں والے کیپٹن کی تصویر اپنے فرش پر گر پڑی۔“

”پھر؟“ پھر کیا بیگم صاحبہ ابھی تک وہیں پڑی ہے۔ میں اکیلے تو اسے دیوار پر نہیں لٹکتی تھی۔“

”آؤ مارتھا! تصویر کو پھر سے لگا دیتے ہیں۔“

لوشیا سمجھ گئی کہ یہ تصویر بھی ٹھیک اسی وقت گری تھی جب الفریڈ کے سٹوڈیو میں اس دیوار سے تصویر گری تھی اور یہ جارح کی روح نے ایسا کیا تھا۔ لوشیا دل میں افسوس کرنے لگی کہ اس نے جارح کی روح کو کیوں صدمہ پہنچایا گیا مگر اب اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ ریڈ نے لوشیا کے دل کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔ اس نے مارتھانے کے ساتھ لڑکھانے جارح کی تصویر دیوار کے ساتھ پھر سے لگا دی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی تصویر کو غور دیکھتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے جارح کی آنکھوں میں حزن و ملال کا رنگ اتر آیا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد لوشیا نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر سر پہر کو سمندر کے کنارے چلی گئی۔ اس کے دل میں جارح کی طرف سے قسم قسم کے خیال آ رہے تھے وہ اس کے آگے دل کھول کر رکھ دینا چاہتی تھی۔ اس نے چلتے چلتے آہستہ سے جارح کی روح کو آواز دی۔

”کا خیال تھا کہ شاید جارح کی روح اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہو۔ جارح کی روح نے کوئی زندہ دی۔ لوشیا نے دیکھا اس کے پہلو بہ پہلو ریت پر پاؤں کے نشان بھی نہیں پڑ رہے۔“

”جی ہاں! روح وہاں نہیں تھی۔ پھر وہ کہاں تھی؟ لوشیا سیر سے واپس آئی تو بڑی تھکی ہوئی اور لان میں کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ مارتھا اس کے لئے پھلوں کے جوس کا گلاس لے آئی

”مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“

آرٹسٹ کی کھلی کھڑکی میں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور دیوار کے ساتھ لگی پہلی ایک تصویر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ الفریڈ اور لوشیا نے حیران ہو کر تصویر کو دیکھا۔ کیونکہ اس وقت باہر بالکل ہوا نہیں چل رہی تھی۔ الفریڈ نے اٹھ کر تصویر پھر سے ٹانگ دی۔

”یہ ہوا کہاں سے آگئی؟“

لوشیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ ہوا کہاں سے آئی ہے اور اس ہوا کے ساتھ کون سٹوڈیو میں آیا ہے۔ یہ جارح تھا۔ جارح کی روح تھی مگر اس کا ہاؤس کا بھوت تھا نہ! اسے لوشیا کا الفریڈ سے اظہار محبت اچھا نہیں لگا تھا لوشیا نے چاہا کہ وہ جارح سے مخاطب ہو کر کہے کہ وہ الفریڈ کے آگے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ الفریڈ کے سامنے وہ جارح سے کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔

الفریڈ نے اس روز لوشیا کے کتنے ہی پنسل کیچے بنائے۔ کیچے بڑے مکمل تھے اور ان کے خطوط بڑے اشرافیہ اور اظہار کی شدت سے بھر پور تھے۔ لوشیا جانے کے لئے اٹھی تو آرٹسٹ الفریڈ نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور کہا کہ وہ کل بھی ضرور آئے۔ لوشیا نے پوچھا کہ کیا کل آنا ضروری ہے؟

الفریڈ نے کہا:

”ہاں لوشیا! ایسا لگتا ہے کہ اب تمہارا ہر روز آنا ضروری ہے۔ کیا تم کل آؤ گی؟“

”ہاں! ضرور آؤں گی۔“

لوشیا چلی گئی۔ الفریڈ اسے چھوڑنے نیچے سڑک تک آیا۔ لوشیا اپنی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ بلڈنگ کی مالک بڑی تیز لگا ہوں سے ان دونوں کو الوداعی کلمات کہتے دیکھتی رہی۔ جب لوشیا چلی گئی تو ملک نے الفریڈ کو جھڑک کر کہا:

”کم بخت! یہ کس نواب زادی کو بچا نسا ہے؟ خیر مجھے تو اپنے کرائے سے غرض ہے۔ تم جاؤ جہنم میں۔ لاؤ پچھ ماہ کا کرایہ نہیں تو آج ہی مارا سامان کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دوں گی۔“

”جارج! تم کہاں ہو؟ میرے پاس آؤ۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے دل کی باتیں
 میں باتیں جو میں نے اس سے پہلے تم سے کبھی نہیں کی۔ سنو! میرے اندر بھی ایک دل ہے،
 بادل جو محبت کے نام سے نا آشنا رہا۔ جس کو کسی نے اپنی محبت کا گیت نہ سنایا۔ سنو!
 بن تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں الفریڈ سے بھی محبت کرتی ہوں۔ تم زندگی میں مجھے کبھی نہیں
 سکتے۔ تم زندہ ہو کر میرے سامنے نہیں آ سکتے۔ لیکن الفریڈ زندہ ہے، وہ گوشت پوست
 مانا ہوا نوجوان ہے، وہ میرے بالوں کو چوم سکتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے
 اپنے گلے سے لگا سکتا ہے۔ اس کے لمس میں محبت کی گرمی ہے۔ اس نے میرے ٹھنڈے رخ
 جذبات کی برف کو اپنی محبت کی گرم دھوپ سے پگھلا دیا ہے۔ میں ایک انسان ہوں ایک
 عورت ہوں۔ زندہ عورت، مجھے بتاؤ میں کہاں جاؤں؟ الفریڈ کو چھوڑ دو تو تمہارے پاس کیسے
 آؤں؟ الفریڈ کے پاس جاؤں تو تمہیں کیسے چھوڑ دوں؟ مجھے جواب دو۔ تم بولتے کیوں نہیں
 تم خاموش کیوں ہو؟ جارج! جارج کی روح! جارج کی روح!.....“
 وہاں سوائے چٹانوں سے ٹکراتی سمندر کی لہروں کے شور کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔
 جارج کی روح نے کوئی جواب نہ دیا۔ جارج کی روح وہاں کہیں بھی نہیں تھی۔
 لوشیا نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں ڈیچاں لیا اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ اس
 کی سسکیاں سمندر کے شور میں ڈوب گئیں۔ شام کی سرفخی رات کے اندھیرے میں بدل گئی
 آسمان پر سمندر کے اوپر قطبی ستارہ چمکنے لگا۔ لوشیا چٹان پر سے اٹھی اور واپس گھس کر
 طرف چل پڑی۔ اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا سر بھاری ہو گیا تھا اور درد کرنے
 لگا تھا۔ اپنے بیدار روم میں آ کر اس نے کانا کھا کر کافی پی اور پھر کسل اور ڈھ کر سو گئی۔ اسے
 بہت جلد نیند آ گئی۔ آدھی رات کو اس کی اپنے آپ آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی جھین
 سے فرسش پر چل رہا ہے۔ لوشیا کو کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی اس نے آہستہ
 سے آواز دی:

”جارج! کیا یہ تم ہو؟ جارج! مجھے معاف کر دو۔ ایک بار مجھ سے بات کرو۔ آخری
 بار میری ایک بات سن لو! جارج! وہ قدموں کی دھیمی سی چاپ رک گئی۔ کمرے میں گہری

لوشیا نے پھلوں کے رس کا گلاس پی لیا۔ پھر آرام کرسی کی پشت سے لگا کر آسمان پر غروب
 سورج کی سرفخی کو نکلنے لگی۔ اسے آسمان پر جارج کی تصویر دکھائی دی جس کی نیلی آنکھیں اور
 پر پھیلنے پھیلنے ایک سمندر بن گئیں۔ اس سمندر میں بھیا نک طوفان آگیا اور لوشیا نے ایک
 کو اس میں ہینکو لے کھا کر ڈوبتے دیکھا۔ اس کے کانوں میں ڈوبتے ملاحوں کی چیخیں سنائی دینے
 ان میں ایک چیخ کیپٹن جارج کی بھی تھی۔ لوشیا نے گہرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ سر کو جھکا
 کراٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا؟ ایگم صاحبہ؟“ مارتھا نے کپڑے الگنی پر ڈالتے ہوئے رک کر پوچھا۔ کچھ نہیں،
 سر درد کر رہا ہے۔ میں بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔“

لوشیا بیڈ روم میں آ کر ہلنگ براؤنڈھے منہ گر پڑی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ ر
 روتے جب اس کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ہلکی بھلکی ہو گئی ہے۔ وہ
 کر سمندر کی طرف کھٹنے والی کھڑکی میں آنکھ کھڑی ہو گئی۔ اس نے دور بین میں سے سمندر کو د
 سمندر کی لہریں دور دور تک اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر سمندری طوفان اور ڈو
 ملاحوں کی آوازیں سنیں۔ وہ بیڈ روم سے نکل کر نیچے آ گئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں لگی
 جارج کی تصویر سے آنکھیں جھرا کر باہر لان میں نکل گئی۔ لان خالی تھا۔ درخت کے نیچے آرا
 ویسے ہی بڑی تھی۔ مارتھا جا چکی تھی۔ شاید باورچی خانے میں کانا تیار کر رہی تھی۔ لوشیا
 باؤس کے گیٹ میں سے گزر کر سمندر کی طرف چل پڑی۔ شام غروب ہو رہی تھی۔ سمندر ک
 سے خشک ہوا کے جھونکے اس کے سرخ بالوں اور بادامی رنگ کے گاؤں کو اڑا رہے تھے۔
 سمندر پر کافی دور چلنے کے بعد وہ ان بھوری چٹانوں کے پاس آ کر رک گئی جہاں سمند
 لہریں ٹکراتی مارتھا کی شور پیدا کر رہی تھیں۔

لوشیا چٹانوں سے ٹکراتی موجوں کو دیکھنے لگی۔ نیلے پانی کی لہریں دور دور سے
 چٹانوں سے اپنا سر پھوڑتیں اور سفید جھاگ اڑا کر واپس چلی جاتیں۔ لوشیا کے دل کی
 حالت تھی۔ وہ ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ پانی کے چھینٹے اس کے کپڑوں پر پڑنے لگے۔ لوشیا
 کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے جارج کی روح کو آواز دی:

خاموشی چھا گئی۔ سمندر کی طرف سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا۔
نے اٹھ کر کھڑکی کے باہر جھانکا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ سمندر پر دو رنگ تارکے
چھائی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کھڑکی بند کی اور پلنگ پر گر کر گہ
بند کر لیں۔

دوسرے روز اسے الفریڈ کو ملنے جاتا تھا۔ اس نے الفریڈ سے وعدہ کر رکھا تھا۔ ایک بار
اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ الفریڈ کے پاس نہ جائے۔ وہ جارج کو بھی نہ پکارے۔ وہ ان سب
کو بھول جائے۔ لیکن گھڑی نے نو بجائے تو لوشیا کی آنکھوں کے سامنے لمبے بالوں اور لونیائی دیتا
ایسی شکل والے آرٹسٹ الفریڈ کی شکل گھوم گئی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا لوشیا کا بے چینی
سے انتظار کر رہا ہو گا۔ لوشیا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے الماری کھول کر دراز میں سے
نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر پیس میں رکھیں اور باہر آ گئی۔ مارتھالان میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی
تھی۔ لوشیا نے اسے بتایا کہ وہ لندن اپنے پیشرے ملنے جا رہی ہے۔ شام تک واپس آ جائے گی۔
گاڑی میں بیٹھ کر اس نے انجن مٹا رکھا اور لندن جانے والی مٹرک پر ہوا کے ساتھ باتیں کرنے
لگی۔ سارا رستہ وہ نوجوان آرٹسٹ اور جارج کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے
خیالات کو بھٹک دیا اور صرف نوجوان آرٹسٹ کے خیال کو اپنے ذہن میں رکھا۔

گاڑی اب لندن کے مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔ شہر کی پرہجوم چوڑی چکی مٹرکوں پر
سے ہوتی لوشیا شہر کے گجوان آباد غریب علاقے میں آ گئی۔ اس نے الفریڈ کے مکان کے نیچے گاڑی
کھڑکی کر کے مارن دیا۔ الفریڈ نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ لوشیا گاڑی میں سے باہر نکل رہی
تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے ہاتھ ہلا کر ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا اور ان کے چہرے
خوشی سے کھل گئے۔ اسٹوڈیو میں جا کر لوشیا نے دیکھا کہ آرٹسٹ الفریڈ نے اپنی غریبہ حیثیت کے
مطابق کمرے کو خوب سجا رکھا تھا۔ میز کے گلدان میں گلاب کے تازہ پھول سجے تھے۔ فرش بھی صاف
تھا اور چیزیں بڑے سلیقے سے اپنی اپنی جگہوں پر لگی تھیں۔ لوشیا کا خیر مقدم الفریڈ نے اسے گلے لگا
کر اس کے ہونٹوں کو چوم کر کہا۔ لوشیا کے جسم نے بہترین عطر کی پٹیں اٹھ رہی تھیں۔
”مجھے امید تھی لوشیا تم ضرور آؤ گی۔“

لوشیا نے پُرا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا:

”میں نے وعدہ جو کیا تھا۔ تم نے تو آج کمرے کو مڑا خوب صورت بنا رکھا ہے۔“

”یہ صرف تمہاری آمد کی خوشی میں لوشیا! آہ! تمہیں کیا معلوم لوشیا کہ میں تم سے کس قدر
پرتا ہوں۔ ساری رات بستر پر کڑویں بدلتا رہا۔ صرف تمہارے خیال میں سلگتا رہا۔ لوشیا!

مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میری حالت اس پکور کی طرح ہو گئی ہے جو چاندنی راتوں میں
کے پیچھے پانگوں کی طرح گھومتا پھرتا ہے۔“

لوشیا کی آنکھیں محبت بھری باتیں سن کر اپنے آپ بند ہونے لگیں۔ الفریڈ نے جھک کر لوشیا
کھیں چوم لیں۔ لوشیا نے کہا۔

”الفریڈ! کیا تم اسی طرح ساری زندگی مجھ سے محبت کرتے رہو گے؟ مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے۔
بول تو نہیں جاؤ گے؟“

آرٹسٹ نے سرگوشی میں کہا:

”کبھی نہیں لوشیا! کبھی نہیں! میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ تمہاری محبت کا نقش میرے
پراتنا گہرا ہے کہ میں اگر چاہوں بھی تو تمہیں نہیں بھلا سکتا۔ میں ہر گھڑی، ہر پل تمہیں یاد کرتا
ہوں۔“

انہوں نے ایک ہی میز پر ساتھ ساتھ بیٹھ کر دوسرے کا کھانا کھایا۔ کافی پی۔ پھر الفریڈ ایک
سی سے انگوروں کی دائیں کی بوتل نکال کر لے آیا۔ وہ بڑے مزے سے دائیں کی چسکیاں لیتے
تے محبت کی دنیا میں کھو گئے۔ الفریڈ نے کہا:

”میری جان! اب میں تمہاری ایک نیوڈ تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا
تصویر یورپ کے تمام آرٹسٹوں کی تصویروں کو مات کر دے۔“

لوشیا نے ذرا بے چین ہو کر کہا۔

”لیکن..... الفریڈ..... اس کے لئے تو مجھے سارے کپڑے اتارنے پڑیں گے۔“

پھر کیا ہوا لوشیا! یہ تو آرٹ ہے۔ یہ توفی ہے۔ کپڑے اتارنے سے کیا ہو جائے گا۔
تمہاری تصویر ہی تو بناؤں گا۔“

لوشیا واپس گرین ہاؤس آگئی۔ اب وہ محبت کی خواب انگیز دنیا میں کھو چکی تھی۔ رات کو س نے خواب میں بھی الفریڈ کو دیکھا کہ اس پر جھکا اس کے سرخ بالوں کو چوم رہا ہے۔ وہ سوتے ہی ہی مسکرا دی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے الفریڈ کو فون کیا۔ یہ نمبر الفریڈ نے ساتھ والے لیٹ کا دے رکھا تھا۔ لوشیا نے الفریڈ کو بتایا کہ اس نے رات خواب میں اسے اپنے سرخ بالوں کو بوسہ دیتے دیکھا ہے۔ الفریڈ نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا کہ وہ بھی ساری رات اس کے سرخ ہونٹوں کو پیار کرتا رہا ہے۔

”لوشیا! تم کس وقت آرہی ہو؟ میں تمہارا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں۔“

لوشیا نے محبت بھرے لہجے میں کہا:

”ابھی تو دن نکلا ہی ہے الفریڈ پیارے! ناشتے کے بعد پہنچ جاؤں گی۔“

”تم ناشتا میرے ساتھ آکر کرو۔ میں انتظار کروں گا۔ بس میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔ اگر تم نہ آئیں تو میں ناشتا نہیں کروں گا۔“

لوشیا کی حالت اس تیر کی مانند تھی جو اپنی کمان سے نکلنے کو بے تاب ہو۔ اسے سمندر میں چھلانگ لگانے کے لئے صرف ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ اشارہ اسے مل گیا تھا اور اس نے چھلانگ لگا دی۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی الفریڈ کے سٹوڈیوز میں پہنچ گئی۔ آج وہاں کی حالت پہلے سے بدلتی ہوئی ہے۔ کمرے میں کچھ نئے کینوس اور کھانے بیٹے کی چیزوں کے تازہ ڈبے پڑے تھے۔ الفریڈ نے اپنے لئے سگریٹوں کے کتنے ہی پکیٹ اور شراب کی بوتلیں خرید کر بھاری کھی تھی۔ ظاہر ہے لوشیا کے ڈائریوں کی امداد سے وہ خوش حال ہو گیا تھا۔ اس نے لینڈ لریڈی کو بھی چھ ماہ کا پیکیج کرایہ دے دیا تھا۔ وہ نیلے رنگ کی نئی جیکٹ اور زرد پتلون میں ملبوس تھا اس کے بالوں سے اعلیٰ قسم کے شیمو کی خوشبو آرہی تھی اور بھورے رنگ کی مونچھیں بڑی نفاست سے ترشی ہوئی تھیں۔ میز پر کافی کا نیا سیٹ اور ایک نئی جاپانی کتلی رکھی تھی۔ جس میں سے کافی کی گرم گرم مہک اُٹھ رہی تھی۔ چیکو سلاویکیہ کی پھولدار پلیٹوں میں سنہری توش اور زرد مکھن کی ٹیکہ گلاب کے بھرے ہوئے گلدان کے پاس بڑی خوب صورت لگ رہی تھی لوشیا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی ذرا سی مدد سے الفریڈ نے بہتری کی طرف ترقی کی ہے۔ وہ چاہتا

لوشیا اس نوجوان آرٹسٹ کی جادو بھری باتوں میں اس قدر کھو گئی تھی کہ اس نے بڑے بڑے پیچھے جا کر اپنے سارے کپڑے اتار دیئے اور پلنگ پر الفریڈ کی مرضی کا پوز بنا کر نیم دراز ہو گئی۔ الفریڈ لوشیا کے جسم کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ لوشیا کا بدن ایک بھر پور کلاسیکی بدن تھا ایک لمحے کے لئے تو اسے احساس ہوا جیسے مونا لیزا اس کے سامنے کپڑے اتار کر لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے سینڈرپر بورڈ لگایا اور چار کولر جلدی جلدی اس کا پیچ بنانے لگا، وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا اور سیکچ بناتے ج رہا تھا۔ آدھے گھنٹے میں اس نے سیکچ مکمل کر لیا اور پھر لوشیا کے پاس آکر پلنگ پر بیٹھ کر اس نے جھک کر لوشیا کے حسین نازک جسم پر ہاتھ پھرنا شروع کر دیا۔

لوشیا سمٹ گئی۔ الفریڈ اور آگے بڑھ گیا۔ لوشیا نے ایک ہاتھ سے الفریڈ کو پر کیا اور پھر دوسرے ہاتھ سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ وہ ایک ایسے باغ عدن میں پہنچ گئی جہاں دریاؤں کی اچھلتی ہوئی میٹھی لہروں کا سنگم تھا۔ جہاں درختوں پر سرخ رنگ کے پرن بول رہے تھے۔ جہاں آسمان پر ستاروں کی مہتابیاں چھوٹ رہی تھیں۔

لوشیا کا خواب ٹوٹ گیا تو انہوں نے بڑی محبت سے بیٹھ کر کافی پی۔ لوشیا نے پر میں سے ڈائریوں کی گڈی نکال کر الفریڈ کے آگے رکھ دی۔ یہ دو ہزار ڈالر کے نوٹ الفریڈ نے کہا:

”یہ کیا ہے لوشیا؟“

لوشیا نے مسکرا کر کہا:

”تم نے اس روز کہا تھا ناں کہ تمہیں مکان کی مالکتہ تنگ کرتی ہے۔ یہ اس کو دینے کے لئے ہے۔ تم کچھ رنگ لے آنا۔ آخر تمہیں میری تصویر بھی تو بنانی ہے۔“

الفریڈ نے لوشیا کے مجبور کرنے پر ڈائریوں کی گڈیاں لے کر رکھ لیں۔ اب شام ہو رہی تھی۔ لوشیا جانے کے لئے اٹھی۔ الفریڈ نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس سے لیا کہ وہ کل بھی ضرور آئے گی۔ لوشیا محبت کے سمندر میں بہہ جا رہی تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ کل بھی ضرور آئے گی۔

یہی تھی۔ اگر الفرڈ ساری رقم شراب میں اڑا دیتا تو اسے دکھ ہوتا۔

سٹوڈیو میں آتے ہی اس نے الفرڈ کو گلے لگایا۔

”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے الفرڈ کہ تم نے اپنا معیار زندگی بلند کر لیا ہے۔“

الفرڈ مسکراتے ہوئے اعلیٰ قسم کا سگریٹ سلا کر بولا :

”میں نے ہمیشہ ایک بہترین زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھا ہے لوشیا! میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے میرے خوابوں کی دنیا سے ہمکنار کر دیا۔“

انہوں نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر لندن کی پارکوں کی سیر کرنے نکل گئے۔ دوپہر کے کھانے تک وہ شہر کی تفریح گاہوں میں گھومتے پھرتے سیر کرتے رہے،

جڑیا گھر میں انہوں نے بلایا کے بندروں کو چنے ڈالے، عجائب گھر میں انہوں نے مصر کی قدیم ملکاؤں کی میموں کو محبت کی نظروں سے دیکھا اور قدیم مصر کے محبت بھرے گیت دہرائے۔ پیکاڈلی سرکس میں

انہوں نے ڈنمارک سے آئے ہوئے تروتازہ گلابوں کے گچھے خرید کر گاڑی میں رکھے، ایک بہت بڑے شوروم میں جا کر لوشیا نے الفرڈ کو نیا سوٹ، نئے بوٹ، عطر کی قیمتی شیشیاں، سویٹین کی کلون

فرانس کی وائین اور جاپان کا ایک بڑا خوب صورت ٹریپ ریکارڈر خرید کر دیا۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے ایک عالی شان ہوٹل میں بیٹھ کر کھایا۔ سٹوڈیو میں واپس آکر الفرڈ نے دو گلاسوں

میں فرانس کی اعلیٰ وائین بھری اور ٹریپ ریکارڈر کے ساتھ لگا ہوا ریڈیو اون کر دیا۔ تیز انگریز میوزک کی دھن پر وہ دونوں کمرے میں رقص کرنے لگے۔ فریج وائین کی گرمی ڈنمارک کے گلابوں

کی خوشبو اور کوپن ہیگن کی کلون کی وحشت انگیز تھک نے لوشیا کو پاگل کر دیا۔ وہ ناچتے ناچتے پسینے میں شرابور ہو کر الفرڈ کی باتوں میں گر پڑی اور ایک بار پھر بھرتی ہوئی سمندری لہروں

اور چٹانوں سے ٹکراتی جھاگ اڑاتی موجوں کی دنیا میں پہنچ گئی۔ شام کو وہ تھکی ماندی گرین باؤں پہنچی، مگر اس کا دل محبت کی لذتوں سے چور تھا۔ اس نے ایک کیف کے عالم میں مارتھا کے ساتھ

بیٹھ کر کھانا کھایا اور بیڈ روم میں جا کر ایسی گہری نیند سوئی کہ اگلے روز دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔

اب ایک بار پھر وہ الفرڈ کے پاس جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ وفادار خادماں مارتھا

نے اپنی بیگ صاحبہ میں ایک خوشگوار تبدیلی دیکھی تھی۔ وہ بہت خوش تھی کہ اب اس کی مالک کبھی اس اور روتی ہوئی آنکھوں سے نہیں ملتی۔ اس نے کبھی مالک سے نہ پوچھا تھا کہ وہ شہر میں سے ملنے جاتی ہے۔ لوشیا نے بھی مارتھا سے الفرڈ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ محبت کا راستہ گناہ کھائی کے ساتھ ساتھ ہو کر گذرتا ہے۔ انسان کا ذرا سا بھی پاؤں پھسل جائے تو پھر اسے گناہ کھائی میں گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ لوشیا نکلی تو محبت کی دل آویز راہوں پر تھی۔ لیکن وہ پھسل کر گناہ کی کھائی میں گر پڑی تھی۔ وہ اس کھائی کی گہرائیوں میں اتنی دور نکل گئی تھی۔ اب اگر وہ خود بھی جاہلی تو واپس نہیں آ سکتی تھی۔ اس پر ایک نشہ ساطاری تھا۔ اس نشہ سے وہ سوائے الفرڈ کے دنیا کی ہر شے کو بھول گئی تھی۔ الفرڈ کی دنیا ہی بدل گئی تھی اب شہر کے غریب علاقے کی گنجان آبادی سے نکل کر ایک ماڈرن علاقے کے خوب صورت فلیٹ آگیا تھا۔ اس کا سٹوڈیو دیکھ کر کسی امیر زادے کے سٹوڈیو کا گمان ہوتا تھا۔ زندگی کی ہر بات اسے میسر تھی۔ لوشیا کے پرس کا منہ الفرڈ کی ہر ضرورت کے لئے ہر وقت کھلا رہتا اس نے لوشیا کو جیسے اپنے جادو کے پھندے میں پھانس لیا تھا۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر قدم نہ اٹھاتی تھی۔ اس کروڑپتی امریکی بیوہ کی دولت سے الفرڈ نے اپنا الگ بینک بیلنس اکاؤنٹ لے لیا ہے۔

لوشیا نوجوان آرٹسٹ کی محبت میں دیوانی ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی اسے جارج کی روح کا آقا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ہزاروں سال پہلے اس نے ایک مہمانا خواب دیکھا ہو۔

اب جارج کی روح کی آواز کبھی سنائی نہیں دی تھی۔ جارج کی روح نے بھی شاید اکوہلا دیا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ جارج کی روح یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔

نیا اپنی زندگی، اپنی جوانی کا پورا پورا حق استعمال کر رہی تھی اور جارج کی روح اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جارج کی روح ادا اس اور

وش ہو کر کھلے سمندروں کی وسعتوں کے اوپر پھیلے ہوئے سفید بادلوں میں گم ہو رہی ہے۔

رات کی تاریکیوں میں گناہ کا بویا ہوا بیج آخر دن کی روشنی میں ننھا سا پودا بن کر

باہر شیار آدمی تھا۔ فوراً ہی خوش ہو کر بولا:

”بڑی خوشی کی بات ہے لوشیا۔“

اور پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا اور گلی میں جھانکنے لگا۔ لوشیا نے اس کو پیچھے سے اپنی خوشی میں لے لیا اور اس کے چوڑے شانے پر اپنا رخسار رکھ کر کہنے لگی کہ کیا اسے خوشی نہیں ہوئی؟ لفریڈ نے بڑی مشکل سے مسکراتے ہوئے کہا: لیکن اس کا کیا فائدہ ہے لوشیا۔ ہم تو شادی شدہ نہیں ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟“

لوشیا نے لفریڈ کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہا:

میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم شادی کر لیں گے لفریڈ! آج ہی گرجے میں جا کر شادی کر لیں گے۔ پھر تم میرے ساتھ گرین باؤس اٹھ چلنا۔ تم میرے خاوند اور اس کے گھر کے مالک بن کر رہو گے۔“

لفریڈ نے سگریٹ ہولڈر سے نکال کر پاؤں تلے مسل دیا اور پھر صوفے پر بیٹھ کر گہری سوچ بن ڈوب گیا۔ لوشیا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”تم ادا س کیوں ہو گے لفریڈ؟ کیا تم کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا؟ کیا تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہو؟“

لفریڈ اتنی جلدی لوشیا کو ماتھے سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس نے لوشیا کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا:

”ایسی بات نہیں ہے لوشیا! میری اس سے زیادہ اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ تم مجھے اپنا خاوند بنالو۔“

”پھر تم ایک دم سے سوچ میں کیوں ڈوب گئے ہو؟“

لفریڈ نے پلٹ کر لوشیا کو سنجیدہ چہرے سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

بولا:

”میں صرف ایک شرط پر تم سے شادی کر سکتا ہوں۔ لوشیا کہ تم..... تم اس بچے کو ضائع کر دو لوشیا پر جیسے بچی سی گری۔ ایک مدت کے بعد اس کے شجر امید پر پھل آیا تھا اور لفریڈ

نمودار ہو گیا۔ لوشیا کو محسوس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ لوشیا ایک مالدار امریکی کی بیوہ تھی معاشرے میں اس کی ایک اہمیت اور ایک اہم مقام تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے لفریڈ کو گرین باؤس میں ٹھہر جانے پر کبھی مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی کہ اس سے اس کی بدنامی ہوگی۔ وہ شادی کے بغیر لفریڈ کو اپنے گھر نہیں رکھ سکتی تھی اور شادی کا خیال اسے اس وقت آیا جب اس کے پیٹ میں لفریڈ کے گناہ کا پھل حرکت کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے لفریڈ سے شادی کر لینا چاہیئے۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور لفریڈ بھی اس پر جان نثار کرتا ہے۔ پھر اس کو کچھ بھی ہونے والا ایک مدت کے بعد اس کے سوگھے ویران جن میں بہار آئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے ناامید کر دیا تھا کہ اس کے ہاں کبھی اولاد نہیں ہوگی۔

لندن کے بوڑھے ڈاکٹر نے جب اس کا معائنہ کرنے کے بعد اسے بتایا کہ وہ ماں بننے والی تو لوشیا بے حد خوش ہوئی، اسے یقین تھا کہ لفریڈ بھی یہ خوش خبری سن کر بے حد خوش ہوگا وہ گا میں بیٹھ کر بھاگی بھاگی لفریڈ کے فلیٹ پر پہنچی۔ لفریڈ نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس صوفے پر نیم دراز جا کے سگریٹ ہولڈر میں سگریٹ سلگائے رسالہ پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی ٹیپ ریکارڈ پر گام جڑا گا نا ہو رہا تھا۔ لفریڈ کا ایک پرگاہنے کی دھن پر تھرک رہا تھا۔ لوشیا نے اندر جاتے ہی لفریڈ کا چوم لیا۔ لفریڈ نے کوئی حرکت نہ کی۔ اب اسے لوشیا کے ہونٹوں میں وہ مٹھاس اور گرمی نہ ملتی تھی پھر بھی اس نے اپنے طرز عمل سے یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ لوشیا کو محض سکے پیدا کرنے والی مشین سمجھتا ہے۔

لفریڈ نے رسالہ پھینک کر آنکھیں بند کر کے لوشیا کے گلے میں بائیں ڈال دی اور اسے بالکل آزادانہ چوم کر بولا:

”ڈیکٹر آج بڑی خوش ہو۔ کیا بات ہے؟“

لوشیا نے کہا:

”ایک خوشی کی بات ہے۔ کان میں کہوں گی۔“

لفریڈ نے اپنا کان مسکراتے ہوئے لوشیا کے ہونٹوں کے پاس کر دیا۔ جب لوشیا نے بتایا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے تو لفریڈ کے چہرے کی ہنسی ایک دم غائب ہو گئی۔

اسے بھی نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا:

”یہ..... یہ تم کسی عجیب شرط لگا رہے ہو۔ الفرڈ! تم اس ہونے والی نفی سی جان کے لئے پریشان کیوں ہو؟ آخر ہمیں شادی تو کرنی ہی ہے۔ یہ تو ہمارا جائزہ بچہ ہوگا۔“

الفرڈ کمرے میں ٹپلے لگا:

”میں مجبور ہوں لوشیا! میں جانتا ہوں، شادی کے بعد یہ ہمارا جائزہ بچہ ہوگا۔ لیکن میں تمہارے ساتھ اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ یہ بچہ ضائع نہیں ہو جاتا۔ یہ میری ایک ایسی مجبوری ہے جس کو میں تمہارے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔“

لوشیا صوفے کی پشت سے سرگرا کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنا جسم ٹھنڈا ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے الفرڈ سے پانی مانگا۔ الفرڈ نے اسے پانی کا گلاس دیا۔ پانی پی کر لوشیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ الفرڈ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس پر اپنی گفتگو کا جادو کرنے لگا۔

”لوشیا! خدا کے لئے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ تم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

لوشیا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ”پھر تم میرا بچہ کس لئے ضائع کرنا چاہتے ہو!

”تم بچہ ضائع ہونے کے بعد مجھے چھوڑ دو گے۔ مجھ سے شادی نہیں کر دو گے۔ تمہارا دل اب مجھ سے بھر گیا ہے۔ تم کسی دوسری لڑکی سے محبت کرنے لگے ہو۔“

الفرڈ نے لوشیا کو بہت سا پیار کرنے کے بعد کہا:

”میں سوائے تمہارے اور کسی سے محبت نہیں کرتا لوشیا! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سوائے

تمہارے میری زندگی میں دوسری کوئی عورت نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کرنے کو اپنی زندگی

کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ تمہارے بغیر میری زندگی ایک ویران جنگل کی

طرح ہوگی۔ جس میں کبھی بہار کا گدرد ہو۔ میں دل و جان سے تمہیں چاہتا ہوں۔ بس تم میری

مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے میری اتنی سی بات مان لو اور اس بچے کو ضائع کرادو۔ ابھی کوئی

نقصان نہیں ہوگا اور پھر بچہ پھر بھی پیدا کریں گے۔ شادی کے بعد ہم جتنے چاہیں بچے پیدا کر سکتے

ہیں۔“

لوشیا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹروں نے مجھے کہہ دیا تھا کہ بچہ نہیں ہوگا۔ اب میری گودہری ہوئی ہے تو تم اسے دن اجاڑ رہے ہو۔ کیا جانے پھر مجھے کبھی بچہ نہ ہو۔ میں کبھی بھی ماں نہ بن سکوں۔“

الفرڈ نے بڑی مکاری سے لوشیا کی آنکھوں پر بوسہ دے کر کہا:

”ایسا کبھی نہیں ہوگا لوشیا! اب جبکہ تمہیں ایک بار بچہ ہوا ہے تو یقین کرو تم دوسری رہیں ماں بنو گی۔ تمہیں شادی کے بعد بھی بچہ ضرور ہوگا۔ لوشیا! کیا میری خاطر میری محبت کی اظہار قربانی نہیں کر سکتیں؟“

لوشیا کا دل پگھلنے لگا تھا۔ الفرڈ کی محبت اس کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی تھی۔

”نہ کہہ۔“ آخر تمہیں ایسی کیا مجبوری ہے الفرڈ کہ تم یہ بچہ رکھنا نہیں چاہتے؟ کیا تم مجھے بھی بتاؤ گے؟ آخر میں تمہاری بیوی بننے والی ہوں۔“

الفرڈ نے لوشیا کا سرخ بالوں والا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا:

”پیاری لوشیا! یہ ایک ایسا راز ہے جس پر سے پردہ میں شادی کی پہلی رات ہی اٹھاؤں

- مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہارا ہوں اور ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔ تم کلی یہ بچہ ضائع کرادو۔

ما پر سوں تم سے گرجے میں جا کر شادی کر لوں گا۔“

لوشیا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ بچہ ضائع کرانے پر راضی ہو گئی تھی۔ اس پر الفرڈ کی جادو

ری پر محبت باتوں کا اثر ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ اسے اپنی محبت اور شادی شدہ زندگی کی

الطرح کی قربانی دے دینی چاہیے۔ آخر الفرڈ اس سے شادی کر رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو بچہ

رہی ہو جائے گا۔ اس نے الفرڈ کی طرف دیکھ کر کہا:

”میں تمہاری محبت کی خاطر یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔“

الفرڈ نے خوش ہو کر لوشیا کو اپنے گلے سے لگایا۔

دوسرے روز لوشیا کو ساتھ لے کر الفرڈ شہر کے سب سے بڑے اور مشہور ڈاکٹر کے

لینک میں گیا۔ ڈاکٹر نے ساری بات سن کر یہ ناجائز کام کرنے سے انکار کر دیا۔ الفرڈ اب

بہی ایک جاننے والی لیڈی ڈاکٹر کے پاس آ گیا جو چوری چھپے یہ کام کرتی تھی۔ اس کو لوشیا

”کیوں الفرڈ! کیسی لگتی ہوں میں؟“

”تم اس وقت مجھے آسمان کی کوئی حور معلوم ہو رہی ہو۔“

”ہی دہن کا جوڑا پسند کر لیا گیا۔ لوشیا شادی کے جوڑے کو ڈبے میں بند کر واکر سے آئی۔ پیرس میں انہوں نے جگہ جگہ شاپنگ کی تھی۔ لوشیا نے الفرڈ کو تحفوں سے یا۔ گرین ہاؤس آکر اس نے مارتھا کا جوڑا دکھایا تو وہ بے حد خوش ہوئی۔“

”بیگ صاحبہ! اس جوڑے کو پہن کر تو آپ کوئی پری معلوم ہوں گی۔“

لوشیا نے ہنس کر کہا:

”الفرڈ نے مجھے اس جوڑے میں دیکھا تو کہنے لگا۔ میں کوئی آسمان کی حور ہوں۔“

مارتھا بولی:

”اس میں کیا شک ہے بیگ صاحبہ! آپ نے تو کبھی اپنا خیال ہی نہیں رکھا۔ نہیں تو آپ چاہے شادی کر سکتی تھیں۔“

لوشیا گہرا سانس بھر کر بولی:

”نہیں مارتھا! مجھے الفرڈ کا انتظار تھا۔ میں صرف الفرڈ ہی سے شادی کر سکتی تھی۔“

”ہی میرے خوابوں کا شہزادہ تھا۔“

مارتھا نے دبی زبان میں کہا:

”آپ نے الفرڈ کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے ناں؟ میرا مطلب ہے آج ے لندن کے آرٹسٹ لوگ ذرا زیادہ ہی آزاد خیال ہوتے ہیں۔“

لوشیا نے مارتھا کی طرف دیکھ کر کہا:

”تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا الفرڈ کسی دوسری لڑکی سے پیار کرتا ہے؟“

”نہیں بیگ صاحبہ! آپ کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسری لڑکی سے پیار کیوں کرے گا۔ طلب یہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ آپ کی دولت کی وجہ سے آپ سے شادی

اہو؟“

لوشیا نے مارتھا کو جھڑک دیا:

نے دسو ڈالر دیئے اور لوشیا کا بچہ منالے کر دیا گیا۔ دو روز تک لوشیا گرین ہاؤس میں اپنے بیڈ روم میں پڑی رہی۔ اس نے مارتھا کو صرف اتنا بتایا کہ وہ بیمار ہو گئی ہے اور لیڈی ڈاکٹر زیر علاج ہے صحت مند ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے مارتھا کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ لڑکے کے آرٹسٹ الفرڈ سے شادی کر رہی ہے۔ مارتھا کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس لئے ہوئی کہ لوشیا نے اس سے پہلے اس سے شادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور خوشی اس لئے ہوئی کہ اتنی مدت بعد لوشیا کا گھر آباد ہو رہا تھا۔ لوشیا جتنی دیر بیمار رہی۔ الفرڈ برا فون پر اس کی مزاج پر مری کرتا رہا۔ شاید اس لئے کہ وہ لوشیا کو کسی قسم کے بھی شک میں مبتلا نہ کرنا چاہتا تھا۔

صحت مند ہوتے ہی لوشیا سیدھی الفرڈ کے سٹوڈیو میں پہنچی۔ اس نے مسکراتے ہوئے لڑکے کا خیر مقدم کیا اور شادی کے بارے میں پروگرام طے کیا جلنے لگا۔ الفرڈ نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ایک پل کے لئے بھی لوشیا پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اس کے دل میں کیا تھا؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ لوشیا جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی تھی لیکن الفرڈ نے ایک ہفتے کی تاریخ ڈال دی۔ لوشیا راضی ہو گئی۔ شادی کی تاریخ سترہ مئی ہو گئی۔ وہ سارا ہفتہ لوشیا اور الفرڈ شاپنگ کرتے رہے۔ لوشیا نے اپنے لئے اور مارتھا کے لئے بہترین کپڑے خریدے۔ الفرڈ کے لئے بھی اس نے شادی کا نہایت عمدہ اور قیمتی سوٹ خرید اپنی شادی والے دن کا جوڑا خریدنے کے لئے لوشیا الفرڈ کو ساتھ لے کر لندن سے پیرس گئی۔

پیرس میں جو دکان یورپ بھر میں دہن کے جوڑے تیار کرنے میں مشہور تھی، وہ دونوں آ دکان پر آ گئے۔ یہ دکان ایک بہت بڑے سٹوڈیو کی طرح تھی۔ خادما میں ایک ایسے کمرے میں لے گئیں، جہاں چاروں طرف دیواروں پر فرش سے لے کر چھت تک آئینے لگے تھے۔ الفرڈ دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا اور خادماؤں نے لوشیا کو دہن کا جوڑا پہنانا شروع کر دیا۔ جب وہ پوری دہن بن کر الفرڈ کے سامنے آئی تو ایک وہ بھی لوشیا کا حسن دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ انہوں نے دانتوں تلے انگلی داب لی اور سوچا کاش وہ لوشیا سے شادی کر سکتا۔ لوشیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ دعوت شام تک جاری ہوئی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے۔
فریڈ لوشیا کا بازو تھامے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا اور سگار سلگا کر دیوار پر لگی ہوئی
پین جارج کی دائرہ کمر تصویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

”لوشیا! یہ کس بحری کپتان کی تصویر ہے۔ بڑی عمدہ بنائی ہے کسی آرٹسٹ نے؟ مگر یہ سو
ال پرانی لگتی ہے۔“

لوشیا نے کہا: ”تم نے بالکل ٹھیک پہنچانا۔ یہ تصویر سو سال ہی پرانی ہے جب یہ مکان میں
خریدا تھا تو یہ اسی جگہ لگی تھی۔ کہتے ہیں یہ تصویر اس کپتان کی ہے جو اس گرین ہاؤس کا بھی
صاحب تھا۔“

فریڈ تصویر کی نیلی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں
کھول رہی ہیں۔ فریڈ نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس وقت چھت سے لٹکا ہوا فانوس
نے آپ ہلنے لگا۔ فریڈ نے چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ فانوس کیوں ہلنے لگا لوشیا؟“

لوشیا سمجھ گئی تھی کہ یہ فانوس کیوں ہل رہا ہے مگر وہ ہنس کر بولی:

”میرا خیال ہے روشندان سے ہوا کا جھونکا اسے ہلا کر گذر گیا ہے۔“

وہ ہوا کا جھونکا نہیں تھا بلکہ جارج کی روح تھی جو کھلی کھڑکی میں سے داخل ہو کر بڑی
لوشی سے گذر گئی تھی۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی تھی۔ اس نے ہر کسی سے بات کرنی
وڑدی تھی۔

”فریڈ! آؤ سمندر کے کنارے سیر کرتے ہیں۔ یہاں سمندر کا کنارہ بڑا قدرتی ہے بھوری
اؤن سے جب سمندر کی لہریں آکر ٹکراتی ہیں تو ایک عجیب سی بات سنائی دیتی ہے۔“

فریڈ لوشیا کے ساتھ سمندر کے کنارے آکر ٹھہرنے لگا۔ اس کا دماغ تیزی سے کچھ اور سوچ
تھا۔ لوشیا سوچ رہی تھی کہ چار دن بعد اس کی شادی ہو رہی ہے۔ شادی کے بعد وہ
ہامون منانے حرائی آئی لینڈ جائیں گے۔ اس نے فریڈ سے پوچھا کہ وہ کس جگہ ہنی مون منانا
ہوتا ہے؟ فریڈ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ چونک کر بولا:

”تمہیں فریڈ کے بارے میں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں مارتھا! کل وہ اس گھر کا مالک
بن کر آ رہا ہے۔ اور پھر فریڈ ایسا نہیں ہے۔ اسے میری دولت اور میرے کارخانوں
کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو صرف مجھ سے اور صرف مجھ سے پیار کرتا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو بیگ صاحبہ! میں معافی چاہتی ہوں۔“

لوشیا نے مارتھا کو بتایا کہ کل فریڈ گرین ہاؤس آ رہا ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ ہمارے
ساتھ ہی کھائے گا۔ اگلے روز فریڈ اپنی گاڑی میں سوار ہو کر دوپہر سے پہلے ہی گرین ہاؤس
پہنچ گیا۔ کھانے پر بے حد تکلف کیا گیا تھا۔ لوشیا نے گننے مائیکل اور کارپوریشن کے میئر کے
علاوہ کچھ دوسرے مہمانوں کو بھی کھانے پر بلا رکھا تھا۔ گرین ہاؤس کے مال کرے میں بڑی بڑی
تھلی بہترین کپڑوں میں بلبوس مہمان ایک دوسرے سے ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور
اعلیٰ ترین شرابوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لوشیا نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ فریڈ کے
سے شادی کر رہی ہے۔ اس نے سارے مہمانوں سے فریڈ کا تعارف کروایا۔ فریڈ نے ہر ایک
سے ہاتھ ملایا اور مسکرا کر ان کی خیریت پوچھی۔ لوشیا فریڈ کا تعارف کرواتے ہوئے بڑا فخر
محسوس کر رہی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ ایک آرٹسٹ سے شادی کر رہی ہے۔ گنہ مائیکل
کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ سبھی اس نوجوان آرٹسٹ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے جو ایک
انتہائی مالدار امریکی بیوہ کا خاوند بننے والا ہے مائیکل نے فریڈ کے گلاس میں برف کا ٹکڑا
ڈالتے ہوئے کہا:

”مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو دلی مبارک باد دے سکوں۔ لوشیا ایک بہتر
خاتون ہیں۔ انہیں تصویر کو پسند کرنے اور تصویروں پر باتیں کرنے کا بہترین سلیقہ ہے
میرے آباؤ اجداد بھی امریکی تھے ان میں بھی ایک ایسا زبردست مقصور ہو گیا ہے۔
بھاگے ہوئے بھیلنے کی دائرہ کمر تصویر بنا دیتا تھا۔ پھر ہم امریکہ سے ہجرت کر کے.....
فریڈ اس گنہ مائیکل شیخی خورے کلرک کی باتوں سے سخت بور ہو رہا تھا۔ لوشیا
دور سے دیکھا کہ مائیکل فریڈ کو بور کر رہا ہے۔ وہ فریڈ کے پاس آئی اور اسے اپنے
ساتھ ایک بحری انسر سے ملانے لگی۔“

ہے۔ میں نے ماں کو ناروایا تھا کہ وہ میری شادی پر لندن پہنچ جائے۔ آج صبح اس نے مجھ سے دن پر بات کی اور بتایا کہ جب تک گاؤں والا مکان سا ہو کار کے قبضے سے واپس نہیں لوئے میں شادی میں شرکت نہیں کروں گی۔

لوشیا نے کہا:

”بس یہی پریشانی ہے یا کوئی اور بات بھی ہے؟“

”نہیں لوشیا اور بات کیا ہو سکتی ہے! بس اسی لئے میں صبح سے پریشان ہوں کہ گاؤں باکر مکان کیسے واگزار کروں۔“

لوشیا نے الفرڈ کے بالوں میں انگلیاں بھرتے ہوئے کہا:

”میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوگی! میری دولت کوئی چیز نہیں۔ تم اگر ہو تو میں تمہارے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں۔ تم آج ہی لندن سے گاؤں جاؤ اور وہاں باکر اپنا مکان سا ہو کار کے چنگل سے چھڑا کر کل دوپہر تک واپس لندن آ جاؤ۔ سا ہو کار کو لٹی رقم دینی ہے؟“

الفرڈ نے یونہی جھوٹ موٹ حساب لگانے لگا کہ زمین کا ٹکڑا ابھی ساتھ ہی رہن رکھا ہوا ہے مکان اور زمین ملا کر کل پچاس ہزار پاؤنڈ کی خیر اس نے لوشیا کو بتائی۔ لوشیا محبت کی شاہراہ بردیوانوں کی بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے آگے پچاس ہزار پاؤنڈ کی کیا حیثیت تھی۔ ایک لاکھ پاؤنڈ سالانہ کی رائلٹی تو اسے ایک تیل کے کنوئیں ہی سے ملتی تھی۔ لوشیا نے کہا:

”بس! صرف پچاس ہزار پاؤنڈ کے لئے تم اتنے پریشان تھے کہ میری بھی جان نکال دی۔ چلو واپس گھر چلتے ہیں۔ میں تمہیں ابھی چیک لکھ دیتی ہوں۔“

اب الفرڈ نے سوچا کہ اس نے لاکھ پاؤنڈ کیوں نہ بتا دیئے۔ لیکن پچاس ہزار پاؤنڈ بھی بہت تھے گرین ہاؤس واپس آتے ہی لوشیا نے اپنی الماری میں سے چیک بک نکالی اور اسے میز پر رکھ کر الفرڈ کے نام کا پچاس ہزار روپے کا چیک لکھ کر اسے دے دیا۔

”یہ میری طرف سے تمہیں شادی کا ایک حقیر سا تحفہ ہے الفرڈ!“

الفرڈ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے اپنے نام کا اتنا بڑا چیک زندگی میں کبھی

”ہنی مون! میرا خیال ہے جاپان چل کر ہنی مون منائیں گے۔“

”اوہنوں! مجھے جاپان پسند نہیں۔ میں تو ہوائی کے جزیرے میں جانا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جہاں تم کہتی ہو وہیں چلیں گے۔“

لوشیا نے الفرڈ کا بازو تھام کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی

”کیا بات ہے الفرڈ! تم کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہو؟ میرا خیال ہے، دعوت نے تمہیں تھکا دیا ہے۔“

الفرڈ نے ایک آہ بھر کر کہا:

”دعوت نے مجھے بالکل نہیں تھکایا لوشیا! میں کسی اور بات سے پریشان ہوں؟“

”ایسی کون سی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے الفرڈ! خدا کے لئے مجھے جلدی بتاؤ۔ میرا تمہاری پریشانی دور کرنے کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔“

الفرڈ نے لوشیا کی طرف دیکھ کر درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

”نہیں نہیں لوشیا! میں اپنی پریشانی تم پر ظاہر کر کے تمہیں بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ تم پہلے ہی میری خاطر بہت پریشانیاں اٹھا چکی ہو۔“

لوشیا نے الفرڈ کا بازو تھام کر کہا:

”الفرڈ! کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا دکھ۔ اب میرا دکھ نہیں ہے؟ میں تمہاری بیوی بننے والی ہوں۔ دو روز بعد ہماری شادی ہو جائے گی۔ اگر تم نے اپنا غم۔ اپنی پریشانی مجھے بیان نہ کی تو میں ابھی میاں رونا شروع کر دوں گی۔“

”نہیں نہیں لوشیا! اپنے دفاع پر میری پریشانی کا اتنا اثر نہ ڈالو۔“

”تو پھر مجھے بتا دو تم کیوں اور کس لئے پریشان ہو؟“

الفرڈ ذہنی طور پر لوشیا کو اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ لوشیا خوب گرم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا:

”بات یہ ہے لوشیا کہ گاؤں میں ہمارا آبائی مکان ایک سا ہو کار کے ہاں گروی پڑا

ہی دیکھی۔ ابھی تک کھلنے میں پورا آدھا گھنٹہ پڑا تھا۔ ایک بوڑھا اس کے پاس ہی بیٹھ کر بیٹھا اور اخبار پڑھنے لگا۔ دو ایک بار بوڑھے نے لکھیوں سے الفریڈ کو دیکھا۔ اسے یوں دس ہوا جیسے بوڑھا اس کے عزائم سے باخبر ہو گیا ہے۔ الفریڈ نے جلدی سے ایک لمبا لنگر سگریٹ پھینکا اور اٹھ کر چل دیا۔ اس نے پارک کا ایک پورا چکر لگایا۔ واپس آ رہی میں بیٹھا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور لندن برج کی طرف نکل گیا۔

وہاں ٹریفک بہت زیادہ تھی۔ الفریڈ اس ٹریفک میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بن طرف کو گھوم گیا اور اوپر سے ہو کر چھ سات میل کا چکر لگا کر بینک کے سامنے آ گیا۔ یہ کر کے بینک کھل چکا ہے اس کا دل خوشی اور اندیشے سے دھڑک اٹھا۔ اسے صرف ایک ہی بات تھی کہ اگر کسی صورت سے بینک واپس کر دیا گیا تو کیا ہوگا؟ لیکن نہیں ایسا ہو نہیں سکتا۔ یا کوئی غریب عورت نہیں ہے وہ کروڑوں پاؤنڈز کی مالک ہے۔ پچاس ہزار پاؤنڈز اس آگے کچھ نہیں ہیں۔ اس نے گاڑی پارکنگ کی جگہ پر کھڑی کر کے گاڑی کو لاک کیا اور بریفنگ ہاتھ میں لے کر بیڑی شان اور کاروباری لوگوں ایسے وقار کے ساتھ بینک کی عمارت میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے وہ اس بینک میں کبھی نہیں آیا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کمرہ کون نے کام شروع دیا تھا۔

الفریڈ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کاؤنٹر پر جا کر چیک پیش کیا۔ کلرک نے چیک کو غور سے جھک کر بینک آگے کھسکا کر دیکھا۔ پھر منہ اٹھا کر الفریڈ کو دیکھا۔ الفریڈ نے سانس ل لیا۔ کلرک نے مسکرا کر کہا:

”سراہیاں دستخط کر دیجیے۔“

الفریڈ نے بھی مسکراتے ہوئے قلم نکال کر یوں بے نیازی سے دستخط کئے۔ جیسے وہ اس قسم کے چیک پیش کرانے کا عادی ہے۔ اب وہ ٹوکن لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد، دوسری جگہ کاؤنٹر پر جا کر ٹوکن پیش کیا۔ خزانچی نے ٹوکن لے کر نوٹ گنتے شروع کر دیئے۔ الفریڈ نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب وہ اپنے بریفنگ کیس میں پچاس ہزار پاؤنڈز کے نوٹ لے کر نوٹ بھر کر اپنی گاڑی میں آکر بیٹھا تو اسے اپنے آپ پر کسی لارڈ کا گمان ہو رہا تھا

نہیں دیکھا تھا۔ اس نے لوشیا کا ہاتھ چوم کر کہا:

”میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں لوشیا! تم نے ساری زندگی کے لئے مجھے خرید دیا ہے۔“

”ایسی باتیں نہ کرو الفریڈ! ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہیں۔ ہمیں ڈکھ سکھ میرا ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے۔“

شام کو الفریڈ اپنی گاڑی میں سوار ہو کر واپس لندن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پچاس ہزار پاؤنڈ کا خطرہ چیک اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ لندن اپنے فلیٹ پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر جیب سے چیک نکال کر دیکھا۔ اسے غور سے پڑھا۔ لفظوں ہندسوں کو بار بار لگتا۔ پورے پچاس ہزار پاؤنڈ لکھے تھے۔ نیچے لوشیا کے دستخط تھے۔ کہہ یہ چیک جھوٹا تو نہیں؟ پھر اسے خیال آیا کہ لوشیا ایک کروڑ پتی بیوہ ہے۔ اس کا چیک کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس سے شادی کر رہی۔ وہ اسے جھوٹا چیک کبھی نہیں دے سکتی۔ اصل میں چیک بالکل اصلی تھا۔ یہ الفریڈ کے دوست تھے جو اسے پریشان کر رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صبح جب وہ بینک سے نکل کر واپس اپنی گاڑی میں آئے گا تو اس کے تھیلے میں پچاس ہزار پاؤنڈ کے کرنسی نوٹ رکھے ہوں گے۔ الفریڈ نے رات بڑی مشکل سے گاڑی۔ وہ کئی بار اٹھا اور اس نے بار بار پانی پیا اور گھر میں وقت دیکھا۔ کم بخت رات کچھ زیادہ لمبی ہو گئی تھی۔ دن چڑھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سورج ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی۔ دن کا اُجا لا چاروں طرف پھیل گیا اور سڑک پر سکول اور کارخانے جانی والی بسوں کا شور مچا دیا۔ الفریڈ نے جلدی جلدی تیشو کی ناشتا کیا اور بینک کھلنے کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی فلیٹ سے نکل آیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے شہر کی بڑی سڑکوں پر چکر لگانے شروع کر دیئے ایک بار وہ بینک کے آگے سے بھی گزرا جہاں سے اس نے چیک کیش کرنا تھا۔ ابھی بینک کا دروازہ بند تھا۔

الفریڈ ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ مئی کے مہینے کی ٹھنڈی خوشبودار ہوا چل رہی تھی موسم بے حد خوشگوار تھا۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور آہستہ آہستہ کیش لینے لگا۔ اس نے

نے تیاریاں شروع کر دیں۔ مارتھا بھی جاگ پڑی تھی اور اپنا جوڑا باہر نکال کر اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ دن چڑھا تو مائیکل نے فون کیا کہ وہ آدھ گھنٹے تک پہنچ رہا ہے۔

”خدا کے لئے دیر نہ کرنا مائیکل۔ تم بہت سست الوجود ہو۔“

”ہو ہو ہو ہو، کبھی نہیں بیگم صاحبہ! کبھی نہیں۔“

لوشیا نے ہلکا سا ناشتہ کیا۔ غشی سے اسے بھوک تک نہیں لگ رہی تھی۔ تمام تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ شادی کا جوڑا اور دوسرا سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ لوشیا کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ یہ کوئی ٹیکسی تھی۔ اس نے سوچا شاید مائیکل کی گاڑی خراب ہو گئی ہے اور وہ ٹیکسی میں آیا ہے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ مارتھا نے دروازہ کھولا۔ ایک ادھیر عمر کی دہلی اور کمزور سی عورت ایک چھوٹے بچے کو ساتھ لئے کھڑی تھی۔ اس نے مارتھا سے پوچھا:

”کیا مسز سمٹھ اندر ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ بہت ضروری کام ہے مجھے ان سے۔“

مارتھا اس عورت کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ پھر اس نے لوشیا کو آواز دی کہ کوئی خاتون اس سے ملنے آئی ہے۔ لوشیا خوشی خوشی نیچے آگئی۔ اس نے نووارد عورت کو سر سے تک غور سے دیکھا وہ بڑے غریب مزدور گھرانے کی خاتون معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے گال اندر لگو پکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں دیریناں جھانک رہی تھیں۔ لوشیا کا یونہی دل دھڑکنے لگا۔ اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے اس عورت سے پوچھا:

”فرمائیے۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“

نووارد عورت نے بڑے غور سے لوشیا کو دیکھا اور بولی۔

”آپ ہی مسز سمٹھ ہیں؟“

”جی ہاں! میں ہی مسز سمٹھ ہوں۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“

اس عورت نے کہا:

”میں الفرڈ کی بیوی ہوں۔ یہ اس کا بچہ تھا۔ دو بچے گھر میں ہیں۔“

لوشیا پر جیسے بجلی می گری پڑی۔ وہ کھڑکی کھڑکی کرتے لگی تھی کہ ایک دم سے صوفی پر بیٹھ گئی۔

اس نے انجن سٹارٹ کیا اور وہاں سے سیدھا اپنے فلیٹ کی طرف چل گیا۔ فلیٹ پر اس نے کرنسی نوٹ ایک الماری کے اندر رکھ کر تالا لگا دیا اور گلاس میں برانڈی بھر کر مرزا پر لیٹ گیا اور مزے سے چپکیاں لیتے ہوئے سگریٹ کا دھواں اڑانے لگا۔ وہ سارا دن اپنے فلیٹ میں بند رہا اور دوست مرزا کے ساتھ برانڈی کے جام بھر بھر کر پیتا رہا شام کو اس نے لوشیا کو فون کیا۔ وہ بڑی نیاز مند سی اور محبت سے اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس نے روز کو بتایا کہ وہ ابھی ابھی اپنی ماں سے مل کر آ رہا ہے۔ انہوں نے اپنا آبائی مکان اور زمین ہم سے واپس لے لی ہے اور اب اس کی ماں غشی سے اس کی شادی میں شرکت کے لئے لندن آ رہی ہے۔ الفرڈ نے ایک بار پھر لوشیا کا شکریہ ادا کیا۔ لوشیا نے حسب عادت اسے اپنی محبت زندگی کے ہر کھٹن مقام پر الفرڈ کے لئے جان کی قربانی تک پیش کرنے کا یقین دلایا۔

لوشیا سے الفرڈ کی یہ آخری ملاقات تھی۔ مگر لوشیا کو معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد لوشیا سے کبھی نہیں ملے گا۔ اور اس کے بعد وہ لوشیا سے اتنی دور چلا جائے گا کہ وہ زندگی بھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھ سکے گی۔ شادی کا دن اگلے روز تھا۔ فون پر یہی طے ہو گیا کہ صبح ہی صبح شادی کا جوڑا لے کر مارتھا اور گنجے مائیکل کے ساتھ الفرڈ کے فلیٹ میں پہنچ جائے جہاں سے وہ لوگ گرجا روانہ ہو جائیں گے۔ لوشیا نے مائیکل کو اپنے سر پرست کے طور پر چنا صبح شادی کا دن تھا اور رات کے ٹھیک نو بجے آسٹریلیا جانے والی فلائٹ لندن ایئر پورٹ پر تیار کھڑی تھی۔ ایئر پورٹ کے لاؤنج میں سپیکر پر اعلان کیا گیا کہ آسٹریلیا جانے والے مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ جہاز پر تشریف لے آئیں۔ الفرڈ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے کوٹ پہنے ہاتھ میں برلیف کیس تھا تے تیزی سے چلتا ہوا جہاز کی سیڑھیوں تک پہنچا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ اپنی میڈٹ پر بیٹھ کر اس نے بڑے آرام سے اپنا سر پشت سے لگایا اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ تھوڑی دیر میں جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے اور وہ لندن کے آسمان پر اڑ رہا تھا۔ لوشیا نے رات بڑے سنہری خواب دیکھتے ہوئے بسر کی صبح اس کی شادی ہو تھی۔ اس شخص کے ساتھ جس سے وہ دل و جان سے پیار کرتی تھی۔ منہ اندھیرے اٹھ کر

”قدر صد مہ ہوا۔“

لوشیانے ہاتھ کے اشارے سے مارتھا کو روک دیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔
رتے روتے اسے نیند آگئی اور شاید وہ سو گئی۔ ڈاکٹروں نے اکڑا سے سوتے میں ہی ٹیکہ لگایا
بر مارتھا کو ہدایت کی کہ اسے ہرگز ہرگز نہ جگایا جائے۔ اس کے لئے نیند سب سے بہتر علاج
ہے۔ ساری رات لوشیا سوئی رہی۔ صبح اٹھی تو اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ بڑی
زرد ہو گئی تھی۔ اس کا سرخ رنگ زرد ہو گیا تھا۔ مارتھا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس کے بعد لوشیانے اپنے آپ کو گرین ہاؤس کی چار دیواری میں بند کر لیا۔ گاؤں والوں
نے اس کے بعد لوشیا کو کبھی نہ دیکھا۔ اس کی زندگی ایک پراسرار زندگی بن کر رہ گئی۔ اس کے
بعد لوشیا کی حیات فانی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی موت
پہلا باب شروع ہوا۔ اس نے زمین بزمینہ موت کی طرف چلنا شروع کر دیا وہ سارا سارا
اپنے میڈروم کے بستر پر چپ چاپ لیٹی رہتی۔ تھوڑا بہت کھانا نہ ہر مار کرتی اور پھر بستر
پر چڑھتی۔ شروع شروع میں گاؤں کے لوگ اور مائیکل اس کی مزاج پر سی کو آئے۔ پھر انہوں
نے بھی آنا بند کر دیا تھا۔ اس نے مارتھا کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی شخص اس سے
ملاقات کرنے نہ آئے۔ پہلے گرین ہاؤس کے گیٹ پر باہر تالا پڑا ہوتا تھا۔ اب گرین ہاؤس کے
یٹ پر باہر تالا پڑا ہوتا تھا۔ اب گرین ہاؤس کے گیٹ پر اندر بھی تالا پڑ گیا اور اس تالے کو
بھی آہستہ آہستہ زنگ لگنا شروع ہو گیا۔

ہفتے میں ایک روز کسی وقت شام کے جھپٹے میں مارتھا ٹوکری لے کر ضرورت کی چیزیں
فرید نے قصبے میں جاتی اور کسی نیم روشن سٹور سے سامان خرید کر واپس آ جاتی۔ اگر کوئی اس
سے سنز متھ کے بارے میں پوچھتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ لوگوں نے آہستہ آہستہ پوچھنا بھی
بھڑ دیا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ لوشیا کو شادی کا گہرا صدمہ ہوا ہے اور اس نے صدمے کو
سینے سے لگایا ہے۔ وہ مارتھا سے بھی کوئی بات نہ کرتی تھی۔ بہت شدید ضرورت کے
وقت وہ اسے اشارے سے بلاتی۔ دو لفظوں میں بات کرتی اور اسے اپنے میڈروم سے نصرت
لوہتی۔ شاید اب لوشیا کے ذہن میں کیپٹن جارج کا خیال چھا گیا تھا۔ شاید اب وہ اس محبت

”یہ آپ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

اس عورت نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا:

”کاش جو کچھ میں آپ سے کہہ رہی ہوں، یہ غلط ہوتا، لیکن سنز متھ یہ بالکل صحیح ہے۔ میں ہی ام
الفریڈ کی بیوی ہوں جس سے آج آپ شادی کرنے والی ہیں۔ الفریڈ سے میری شادی کو چھ برس ہو گئے
ہیں۔ میرے تین بچے ہیں۔ میں گاؤں میں فاقے کر رہی ہوں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ انفر
آپ کو اور مجھ کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر ساری دولت اپنے ساتھ لے کر لندن سے کسی نامعلوم مقام
کو پرواز کر چکا ہے کہ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو لندن چل کر اس کے خالی غلیٹ کو دیکھ آئیں۔ وہ
میری زندگی سے بھی نکل گیا ہے اور آپ کی زندگی میں بھی کبھی نہیں آئے گا۔ اس نے ہم سب سے
دھوکا کیا ہے، مجھ سے، آپ سے اور اپنے معصوم بچوں سے۔ وہ ظالم ہے۔ قاتل ہے۔ خون ہے
اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!۔“

الفریڈ کی بیوی اپنے بچے کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ لوشیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے
اسے جاتے دیکھتی رہی۔ مارتھانے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ لوش
نے سفید سفید آنکھوں سے مارتھا کی طرف دیکھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

لوشیا شام تک بے ہوش رہی۔ تمام لوگوں کو یہی بتایا گیا کہ لوشیا کی طبیعت اچانک خراب
ہو جانے کی وجہ سے شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔ ڈاکٹر لوشیا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے
رات کو اسے ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔ لوش
تین روز تک زندگی اور موت کے درمیان لٹتی رہی۔ چوتھے روز اس نے مارتھا کو آواز دے کر
کہا کہ اسے کافی کی ایک پیالی لا دے۔ مارتھا دوڑی دوڑی نیچے گئی اور جلدی سے کافی کی
کر اسے پیش کی اور اس کا سر دبانے لگی۔ لوشیانے ہاتھ کے اشارے سے اسے سر دبانے سے
رکھ دیا۔ اس نے کافی کا ایک گھونٹ پیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ کتنی دیر تک
روتی رہی، ہچکیاں لے لے کر اس کا سارا بدن دکھنے لگا۔ مارتھا اسے حوصلہ دیتی رہی اور
روتی رہی۔

”وہ ایک دھوکے باز تھا، بگ صاحب! اسے بھول جائیں۔ مجھے افسوس ہے، آپ کو

تھی۔ سمندر کا طوفان تھم گیا تھا اور وہ اپنے باغ کے ایک بچہ پر پڑی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سردی سے ہٹھک رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گئے تھے وہ باغ میں بکڑ کر مکان کے اندر آگئی اور پھر خاموشی سے اپنے بیدروم میں چلی گئی۔ دوسرے دن اسے شدید رہو گیا۔ مارتھانے مجبور ہو کر ڈاکٹر کو فون کیا اور اسے بتایا کہ لوشیا کو تیز بخار ہے۔ بوڑھا ڈاکٹر ن دقت اپنی کاریں بیٹھ کر گرین ہاؤس پہنچ گیا۔ لوشیا کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا ہے۔ اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ مارتھانے آکر ڈاکٹر سے کہا:

”بیگم صاحبہ مندر کر رہی ہیں ڈاکٹر! خدا کے لئے انہیں کسی طرح ٹھیک کر دیں۔ انہیں بڑا بخار ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا:

”مسز سمٹھ کے بیدروم کو کون سی سیڑھیاں جاتی ہیں؟“

مارتھا ڈاکٹر کو ساتھ لے کر لوشیا کے بیدروم میں آگئی، ڈاکٹر کو دیکھ کر لوشیا نے اپنا منہ لایا۔ ڈاکٹر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا:

”بیٹی! میں ڈاکٹر ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری جان بچاؤں۔“

اور پھر ڈاکٹر نے لوشیا کو انجکشن دے کر اسے لٹا دیا اور مارتھا سے کہا کہ وہ لوشیا ماتھے پر کیلی پٹیاں رکھے۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ مارتھانے لوشیا کے ماتھے پر کیلی پٹیاں رکھے۔ ڈاکٹر آگیا۔ مارتھانے لوشیا کے ماتھے پر کیلی پٹیاں بدلتا شروع کر دیں۔ لوشیا کو بخار ہو گیا اور ہانے بے ہوشی میں بونا شروع کر دیا:

”جارج! جارج! دیکھو آسمان کتنا چمکیلا ہے۔ دیکھو! سنہری دھوپ گلاب کے پھولوں تک رہی ہے۔ سنو! میں نے گلاب کے یہ پھول تمہارے لئے منگوائے ہیں۔“

مارتھا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس سے اپنی مالکین کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اسی ج بولتے بولتے لوشیا کو نیند آگئی۔ یادہ بے ہوش ہو گئی۔ مارتھا اس کی پٹیاں بدلتی رہی ا کے وقت ڈاکٹر پھر آیا۔ اس نے نبض دیکھی۔ بخار ٹوٹ چکا تھا۔ رات کو بخار اتر گیا۔ لوشیا آنکھیں کھول دیں مگر اس نے مارتھا سے کوئی بات نہ کی۔ بس خاموش نگاہوں سے اسے تسکین

جوگن بن گئی تھی جو زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور موت کے بعد شروع ہوتی ہے اس رات آدھی رات کی ویران خاموشیوں میں بیدروم کے اندھروں میں جارج کو آوازیں دیں۔ لیکن کم نے اس کی پکار کا کوئی جواب نہ دیا۔ گرین ہاؤس کے درے درے پر گہری آسپی خاموشیوں اپنی ہر تبت کر دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں صدیوں سے کوئی نہیں رہ رہا۔ بڑا بڑا نہ مارتھا، اور نہ جارج کی روح.... یہ گھر پہلے سے زیادہ اُبھڑ گیا تھا۔ پہلے جارج کی روت جارج کا بھوت رہتا تھا تو لوگوں کو کبھی کبھی یہاں راتوں کو روشنی دکھائی دے جاتی تھی اور طوفانی راتوں کو بحری کشتی کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ لیکن اب جب کہ دوزخہ تو گرین ہاؤس میں رہتی تھیں تو وہاں موت سے بھی زیادہ بھیانک خاموشی اور تاریکی چھا گئی تھی وقت گزرتا چلا گیا۔ لوشیا کے سرخ بالوں نے سفید ہونا شروع کر دیا۔ وہ کمزور ہوتی

چلی گئی وقت سے پہلے بوڑھی ہوتی چلی گئی۔ مارتھا برابر اس کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ اپنی ما کے ساتھ وفادار حبشی خادمہ نے بھی ڈھلنا شروع کر دیا تھا۔ ایک رات جب کہ بڑے زور۔ بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ سمندر شور مچا رہا تھا کہ لوشیا اپنے بستر پر سے اٹھی اور نیچے اتر کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ کارنس پر ایک دھیمی سی نو جل رہی تھی۔ وہ کیپٹن جارج کی تصویر کو مسلسل تکیے جا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے گرم آنسو ڈھلک پڑے۔ وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر باغ میں آگئی، تیز ہوا اور بارش میں گنجان درخت دہرے دہرے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ لوشیا نے سمندر کی طرف چلنا کر دیا۔ بارش میں وہ ساری بھیگ گئی۔ لیکن وہ چلتی چلی گئی۔ بھوری چٹانوں کے ساتھ ٹکراتا کا شور اٹا خوفناک تھا کہ انسان کا دل دہل جائے۔ مگر لوشیا پر جیسے کسی خوف کسی شور کسی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک چٹان کے ہمراہ جا کر کھڑی ہو گئی اور خاموش، ساکت سے اندھیرے میں سمندر کی طرف سے آتی بڑی بڑی لہروں کو دیکھنے لگی۔ وہ آگے کو جھکی۔ موجیں چٹان سے ٹکراتے ہوئے خوفناک جھاگ اڑ رہی تھیں پھر جیسے وہ آگے کو گری اور کسی نے اٹھا کر واپس ریت پر لٹا دیا۔

لوشیا کو ہوش آیا تو بارش کی بھوار اس کے بھیگے ہوئے جسم پر پڑ رہی تھی۔ رات

دونوں ہاتھ بڑھا کر لوشیا کی بوڑھی لاش کو آواز دی:

”لوشیا! آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

اور لوشیا کی بوڑھی ضعیف لاش میں سے وہی پچاس سال پہلے کی سرخ بالوں اور گداز
تم والی حسین لوشیا کی روح مسکراتی ہوئی اٹھی اور اس نے اپنے ہاتھ جارج کی طرف
بڑھادیئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھلی کھڑکی کی طرف بڑھے اور مسکراتے ہوئے
یہاں سمندر کی طرف پرواز کر گئے۔

رہی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد گرین ہاؤس پر ایک بار پھر اسرار اور گہری خاموشی کا بھاری پردہ
گر گیا۔ وقت کا ہاتھ ازل سے ابد کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ ایک سال، دو سال، دس سال، بیس
سال بیت گئے۔ لوشیا کے سر کے بال آدھے سفید ہو گئے۔ وہ سوکھ کر کانٹا بن گئی۔ نہ اس نے کسی کو
اپنے دل کا حال سنایا، نہ کسی نے اس کے دل کا حال پوچھا۔ وہاں اس کا دکھ سننے والی صرف اس
کی پُرانی خادمہ مارتھا ہی تھی۔ لوشیا نے مارتھا سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ جس نے اس کا حال
پوچھنا تھا، وہ کبھی اسے راتوں کی تنہائیوں میں آواز نہ دیتا تھا۔ لوشیا نے دو روکر جارج کی
روح کو پکارا مگر جارج نے کوئی آواز نہ دی۔ لوشیا نے سسکیاں بھرتے ہوئے راتوں کو بستر پر
لیٹے لیٹے جارج کی روح کو یاد کر کے کہا:

”جارج! مجھے معاف کر دو۔ جارج! ایک بار میرے کانوں کے پاس آکر کہہ دو کہ تم نے مجھے
معاف کر دیا ہے۔ تم کہاں ہو جارج! تم آواز کیوں نہیں دیتے۔ مرنے والے نہیں بولا کرتے۔ لیکن تم
تو کبھی نہیں مر سکتے۔ پھر تم آواز کیوں نہیں کہتے؟ دیکھو جارج! میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میرے سر
کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ کیا اب بھی تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟“

لوشیا نے جارج کی روح کو کئی بار پکارا مگر جارج کی روح کو ایسی ہر خاموشی لگی تھی کہ اس نے
پھر کبھی اس کی پکار کا جواب نہ دیا۔ کبھی اس کے کان کے پاس آکر سرگوشی کر کے نہ کہا کہ لوشیا!
میں تمہارے پاس ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ میں آج بھی تم سے اسی طرح پیار کرتا ہوں۔ وقت کا ہاتھ
ازل سے ابد کی طرف اڑتا چلا گیا۔ پچاس برس بیت گئے۔ گاؤں کے پُرانے لوگ مر گئے۔ نئے
لوگ جلاں ہو گئے۔ مارتھا بھی ایک روز خاموشی سے چل بسی۔ اب لوشیا گرین ہاؤس میں اکیلی رہ
گئی۔ وہ اس قدر بوڑھی ضعیف ہو گئی تھی کہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کہیں جاسکتی تھی۔ اس کے سر
کے بال سفید ہو کر گرے لگے تھے۔ اس کے سارے دانت بھر گئے تھے۔ اس کا صحن خاک میں مل
گیا تھا۔ وہ سمندر کی طرف کھٹنے والی کھڑکی کے سامنے آرام کر سی پر سر جھکائے ادنگھتی رہتی۔
ایک روز ادنگھتی ہوئے وہ کرسی سے گر پڑی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

ٹھیک اس وقت جارج کی روح نہایت خوب صورت لباس میں نمودار ہوئی۔ اس نے

رائٹس کرو سو

اس کتاب کی کہانی

ناول » رابن کروسو « میں نے بہت بعد میں پڑھا۔

اس سے پہلے مجھے ایک ویران اور تقریباً غیر آباد جزیرے میں جانے کا حادثہ پیش آیا۔ یہ ایک حادثہ ہی تھا۔ ہوائیوں کے جون جولائی کے دن تھے۔ ان دنوں بحیرہ عرب اور خلیج بنگال کے سمندر چڑھے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان ہینوں میں ان سمندروں کا سفر کریں تو جہاز پر اتنی رولنگ ہوتی ہے کہ آپ اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں جہاز پر سوار ہو گیا۔ جہاز رات کے وقت کھلے سمندر میں پہنچ گیا۔ دن چڑھا تو سارے کا سارا جہاز بڑی طرح رولنگ کر رہا تھا۔ جہاز کا ایک پہلو اوپر اٹھ کر پھر نیچے آجاتا۔ چکروں نے بُرا حال کر دیا۔ شام تک ان چکروں کا عادی ہو گیا۔ لیکن مصیبت اس وقت شروع ہوئی جب سمندر میں زبردست طوفان آگیا۔ بادلوں کی گرج، تیز بارش اور طوفانی ہوائ نے جہاز کو پھرے ہوئے سمندر میں کھلونے کی طرح اُچھلانا شروع کر دیا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ رات کو سارے جہاز پر مکمل بلیک آؤٹ ہوتا تھا۔ دن کو بھی جاپانی آئندوزوں کا خطرہ ہر وقت سروں پر منڈلاتا رہتا تھا۔ طوفان کی شدت زیادہ ہو تو سارے جہاز پر خطرے کا الارم بجا دیا گیا۔ مسافر پریشان ہو گئے۔ بچوں اور عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ طوفان تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ سمندر کی پہاڑی پہاڑ جتنی لہریں دور دور سے آکر جہاز سے ٹکرا رہی تھیں اور اُسے اچھال رہی تھیں۔ جہاز کا کپتان ایک تجربہ کار انگریز تھا۔ اس نے خود مسافروں کے پاس

اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال ویران جزیرے میں گزار دیئے۔ اُسے قدم قدم پر حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ موت کئی بار آکر اُس کے قریب سے گزر گئی — حیرت انگیز واقعات پر مبنی پُر اسرار آپ بیتی۔

ترجمہ
اے حمید

نویز ٹیک پر آکر انہیں تسلی دی اور کہا کہ ہم جہاز کو یہاں سے ساٹھ میل دور ایک جزیرے پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ طوفان گزر گئے تو پھر سفر شروع کیا جائے۔ میں پریشان تو بہت تھا۔ جان کے لالے بھی پڑے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ ہمارا جہاز کسی ویران جزیرے کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے بحری ڈاکوؤں کی کہانیاں یاد آئیں جن میں ڈاکو تجارتی جہازوں کا سامان لوٹ کر اسے ویران جزیروں میں دبا دیا کرتے تھے۔

اور پھر کچھ دیر بعد دور سے ناریل کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دینے لگے۔ یہی وہ ویران جزیرہ تھا جہاں ہمارا جہاز لنگر انداز ہونے والا تھا۔ کپتان نے بڑی مہارت سے جہاز کو ایک جگہ لنگر انداز کر دیا۔ مسافروں کو جزیرے تک پہنچانے کے لئے کشتیوں میں سوار کروایا اور ساحل پر پہنچا دیا۔ میں بھی ایک کشتی میں سوار ہو کر جزیرے پر آگیا۔ یہ واقعی ایک ویران اور غیر آباد جزیرہ تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ اور ناریل کے درختوں کے جھنڈوں کے جھنڈ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے تھے۔ جزیرے کا کنارہ آگے جا کر بائیں طرف کو گھوم گیا تھا۔ لوگوں نے زمین پر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ ریت پر ادھر ادھر لیٹ کر آرام کرنے لگے۔

میرے دل میں خیال آیا کہ جزیرے کی سیر کرنی چاہیے، چنانچہ میں ایک طرف سے درختوں کے اندر داخل ہو گیا۔ یہاں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اُگی تھیں۔ ان میں ایسے ایسے ٹرو بیکل پھول کھلے تھے کہ ایسے رنگ میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔ گھنے درختوں کے تنوں پر عجیب و غریب پتوں اور رنگوں کی پھولدار میلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں جزیرے میں آگے نکل گیا۔ درختوں پر رنگ برنگ پرندے بول رہے تھے۔

ایک بھاری بھر کم کچھوارینگتا ہوا سمندر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ایک درخت کی ٹہنی پر زرد پروں اور لال چونچ والا طوطا بیٹھا تھا۔ اس نے گردن جھکا کر مجھے غور سے دیکھا۔ گردن کی کٹنی کھڑی کی اور جیسے زور سے قہقہہ لگا کر سنسن پڑا۔ میں

بھی ہنس دیا۔ اور آگے گیا تو ایک درخت پر سبز رنگ کا باریک سانپ لٹکا ہوا تھا۔ بس اُسے دیکھ کر میں ڈر گیا اور واپس بھاگا۔ یہ رات جزیرے پر ہی بسر ہوئی ایسی خاموشی میں نے دیکھی۔ مجھے اپنے سانس لینے کی بھی آواز آرہی تھی۔ سمندر ایک دم سے بے حد پرسکون ہو گیا تھا۔ صبح صبح مسافروں نے جہاز پر بیٹھنے کی تیاری شروع کر دی۔ میں جزیرے کی آخری سیر کے لئے چل پڑا۔ جب واپس آیا تو آخری کشتی جہاز کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میں جزیرے پر اکیلا رہ جاتا تو کیا ہوتا؟

پھر جب میں نے ڈینیئل ڈیفو کا ناول رابنسن کروزو سو پڑھا تو مجھے وہ جزیرے کی رات یاد آگئی۔ اس انگریز لڑکے نے جس اذیت اور کرب کے ساتھ ایک اجاڑ بیابان جزیرے پر اپنی جوانی کے ۲۵ برس گزارے، یہ اسی کی ہمت اور عظمت تھی۔ رابنسن کروزو کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ آپ اسے پڑھ کر خود اندازہ لگالیں گے۔ کہ اس ناول کا ہیرو تنہائی کے کس شدید کرب میں سے گذرا ہے۔ مصنف نے یہ ایک ایسے شخص کی کہانی سن کر ناول لکھا تھا۔ جو بحر اوقیانوس کے ایک اجاڑ جزیرے میں کسی حادثے کے بعد تنہا رہ گیا تھا۔ اور پھر اس نے وہاں اکیلے ہی زندگی کے پچیس برس گزار دیئے۔ پچیس برس کے بعد جب اس نے پہلی بار ایک جہاز کو جزیرے کی طرف آتے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں ہو گئے اور وہ ریت پر بیٹھ کر بچوں کی طرح سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ یہ ایک سچی اور انسانی کردار کی عظمت کی بے مثال کہانی ہے۔ جس کا پورا مکمل ترجمہ پہلی بار پیش کیا جا رہا ہے۔

اے حمید

تاریک رات میں بجلی کے کڑاکے، بادلوں کی گھن گرج اور موسلا دھار بارش! قیادت خیز ندی طوفان میں ہمارا ایک سو بیس ٹن وزنی جہاز کھلونے کی طرح ہچکولے کھاتا اپنی قسمت دکھائی المناک تباہی کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ تیز ہواؤں میں شور میں کان پڑی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہمارا جہاز برازیل کی طرف جا رہا تھا۔ یہ کافی بڑا جہاز تھا اور اس پر چھ توپیں لگی رہی تھیں جہاز پر پچیس کے قریب آدمی کام کرتے تھے۔ جہاز کپاس اور گرم مصلحے لے کر برازیل بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر میرا تجارتی سامان بھی لدا ہوا تھا۔ میں یہاں آپ سے اپنا راف کروادوں۔ میں جزائر برطانیہ کے یارک شائر کے علاقے کارہنے والا ہوں۔ میرا نام بنس کرو سو ہے۔ اس وقت میری عمر بیس بائیس سال کی تھی۔ میرے باپ نے مجھے ہمیشہ سمندر کی فرسے منع کیا تھا۔ لیکن میرے دل میں سمندر میں سفر کر کے اپنی روزی کمانے کا بے حد شوق اچھا بچہ پہلی بار جبکہ میری عمر اٹھارہ برس تھی، میں نے کچھ کھلونے، چاقو اور ریشمی کپڑا خریدا۔ لندن کی بندرگاہ سے ایک تجارتی جہاز پر سوار ہو کر گئی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر میری قسمتی کہ ہمارے جہاز پر بیچ سمندر میں بحری قزاقوں نے قبضہ کر لیا اور سارے مسافروں کو لام بنا کر فروخت کر دیا۔

مجھے ایک ترک امیر نے خریدا۔ میں دو برس اس ترک امیر کا غلام رہا۔ ایک روز میں اپنے ایک ساتھی غلام ساز باز کی اور فرار کا منصوبہ بنایا۔ ہم ایک روز اپنے آقا کے لئے سمندر کا ایک کشتی لے کر مچھلیاں پکڑنے نکلے۔ ہم کشتی کو کھلے سمندر میں لے گئے اور پھر وہاں سے جنوب کی طرف اپنے فرار اور آزادی کا سفر شروع کر دیا۔ راستے میں میرا ساتھی سمندر میں گر گیا۔ میں کوشش کے باوجود

بہرہا تھا۔ کپتان نے لنگر ڈالنے کی کوشش کی مگر طوفان کے زور سے لنگر ٹوٹ گیا۔ جہاز راستے بھٹک چکا تھا۔ کپتان کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کس طرف کو جا رہا ہے اور کس سمندر میں مل آیا ہے۔ سامنے بڑی بڑی ابھری ہوئی لڑکی چٹانیں آگئیں۔ کپتان نے جہاز کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جہاز کو ایک مہیب لہر نے اٹھا کر چٹان پر دے مارا۔ ان کے ساتھ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ ٹکرانے کے بعد جہاز کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں دو چٹانوں کے درمیان کھولتے پھرتے سمندر کی موجوں میں رہ رہا تھا۔ میں بڑا اچھا تیراک ہوں۔ لیکن سمندر کی شوریدہ سرجھاگ اڑتیں موجیں مجھے لاس لینے کی بھی مہلت نہیں دے رہی تھیں۔ پھر بھی چونکہ میں جوان تھا جسم میں گرم خون گردش رہا تھا۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح تیرتا ہوا چٹانوں سے نکل کر باہر آگیا۔ یہاں میں نے بتان کی لاش دیکھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اور وہ اوندھے منہ سمندر کی لہروں پر بہتا چلا رہا تھا۔ اسی طرح میرے قریب سے جہاز کے دوسرے چار غلاصیوں کی لاشیں گذریں۔ اب اب چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی کشتی میرے قریب آگئی۔ میں بڑی مشکل سے تیرتا سمندر کی موجوں سے ڈرتا ہوا کشتی پر جا پہنچا۔

کشتی میں اپنے آپ کو گر کر میں نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ میں کشتی میں اوندھے منہ لیٹ گیا میری ایک ٹانگ ابھی تک پانی میں تھی۔ میرے پیٹ سمندر کا کڑوا پانی بھر گیا تھا۔ جو ب وقفوں وقفوں کے بعد نکل رہا تھا۔ طوفان کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ طوفان اسارا زور صرف جہاز کو ڈبلونے اور کپتان کو ہلاک کرنے تک ہی تھا۔ پھر میں کشتی میں سیدھا ہوا رہ بیٹھ گیا۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ ہوا کی تیزی بھی جاتی رہی تھی۔ جہاز قریب ہی دو ٹکڑے ہو کر چٹانوں میں پھنسا ہوا تھا۔ میری کشتی کے عقب میں کسی جزیرے کا ساحل اپنے عجیب و غریب قسم کے اُونچے اُونچے سیاہ درختوں کے ساتھ ابھرتا تھا۔

ایک لہر نے میری کشتی کو اچھال کر ساحل کی ریت پر پھینک دیا۔ کشتی بھی ساحل کی ریت پر چڑھ آئی تھی۔ میں دیر تک ریت پر لیٹا رہا اور میرے منہ پر ہلکی ہلکی بارش کی بوندیں پڑتی رہیں۔ پھر میں آہستہ سے اٹھا اور میں نے ریت پر دو نون، پتھیلیاں ٹیک دیں میں نے بڑے

اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ سمندر کی ایک اونچی لہر میری آنکھوں کے سامنے اُسے بہا کر دو لے گئی۔ اس کے بعد میں اُسے کبھی نہ دیکھ سکا۔ ایک دن اور ایک رات کشتی میں سفر کرنے کے بعد میں ایک ایسے ساحل پر پہنچا جہاں گھنا جنگل تھا۔ یہاں جنگل میں شیر جیتے بہت پائے جاتے تھے۔ میں ڈرتے ڈرتے جنگل میں داخل ہوا۔ جنگلی درندوں کی آواز دن کے وقت بھی مڑا دے رہی تھیں یہاں مجھے ایک حبشی قبیلے کے لوگ مل گئے جنہوں نے میرے ساتھ دوستی اور شفقت کا سلوک کیا۔ اس حبشی قبیلے کی عورتیں اور مرد اور زار دبر بہنہ چلتے پھرتے تھے۔

اس جنگل میں نے گیارہ دن گزار دیئے۔ بارہویں روز اتفاق سے ایک تجارتی جہاز کا ادھر سے گزر ہوا۔ ہم نے آگ جلا کر اس کے دھوئیں سے جہاز یوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ ایک بڑنگال جہاز تھا۔ جہاز ساحل سے کچھ دُور آ کر رک گیا۔ حبشی قبیلے کے لوگوں نے مجھے ایک چھوٹی سی کشتی پر بٹھا کر جہاز پر موار کر دیا۔ انہوں نے مجھے پھلوں کے تحفے بھی دیئے جو میں نے جہاز کے غلامیوں میں تقسیم کر دیئے۔ جہاز کا کپتان بڑا زندہ دل آدمی تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ میرے پاس ایک بیسہ بھی کرائے کے لئے نہیں ہے۔ کپتان نے ہاں کر لی۔

”کوئی بات نہیں سنو انگلش۔ میں تمہیں مفت اپنے جہاز پر لے چلوں گا۔“

جہاز نے مجھے برازیل پہنچا دیا۔ یہاں میں نے چھ ماہ تک محنت مزدوری کر کے کچھ پیسے کائے اور ان کا کچھ سامان خرید کر واپس لندن لا کر فروخت کر دیا۔ لندن سے کھلونے اور دوسری چیزیں خرید کر میں اس دفعہ ایک بار پھر برازیل کی طرف جا رہا تھا۔ کہ راستے میں طوفان نے ہمیں گھیر لیا پورا ایک ہفتہ ہمارا جہاز طوفانی سمندر میں پھنکے کھاتا رہا۔ تجربہ کار کپتان جہاز کو طوفان سے نکال لے جانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مگر تیز ہواؤں کے سامنے اس کی پیش نہیں جا رہی تھی۔ سمندر کی بڑی بڑی لہریں اُٹھ اُٹھ کر جہاز سے ٹکراتی رہی تھی۔ جہاز کبھی ایک طرف کو جھک جاتا۔ دوسری طرف سے سمندر کی موج پیندے سے ٹکراتی تو دوسری طرف کو جھک جاتا۔ بارش اور بادلوں کے شور میں کپتان جہاز کے عرشے پر کھڑا ملاحوں کو بیچ بیچ کر ادھر اُدھر کام کرنے کو کہہ رہا تھا

لیکن آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جہاز سمندر میں ابھری ہوئی چٹانوں کی طرف

ام کی سردی چلنے لگی تھی۔ میرے پاس دیا سلائی نہیں تھی جس کو جلا کر میں تمباکو پی سکتا تھا۔

میں خاموش ریت پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مجھے بہت سخت پیاس ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر کوئی ایک فرلانگ تک سمندر کے کنارے چلا ہوں گا کہ ایک جگہ تھیں۔ میں گڑھا پڑا ہوا تھا۔ جس میں بارش کا پانی جمع تھا۔ میں نے جھک کر اوک سے یہ بیٹھا پانی اپنی پیاس بجھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میری بھوک بھی چمک اٹھی۔ لیکن وہاں کھانے کچھ نہیں تھا۔ درخت ایسے تھے کہ ان پر کوئی پھل لگا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی درخت پر چڑھ کر گذرانی چاہیے۔ کیونکہ کوئی خبر نہیں رات کو جنگل میں سے درندے لکڑیٹ کر جاگیں۔ میں نے ایک درخت کو رات بسر کرنے کے لیے جی لیا۔ میں بہت تھک تھا اور جزیرے پر رات کے سائے منڈلاتے لانے لگے تھے۔ ابھی تک مجھے اس جزیرے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اور نہ میرے اندر اتنی ہمت تھی۔ کہ میں جزیرے کی سیاحت کرنا۔ میں تھکی اور بھوک سے چور تھا۔ میں درخت کے اوپر چڑھ کر سو گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب دن نکل آیا تھا۔ چاروں طرف دھوپ چمک رہی تھی اور نتوں پر پرندے شور مچا رہے تھے۔ میں درخت پر سے نیچے اتر آیا۔ میں نے دیکھا کہ سمندر ان ہو چکا تھا اور دھوپ میں ہمارے تباہ شدہ جہاز کا ڈھانچہ دور سمندری چٹانوں میں لپکا ہوا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی موت کا خیال کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تقدیر میں لکھا تھا۔ میں نے جہاز پر واپس جانے کا دل میں لپکا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ اس طرح سے میں جہاز سے کچھ کھانے پینے کی ضروری چیزیں حاصل کر سکتا تھا۔ میں اپنی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے پاس آیا کہ کنارے ٹوٹ گئے تھے۔ مگر اس کا پیندا بھی تک سلامت تھا۔ چپو خدا جانے طوفان کہاں گر گئے تھے۔ میں کشتی کو کھینچ کر سمندریں لے گیا اور پھر اس پر سوار ہو گیا۔ سمندر کی ایک اسے اپنے ساتھ لے کر واپس لے گئی۔ میں نے ہاتھوں کی مدد سے کشتی کو چٹانوں کی طرف سنا شروع کر دیا۔

بڑی مشکل سے میری کشتی چٹانوں میں اس جگہ پہنچ گئی۔ جہاں جہاز کا آدھا ڈھانچہ بھنسا

غور سے گردن گھا کر جزیرے کی طرف دیکھا۔ یہ مجھے کچھ عجیب سا جزیرہ لگ رہا تھا۔ کیونکہ عام جزیروں کی طرح اس پر درخت بہت کم تھے۔ یا شاید ساحل کے پاس درخت کم تھے۔ اونچی چٹانیں تھیں جن پر سبز رنگ کی کالی مٹی جی ہوئی تھی۔ سمندر کی لہریں میرے پاؤں تک ہو کر واپس جابجا رہی تھیں۔

کوئی دو ڈھائی فرلانگ سمندر کے اندر نوکیلی چٹانوں کے بیچ میں ہمارا پر تلگالی جہاز دو ٹکڑے ہو کر پڑا تھا۔ جس کشتی نے مجھے ساحل پر لا کر پھینکا تھا۔ اس کے ایک پہلو کے تختے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے خداوند کریم کا شکر ادا کیا۔ کہ جس نے اس خوفناک طوفان میں سے میری جان بچائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جہاز کے سارے کے سارے ملاح مارے جا چکے ہیں۔ کپتان سمیت کچھ ملاحوں کی لاشیں تو میں نے خود دیکھی تھیں۔ باقیوں کے بارے میں یہی قیاس اغلب تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے۔ نہیں تو وہ ضرور کسی نہ کسی تختے پر بیٹھ کر ساحل تک پہنچ گئے ہوتے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کی مغفرت کے لئے دعا کی۔ اس کے بعد زندگی بھر میں ان میں سے کسی کی بھی شکل نہ دیکھ سکا۔ وہ سارے کے سارے سمندری طوفان کی نذر ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں نے دیکھا کہ دو تین ملاحوں کی سمندری ٹوپیاں اور جوتے تیرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ لہروں نے انہیں اچھال کر ریت پر لا ڈالا۔ میں نے اٹھ کر سرخ رنگ کی ایک ٹوپی اٹھائی۔ اسے پھوڑا اور پھر جھڑ کر سر پہن لی۔ اسی طرح سے ایک جوڑا بوٹ اٹھائے۔ ان میں سے سمندر کا پانی باہر نکالا اور انہیں بھی پہن لیا۔

میری موٹے کپڑے کی نیلے رنگ کی پتلون گیلی ہو گئی تھی۔ اور قمیص کہنیوں پر سے پھٹ گئی تھی۔ اب بادل چھٹ گئے تھے اور چھنے والی تیز دھوپ نکل آئی تھی۔ میں نے سب سے پہلی حقیقت کو محسوس کیا، وہ یہ تھی کہ زندگی کے آرام و آسائش بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور میرے پاس نہ کچھ کھانے کو ہے اور نہ پینے کو۔ میں دن بھر کا پیاسا مرنے کے لئے اس ویران اور بھیانک جزیرے پر تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ میری جیب میں کسی طرح سے لکڑی کا تمباکو پینے والا پائپ اور تمباکو کا چرے کا تھیلہ بچا رہ گیا تھا۔ میں نے تھیلہ نکالا۔ سارا تمباکو گھیلا ہو چکا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دھوپ میں ڈال دیا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔

یہ لندن میں، میں نے سن رکھا تھا کہ ساحل برازیل کے آس پاس پرزگالی سمندروں میں ہے جزیرے بھی ہیں جن میں آدم غور وحشی رہتے ہیں۔

میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سمندر کے جس ساحل پر میں اترا ہوں، وہ کسی جزیرے ساحل ہے۔ یا کسی براعظم کا ساحل ہے۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ میں نے کولمبس کی طرح کسی نئے عظم کو دریافت کر لیا ہو۔ میں ایک قریب پہاڑی ٹیلے پر چڑھ گیا اور میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ یہ بھی میری بد قسمتی تھی کہ میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں آ گیا تھا۔ جس کو چاروں نٹ سے سمندر نے گھیر رکھا تھا۔ حد نظر سوائے سمندری لہروں کے اور کچھ نہ تھا۔ میں پہاڑی سے نیچے اتر آیا، اور درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے انے لکھاڑی سے درختوں کی ٹہنیاں کاٹیں۔ انہیں اس خیال سے اپنے ارد گرد گاڑ کر ایک پنجرہ بنالیا کہ رات کو کوئی جنگلی جانور حملہ نہ کر دے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

لہذا اس دیران جزیرے میں سوائے میرے اور کوئی انسان یا حیوان نہیں تھا۔

دوسرے روز میں پھر کشتی میں بیٹھ کر جہاز کے ٹوٹے ہوئے حصے پر گیا۔ تاکہ جو کچھ وہاں لاسکتا ہوں، بچا کر لے آؤں۔ خدا خانے اب اس جزیرے پر کشتی دیر زندہ رہنا پڑے کیونکہ جزیرہ عام سمندر کے تجارتی راستوں سے ہٹ کر تھا۔ ویسے بھی ادھر جگہ جگہ سمندر کے اندر رہا ہر نوکیل چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے کوئی جہاز ادھر بہت نہیں کر سکتا تھا اس علاقے میں تو کوئی طوفان کی وجہ سے بھولا بھٹکا جہاز تباہ ہونے کے لئے ہی آتا تھا۔ دوسرے پھرے میں، میں نے جہاز کے ڈھانچے سے جو کچھ حاصل کیا، وہ یہ تھا۔

ملاحوں کے آٹھ جوڑے قمیص تیلوں پھتیس پونڈ سونے کے۔

گندم کی ایک تھیلی رسی کا ایک بٹل دیا سلائی کا بڑا کبس چھتاں پتھر دوورین۔

پانی پینے کا مگ اور کیتلی اور تھالیاں۔

میں نے یہ ساری چیزیں لا کر درخت کے نیچے لکڑی کے پھرے میں رکھ دیں اور اوپر ترپال ل دیا۔ یہ رات بھی میں نے درخت کے نیچے ہی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ پچھلی رات کسی

ہوا تھا۔ باقی آدھا حصہ سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ یہ جہاز کا پچھلا آدھا حصہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس حصے میں سوائے کپاس کی گانٹھوں اور باورچی خانے کے اور کچھ نہیں تھا۔ ظاہر ہے۔ باورچی خانے کا سارا سامان برباد ہو گیا ہوگا۔ پھر بھی دل میں اُمید لئے میں کشتی پر سے اتر کشتی کو کھینچ کر ایک چٹان کے کنارے سے باندھا اور رے کی مدد سے جہاز کے اوپر اُگیا جہاز تباہی کا بھیا تک نقشہ پیش کر رہا تھا۔ آدھا حصہ یوں ٹوٹ کر الگ ہو چکا تھا جیسے کسی نے لیک کو چاقو سے کاٹ دیا ہو۔ یہ حصہ جو باقی بچا تھا اُگے کو جھک گیا تھا اور چٹانوں کی وجہ سے وہاں اٹکارا گیا تھا۔

میں جہاز کے باورچی خانے کے پاس آیا۔ اس کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور دور گرا تھا۔ اندر باورچی خانے کی دیوار میں ایک چٹان کی ٹوک نے گھس کر بہت بڑا شکاف پیدا کر دیا تھا۔ جس میں سے باورچی خانے کا سارا سامان لڑھک کر سمندر کی تہہ میں غرق ہو چکا تھا میں دیوار کو پکڑ کر اس جگہ گیا۔ جہاں پکانے کے تیل کے کنستریٹ سے رہتے تھے۔ ان پر سے کوئی بھی کنستریٹ نہ تھا۔ فرش پر ایک طرف لکھاڑی پڑی تھی۔ وہ میں نے اٹھالی۔ کچن کی ایک الماری ابھی تک بند تھی۔ میں نے لکھاڑی سے الماری توڑ ڈالا۔ اس الماری میں ایک لکڑی کا بڑا سا ڈبہ سالم کا سالم مل گیا۔ اس میں بکری کے گوشت کے کچھ خشک ٹکڑے تھے۔ کچھ چاول تھے کچھ پیاز تھا۔ ایک تھیلا تھا جس میں ترکھانوں کے سارے اوزار موجود تھے، ایک تھیلی میں بارود چھڑے بھرے ہوئے تھے۔ ایک بندوق بھی وہاں سے مل گئی۔ ایک پستول بھی وہیں سے دستیاب ہوا۔

میں نے سارا سامان ایک بورڈ میں ڈال کر کندھے پر اٹھا کر کشتی میں رکھا اور کشتی کو لے کر واپس جزیرے میں آ گیا۔ جزیرے پر آتے ہی میں نے سامان کی بورڈ اسی درخت کے ساتھ لگا دی جس کے اوپر چڑھ کر میں نے رات بسر کی تھی۔ میں نے بورڈ کھول کر تھوڑا سا پیاز اور بکری کا خشک گوشت نکال کر کھایا۔ دیا سلائی سے آگ جلا کر کپڑے خشک کئے۔ پانی میں تمباکو بھر کر سلگایا۔ پستول میں بارود بھرا اور اس خیال سے جزیرے کا چکر لگانے چل کھڑا ہوا کہ خور و دیکھوں تو یہ کس قسم کا جزیرہ ہے اور اس پر کہیں آدم غور وحشی قبیلے تو آباد نہیں ہیں۔

بیٹھے پانی سے بھی بھری ہوئی جہاز پر سے ملی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ آج دن کون سا ہے اور تاریخ کیا ہے۔ اس طرح سے تو میں اتوار کا دن بھی بھول جایا کروں گا۔ جس روز کم از مجھے خدا کی عبادت ضرور کرنی چاہیے۔ میں نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا۔ میں نے ایک تختے کو کاٹ کر اس کی ایک لمبی صلیب بنائی اور صلیب کو کہیں کے سامنے سمندر کے کنارے ریت میں اندر تک گاڑ دیا۔ اس صلیب پر میں نے چاقو سے یہ کھود دیا۔

”میں اس ساحل پر ۳۰ ستمبر ۱۹۵۹ء کو اترتا..... رہا ہوں کرو۔“

صلیب کے لمبے ڈنڈے پر میں نے چاقو سے سات لکیریں کھرج دیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اس جزیرے پر آئے ہوئے سات دن ہو گئے ہیں۔ بس اب یہ میرا کیلنڈر تیار ہو گیا تھا۔ اب میں دن اور تاریخ یاد رکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے چھوٹے سے نصف دائرے میں بنے ہوئے کہیں کو جنگلی درندوں اور وحشی آدم خوروں سے کافی حد تک محفوظ کر لیا تھا۔ اب میرا خیال دوسرے آرام کی چھوٹی چھوٹی ضروری چیزوں کی طرف آیا۔ میں نے ایک درخت کو آری سے کاٹ کر زمین پر گر اڈیا اور کپھادی سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ پھر اس کے تختے بنائے اور اپنے لئے ایک میز، ایک بھاری قسم کی کرسی اور ایک تخت تیار کیا یہ تخت چھوٹا تھا۔ میں نے ان چیزوں کو اپنے لکڑی کی اونچی دیوار والے کہیں کے اندر لاکر رکھ دیا۔ میں نے ایک ڈائری پر جو کہ مجھے جہاز پر سے ملی تھی، روز کے واقعات لکھنے شروع کر دیئے یہ ایک یادداشت تھی۔ میں اتنی دیر تک اسے لکھتا رہا جب تک کہ سیاہی نہ ختم ہو گئی۔ کبھی کبھی میں پہاڑی کی چوٹی پر جا کر کھڑا ہو جانا اور لنگی ہوئی تباہ شدہ جہاز کے کپتان کی دوربین آنکھوں پر لگا کر سمندر کی طرف دیکھتا۔

مجھے یوں لگتا جیسے میں نے دور کسی جہاز کے بادبان کو دیکھ لیا ہے۔ میں غوشی سے ناچنے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا کہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ پھر میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور میں اپنے کہیں میں بچھے ہوئے تخت پوش پر آکر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ جاتا۔ ایک روز میں سمندر کے کنارے گھوم رہا تھا۔ کہ میں نے ایک جگہ پتھروں

درندے کی آواز نہ آئی تھی۔ ایسے لگتا تھا۔ جیسے جزیرے میں کوئی بلی تک نہیں ہے۔ صرف درندہ پر کہیں سے کچھ پرندے آکر رات کو سیر کرتے تھے اور صبح کو اڑ جاتے تھے۔ شام کو سمندر کی طرف سے تیز ہوا چلنے لگی جو ساری رات چلتی رہی۔ صبح اٹھ کر جو میں نے دیکھا تو میرا دل دھک سے رو گیا۔ جہاز کی آخری نشانی اس کا چٹانوں میں پھنسا ہوا آدھا ڈھا پنچ بھی غائب ہو چکا تھا۔ اسے ہوانے اچھال کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔ اور لہروں نے اسے گہرے پانیوں میں غرق کر دیا تھا۔ اس وقت مجھے شدید تہائی کا احساس ہوا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں جزیرے پر تنہا رہ گیا ہوں۔ ایک بات کی مجھے بڑی تسلی ہوئی کہ میں نے جہاز کے غرق ہونے سے پہلے پہلے اس میں سے ضروری چیزیں نکال لی تھیں۔

اب میں نے کسی ایسی جگہ کی تلاش شروع کر دی جہاں میں اپنے رہنے کے لئے چھوٹی سی محفوظ جگہ بناؤں۔ یہ جگہ مجھے پہاڑی کے دامن میں مل گئی جہاں چٹان کے اندر ایک گڑھا سا بنا ہوا تھا میں نے جہاز میں سے لائے ہوئے لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر اس چٹان کے ساتھ نصف دائرے کی شکل میں ایک دیوار کھڑی کر دی۔ رسی سے ڈنڈے جوڑ کر میں نے ایک میڑھی بنالی، دیوار کوئی ڈیڑھ گز اونچی تھی۔ میڑھی کو میں نے ایک لکڑی کے گھر کے اندر لگا کر اوپر کھینچ لیتا۔ یوں اس چھوٹے سے قلعے میں محفوظ ہو جاتا۔ جنگلی جانوروں کا خیال میرے دماغ سے نکل گیا تھا اگر کوئی خطرہ تھا تو آدم خوروں کی طرف سے تھا جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ لوگ شاید اس جزیرے پر آباد ہوں۔

چوتھے روز میں جزیرے کے جنگل میں سے گذر رہا تھا کہ میں نے ایک جنگلی بکری کو دیکھا جو چھوٹی تھی اور بہت تیز بھاگتی تھی۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر وہ میرے ہاتھ نہ لگی۔ میں نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کافی دور جنگل میں جا کر میں نے دو تین بکریوں کو دیکھا۔ اب میں نے بندوق چلا دی۔ ایک بکری زخمی ہو کر گر پڑی۔ میں اسے اٹھا کر اپنے کہیں میں لے آیا۔ اسے کاٹ کر اس کے گوشت کے پارچے بنائے اور انہیں دھوپ میں سکھانے کے لئے رکھ دیا اس کی کھال بھی سکھانے کے لئے لکڑی کی دیوار پر ڈال دی۔ ایک ہفتے میں، میں نے تین جنگلی بکریوں کا شکار کیا۔ ان کا گوشت ذرا ذرا لکھیں تھا۔ میرے پاس نمک بھی تھا اور ایک چمڑے کی مشک

ہن پر میں ہر روز چاقو سے ایک لکیر کھرج دیتا تھا۔ انہی دنوں ایک کتا کہیں سے میرے کہیں کے باہر آکر بیٹھ گیا۔ پہلے تو مجھ سے خوف کھاتا تھا۔ پھر میں نے اسے بکری کا خشک بت ڈالا تو وہ میرے قریب آگیا۔ میں نے اسے پیار کیا تو وہ میرے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ میں نے اس کے بعد پیار اور شفقت کا یہ ایک پہلا تجربہ تھا۔ وہ کتا میرے پاس ہی رہنے لگا۔ میں بگل میں سے کچھ طوطے پکڑ کر پھرے میں بند کر رکھے تھے۔ کچھ طوطے مر گئے۔ باقیوں کو میں نے بردیا۔ صرف ایک سرخ رنگ کا بڑا سا طوطا میرے پاس رہا۔

جب میں بندوق ہاتھ میں لے کر ملاحی کی سرخ ٹوپی سر پر رکھے جنگل میں پانی لینے یا کسے شکار کو جاتا تو یہ طوطا میرے کندھے پر بیٹھا ہوتا تھا۔ میں نے کئی مہینوں سے بندوق چلائی تھی۔ اس کی وجہ سے جنگل میں بکریاں پھرے واپس آگئی تھیں۔ میں نے دو بکریاں پکڑ لیں۔ اور انہیں کہیں کے اندر لاکر باندھ دیا۔ ایک عرصے کے بعد بکری کا دودھ پیا مجھے اپنے جسم میں ایک نئی طاقت پیدا ہوتی محسوس ہوئی۔ میرا گندہ چستے کے پانی اور ری کے دودھ اور گوشت پر تھا۔ گندم کو پتھروں پر میں کر میں اس کا آٹا گوند کر اسے آم پتھر پر لگا کر موٹی سی روٹی بنالیا کرتا۔ یوں میری صحت بحال ہوتی گئی۔ میرے پاس صرف جی تھیلی بارود رہ گیا تھا۔ جس کو میں نے بڑا سنبھال کر اس وقت کے لئے رکھ لیا تھا۔ اب آدم خور وحشی مجھ پر حملہ کر دیں گے۔

آدم خور وحشیوں کا خیال نہ جانے کیوں میرے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان گیارہ مہینے گزر گئے تھے اور کسی بھی آدم خور نے میرے کہیں کا رخ نہ کیا تھا۔ اگر وہ اس زیرے پر ہوتے تو ضرور میرے کہیں پر حملہ کرتے۔ پھر بھی مجھے وہم ہو گیا تھا کہ وہ اس زیرے پر چھپے ہوئے ہیں اور موقع کی تلاش میں ہیں۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس تھی کہ میری نفسیات میں کچھ تبدیلیاں رونما ہونے لگی ہیں۔ مثلاً میں کسی خیال کو ذہن میں نا تو وہ دیر تک میرے دماغ میں رہتا۔ میں اس خیال میں ڈوب جاتا۔ پھر وہ خیال جیسے مجھ اپنی جگہ پر پتھر سا بنا دیتا۔ دوسری تبدیلی یہ آئی تھی کہ میری طبیعت وہمی ہو گئی تھی اور وہم کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آدم خوروں کے بارے میں میں اپنے ذہن کو صاف

میں پھنسنے ہوئے کچھوے کو دیکھا۔ وہ باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر پتھروں کی نوکیں اسے روکے ہوئے تھیں۔ میں نے کچھوے کو پکڑ لیا۔ اس روز میں نے کچھوے کا کرکھا یا۔ اس کا گوشت کھاتا تھا۔ لیکن میں نے تین روز سے سوائے بکری کے سوکھے گوشت کے ایک دو ٹکڑوں کے اور کچھ نہیں کھایا تھا۔ جنگلی بکریاں میری بندوق کی آواز سن کر شاید وہاں سے جا چکی تھی۔ ہفتے بھر کی در بدری کے بعد بھی میں کسی بکری کا شکار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

جہاز پر سے گندم کی جو تھیلی میں بچا کر لے آیا تھا۔ اس کے دانے میں نے اپنے کہیں سے باہر زمین پر بکھر دیئے تھے اب بارشوں کا موسم شروع ہو گیا تھا اور سردی بھی پڑنے لگی تھی ایک رات بارش شروع ہو گئی مجھے بڑا تیز بخار ہو گیا۔ میں اپنے چھوٹے سے کہیں میں چھ روز تک بخار میں پڑا ہونکتا رہا۔ مشک میں سے تھوڑا سا پانی پی کر سخت پوش پر لیٹ رہتا۔ مجھے رات کو بھیا ناک خواب آتے۔ میں ڈر کر اٹھ بیٹھتا اور کہیں سے باہر مونی والی شدید جزیرائی بارش کا شور سنتا رہتا۔

ساتویں روز بخار کا زور ٹوٹ گیا۔ دوپہر کے وقت بارش رک گئی۔ میں رسی کی سیڑھی لگا کر اپنے کہیں کی دیوار سے نیچے اتر آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جو گندم کے دانے میں نے زمین پر بکھرے تھے وہ پھوٹ پڑے تھے اور ان میں سے غور سے نکل کر لہرا رہے تھے۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنا بخار بھول گیا اور مسرت سے ناچنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح ضروری تھا کہ کھیت کو دافر مقدار میں پانی ملتا رہے۔ میں نے جزیرے کا ایک بار پھر تفصیلی جائزے کا فیصلہ کیا اور چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ایک جگہ مجھے ایک چشمہ مل گیا۔ اس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ یہاں جنگلی انگور کی بلیں بھی تھیں اور جنگلی تمباکو کی جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں۔ میں اس چشمے پر سے پانی کی مشک بن کر لے آیا۔ انگور کے گچھے تو درمیان میں نے اپنے کہیں کے اوپر والے درخت کی ٹہنیوں پر سکھانے کو ڈال دیئے تاکہ ان کا منقہ بنا کر رکھا جائے۔

میں نے چھوٹی سی جگہ پر گندم بونڈی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگی۔ مجھے اس گندم جزیرے پر آئے دس مہینے ہو گئے تھے۔ دس مہینے کی مدت مجھے اس صلیبی کیلنڈر نے بتائی

نہ کر سکا تھا۔

ب طرف سے پورے کا پورا کھوکھلا کر دیا۔ کشتی بن کر تیار ہو گئی تھی۔ اب مجھ پر اس ہانک حقیقت کا انکشاف ہو کر وہ کشتی اتنی بھاری تھی کہ میں اسے اپنی جگہ سے ایک بین ہلا سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری ساری جاں سوز محنت ضائع ہو گئی لی میں مجھے یہ پہلے سوچ لینا چاہیے تھا کہ جس درخت کو میں کشتی بنانے کے لئے کھوکھلا کر آیا میں اسے گھسیٹ کر سمندر کے اندر بھی لے جا سکوں گا۔ کہ نہیں؟

میں نے ہمت نہ ہاری اور ایک چھوٹے درخت کا تنا کاٹ کر اسے ریت پر گرہا دیا۔ اور دوڑی اور چھینی سے کھوکھلا کر نام شروع کر دیا۔ ایک مہینے کی محنت کے بعد کھوکھلی کشتی بار ہو گئی۔ میں اسے دھکیلتا ہوا سمندر میں لے گیا۔ اس کشتی پر سوار ہو کر میں نے جزیرے کے نزدیک چکر لگایا۔ جزیرے کا جنوبی کنارہ بھی ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ شمال اور مشرقی کنارہ۔ یہ ہری بھوری بھوری کافی لگی چٹانیں تھیں اور ساحل کے ساتھ ساتھ گھنے درخت اُگے تھے۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ ہی کشتی کھیتا رہا۔ بڑی سمندری لہروں کے خطرے کی میں سمندر میں آگے نہ گیا۔

بچے اس ویران اور بے آباد جزیرے پر رہتے ہوئے چار سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ یہ طویل دن راتیں تھیں۔ یہ عرصہ گویا ایک عفرین عرصہ تھا۔ جب میں نے کسی انسان سے بات نہ کی تھی مان کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اس ڈر سے کہ میں اپنی زبان نہ بھول جاؤں۔ میں اپنے کتے اور طوطے یزی میں باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ گزر جانے پر جانوروں کی زبان کا زیادہ اثر ہونا عام ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں، میں اپنی زبان بھولنے لگا اور زیادہ تر یا تو خاموش رہتا اور ماروں اور مختلف آوازوں سے جانوروں کے ساتھ بات کرتا۔ یہ چار سال کی لمبی مدت میں ہنر دینا سے ہزاروں میل دور ایک بے آباد ویران جزیرے پر ایک طوطے اور ایک کتے کے ساتھ گزار دی تھی۔ مجھے لندن میں رہتے ہوئے اپنے بچپن کے ساتھیوں کی صورتیں بہت آئیں۔ مجھے کبھی کبھی ایسے لگتا جیسے میرا باپ میرے سامنے آکر درختوں کے نیچے کھڑا ہے۔ مجھے اشارے سے بلا رہا ہے۔ میں لپک کر ڈیڑی کہہ کر اس کی طرف بڑھتا اور وہ غائب ہوتا تھا۔ مجھے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کر کے سمندری سفر نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن نہیں

میں ہر روز صبح اٹھ کر اپنے خدا کو یاد کرتا اور بائبل کے یہ الفاظ دہراتا۔ ”اے خدائے تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے ہر طرح کی نعمت دی، ہر روز دعا کے بعد مجھے محسوس ہوتا کہ سچ مجھے دنیا کی ہر ایک نعمت میسر ہے اور جتنا خوش میں اس گمنام تنہا جزیرے پر ہوں شاد و دنیا کے کسی بھی خطے میں اتنا نہ خوش رہ سکتا۔ اس کے باوجود شدید تنہا کا احساس سایہ بن کر میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا۔ میں جب تنہائی سے گھبرا جاتا تو وہاں کتے اور طوطے سے باتیں شروع کر دیتا۔ وہ میری باتوں کا جواب تو نہ دے سکتے تھے۔ لیکن مجھے لگتا کہ میں ان کی زبان سمجھنے لگا ہوں۔ مثلاً طوطا جب دوبار میں ٹپیں کرتا اس کا مطلب تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ تین بار میں ٹپیں کر کے پروں کو پھیر پھراتا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ جنگل کی سیر کو جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں اس کے پاؤں کی رسی کھول کر اسے اپنے کندھ پر لے آتا تھا۔

گھنٹہ دو گھنٹہ وہ جنگل میں گھوم پھر کر اپنا پیٹ بھر کر واپس کہیں میں آکر میرے کندھ پر بیٹھ جاتا۔ رات کو وہ میرے کہیں کے درخت پر سوتا تھا۔ ایک رات مجھے کہیں کے باہر ایک آواز سی سائی دی۔ جیسے کوئی پتوں پر چل رہا ہے۔ میں چونکا ہو گیا۔ جلدی سے رسی کو میڑھ پر چلی کر لکڑی کی دیوار سے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ جنگل میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی درختوں پر گہری خاموشی طاری تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر ایک بلی بھاگ کر گزر گئی میں بیڑھی پر سے اتر کر اپنے تخت پر لیٹ کر بکری کی کھال کا کپڑا اوڑھ کر اڑھوں بیٹھ گیا۔ اب ایک بار پھر آدم خور وحشیوں کے خیال نے میرے دماغ میں چکر لگانے شروع کر دیئے۔

میں نے سوچا کہ مجھے ایک کشتی بنانی چاہیے۔ کیونکہ پرانی کشتی جگہ جگہ سے اس قدر ٹوٹ بھوٹ گئی تھی کہ اس کی دوبارہ مرمت ناممکن ہو گئی تھی۔ میں نے کلبھاڑی سے ایک درخت کو کاٹ کر زمین پر گرہا دیا اور کلبھاڑے اور چھینی کی مدد سے اس کو ایک طرف سے کھوکھلا کر نام شروع کر دیا۔ میں اس درخت کو کھوکھلا کر اس کی کشتی بنانا چاہتا تھا۔ جس طرح کہ وحشی لوگوں کی کشتیاں ہوتی ہیں۔ کوئی ایک مہینے کی عرق ریز محنت کے بعد میں نے درخت کے

کردوربین سے سمندر کو دور تک ایک نظر ضرور دیکھا کرتا۔ اس خیال سے کہ شاید
بے بادبان نظر آجائیں اور میں آگ بجلا کر دھوئیں سے اسے اپنی طرف متوجہ کر
چار سالوں سے میں ناامید چلا آ رہا تھا۔ ادھر سے کبھی کوئی جہاز نہ گذرتا تھا۔

نے کڑی کی ایک میز بنائی تھی۔ جس پر بیٹھ کر میں کھانا کھاتا۔ میں خود ہی کھانا تیار
ہی میز پر لگاتا پھر خود ہی ایک جلاوطن بادشاہ کی طرح بیٹھ کر کھاتا۔ میرے دائیں
لاتا اور دو لیاں بھی کرسی پر بیٹھی ہوتیں جنہیں میں اپنے ساتھ کھانے میں سے پورا پورا حصہ
تا اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ کسی وقت وہ جھنجھلا جاتا اور زور زور سے بھونکتا
دائرے میں دوڑنا شروع کر دیتا۔ جیسے اپنی دم کا بیچھا کر رہا ہو۔ طوطے کی گردن
ی بال جھڑ گئے تھے۔ مگر یہ کسی ایسی نسل کا طوطا تھا کہ پرانے بالوں کے جھڑتے ہی نئے
اتے تھے۔ پھر بھی بڑھاپے نے اس پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری جلد کا رنگ گہرا
ہو کر سیاہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس حالت میں اگر لندن میں میرا باپ مجھے دیکھ لیتا
بہچان سکتا کہ میں اس کا بیٹا ہوں مجھے انگریزی زبان کے، اپنی زبان کے کئی لفظ بھول
بھی کوئی لفظ یاد آتا تو اس کا مفہوم بھول جاتا۔ مفہوم یاد آتا تو لفظ کی شکل ذہن
جاتی۔

میں طرح شدید تنہائی میں انسانوں سے دور اس غیر آباد عالم جزیرے پر رہتے ہوئے مجھے
سال گزر گئے۔ میری عمر چونتیس برس کی ہو گئی۔ میرے سر اور داڑھی کے بالوں میں سفید
لگے تھے۔ میں نے چستے کے پانی میں ایک روز اپنا عکس دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو
مجھے اپنی مرحوم ماں اور باپ یاد آ گیا۔ میں دیر تک بچوں کی طرح زار و قطار روتا رہا۔
بلی بندھ گئی۔ یوں لگا۔ جیسے دس سال کے آنسو ایک گھنٹے میں میری آنکھوں سے بہہ
ہیں۔ دس سال زندگی کا ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ میری جوانی کا سورج اسی بد قسمت
برے میں غروب ہونے لگا تھا۔ مجھے خیال آتا کہ میری جدائی میں میرے باپ کی کیا حالت
ہو؟ وہ تو یہی سمجھ رہا ہوگا۔ کہ جہاز طوفان میں غرق ہو گیا اور میں بھی دوسرے ملاحوں
ماتھ ڈوب گیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کا بد نصیب بیٹا لندن سے دور..... بہت دور

ایسا نہیں تھا۔ اگر میں یہ سفر نہ کرتا تو مجھے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی اور بھیانک تجربے
دو چار نہ ہونا پڑتا اور ابھی کوئی پتا نہیں تھا۔ کہ کیسے کیسے تجربات میری زندگی کی سطح سے اُبھ
دا لے تھے!

میں نے اب جزیرے میں باقاعدہ رہنا شروع کر دیا تھا۔ میرے کھیت میں گندم کی فصل
تھی۔ میں اس کا آٹا پیس کر رکھ دیتا اور اس کی روٹی پکا کر بکری کے گوشت سے کھاتا۔ دیہات
کی ختم ہو گئی تھی۔ میں چمٹاق کے پتھر سے آگ جلاتا تھا۔ بکری کی کھال کی میں نے ایک جیکٹ
تھیلہ سی پتلون بنا کر پہن لی تھی۔ اب میں سمندر سے مچھلیاں بھی پکڑ لیتا تھا۔ تمباکو مجھے جزیرے
جنگلی کھیتوں سے مل جاتا تھا۔ اس طرح میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ ایک آزاد قیدی کی زندگی
ایک ایسے انسان کی زندگی تھی۔ جسے قسمت اور ایک سمندری طوفان نے انسانوں کی دنیا
ہزاروں میل دور ایک گنام اکیلے اور بے آباد جزیرے میں لاکر پھینک دیا تھا۔ میری عرب
جو میں برس کی ہو گئی تھی۔ میرا ہیلمی کیلنڈر مجھے بتا رہا تھا کہ مجھے چار سال جزیرے پر آئے ہو
گئے تھے۔ کیلنڈر کی لکڑی پر اب مزید دنوں کی گیسریں ڈالنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ چنا
نے اس کے ساتھ ہی ایک اور لکڑی کا کھم کاڑ دیا تھا۔

میری پہلی بحری سرخ ٹوپی پھٹ گئی تھی۔ جوتے بھی ختم ہو چکے تھے۔ میں نے بکری کی کھال
اور ٹوپی بنائی تھی۔ میرے ڈاڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھ گئے تھے۔ ناخن میں ایک جہاز
سے تراش لیا کرتا۔ کبھی کبھی اس چھری سے ڈاڑھی اور سر کے بال بھی کاٹ کر پھینک دیا کرتا
پھر میں تنگ آ گیا اور میں نے بالوں کو بڑھنے دیا۔ بکری کی کھال ہی کی میں نے ایک چھتری
لی۔ جب میں کہیں سے باہر بارش یا دھوپ میں جاتا تو چھتری تان لیتا۔ میرا حیلہ یہ ہوتا کہ
پر لال طوطا بیٹھا ہے۔ نسل میں توڑے والی بندوق دبا رکھی ہے۔ گلے میں دو رہیں لنگ رہے
سر پر بکری کی کھال کی ٹوپی ہے۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بھول رہے ہیں۔ اگر میں اپنے آپ
سامنے کھڑے ہو کر دیکھتا تو مجھے یقیناً ایسے لگتا جیسے کوئی زمانہ قبل از تاریخ کا آدمی بندوق
میں دبائے چھتری کھولے غار سے نکل کر باہر آ گیا ہے۔ اب میں نے اپنے آپ کو قسمت کے
کر دیا تھا۔ میں اپنی تقدیر میں لکھے ہر حادثے کے لئے تیار تھا۔ میں روزانہ صبح شام پہاڑی

وہ انسانوں کی شکل و صورت والے تھے اور میرے لئے یہ بات بڑی مسرت انگیز تھی
ہے ہوئی کہ یہ آدم خور وحشی تو اس بد قسمت لڑکے کو کھا جائیں گے۔ تو کیا مجھے مخالفت
چاہیے۔

وہ آدم خور وحشی مجھے ساری انسانیت کے دشمن نظر آنے لگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ قیدی
ان کے چنگل سے بچ نکلنے کی پوری پوری جدوجہد کر رہا ہے۔ لیکن وہ چھ سات آدم خوروں
بغض میں تھا جو اس سے زیادہ طاقتور تھے۔ میں آج اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ کئی سالوں
سنانوں کو دیکھ کر میں دم بخود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اور میری سوچنے اور فیصلہ کرنے کی طاقت
روح سی ہو گئی تھی۔ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ابھی میں شش و پنج میں ہی تھا۔
انے دور میں سے دیکھا کہ قیدی لڑکا ایک زوردار جھنگل کے ساتھ ان آدم خوروں کے چنگل
زاد ہو گیا اور اس نے میرے ٹیلے کی جانب بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ میں اسے دور میں
پنے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے آدم خور پانچوں کی طرح بھاگے۔

لڑکا دبا پٹلا اور پھر تپلا تھا۔ وہ کسی ہرن کی طرح کلا پٹیں بھرتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ آدم خور
اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اور اسے پکڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اچانک
سی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ آدم خور اس پر درندوں کی طرح چھپے۔ لیکن لڑکا ایک بار پھر
بھاگتوں سے نکل گیا۔ اب وہ میرے قریب آ گیا تھا۔ اور دور میں میں مجھے اس کی پسینے
زاور شکل صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ گہرے سانوسے رنگ کا بھولے بھولے چہرے والا لڑکا
اس کا سانس بڑی طرح پھولا ہوا تھا۔ موت کے درندے اس کا پوری دیوانوں کی طرح
چلا آ رہا تھا۔ موت کے درندے اس کا برابر تعاقب کر رہے تھے۔ لڑکا ننگا تھا۔ اس کے
ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے صرف ایک لنگوٹ باندھ رکھا تھا۔

اچانک جیسے مجھ میں ایک تبدیلی سی رونما ہوئی۔ میں ہوش میں آ گیا۔ میرے دل میں اس
کے وحشی آدم خوروں سے بچانے کی آرزو نے ہل چل مچا دی۔ میں نے جھٹ سے بندوق
در لڑکے کے پیچھے آنے والے ایک آدم خور وحشی کے سینے کا نشانہ باندھ کر گولی چلا
۔ دھائیں کی آواز سے جزیرے کا ساحل گونج اٹھا۔ درختوں پر سے پرندے شور مچاتے

..... ایک دیران بے آباد جزیرے پر زندگی کے بدترین، تاریک ترین بہت روز گزار رہا ہے
مجھے جزیرے پر آئے پندرہ برس ہو گئے تھے کہ ایک روز عجیب اتفاق ہوا۔ میں صبح
وقت اپنے کیمپ میں سے نکل کر کشتی کی طرف جا رہا تھا۔ بندوق میری بٹل میں تھی۔ طوطا میر
کنڈھے پر تھا۔ کھلی پتھری میرے سر پر تھی۔ دور میں میرے گلے میں لٹک رہی تھی۔ میری داڑ
اور سر کے لمبے اور سیاہ سفید بال جزیرے میں سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں لہرا رہے
تھے کہ اچانک میں بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ میں ریت پر کسی انسان کے ننگے پاؤں کے نشان دیکھ
رہا تھا۔

سب سے پہلے مجھے ایک آدمی کے پاؤں کے نشان نظر آئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا
دلوں تین چار آدمیوں کے پیروں کے نشان تھے۔ ساہا سال کے بعد میں اجاڑ جزیرے پر پہلی
کسی انسان کے پاؤں کے نشان دیکھ رہا تھا۔ میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی
تھی اور حیرانی بھی۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ نشان تازہ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے
لوگ ابھی ابھی وہاں سے گزرے ہیں۔ میں نشانوں کے ساتھ ساتھ آگے چل پڑا۔ کوئی ایک ذرا
چلنے کے بعد یہ نشان ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف نیچے اتر گئے۔ میں ٹیلے
اد پر جھاڑیوں کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے دور ساحل سمندر کے پاس ریت پر کچھ لوگ نظر
آئے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ ایک کشتی بھی دکھائی دی
سمندر کے کنارے ریت پر کھڑی تھی۔

میں نے دور میں لگا کر دیکھا تو میری حیرانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ دور سمندر کے کنارے
ریت پر چھ سات نیم عریاں وحشی آدم خوروں نے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے کو پکڑ رکھا تھا
اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاس ہی دو وحشی آگ جلا رہے تھے
میرا کلیہ منہ کو آ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ لوگ اس لڑکے کو کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک
وحشی قریب ہی پھیرا لئے کھڑا تھا جیسے وہ بد قسمت لڑکے کے ٹکڑے کرنے کے لئے اشارے
کا منتظر ہو۔ میں یہ سارا خوفناک کھیل ٹیلے پر جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا دیکھتا رہا۔ اتنی مدت بعد
انسانوں کی شکل دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ لوگ آدم خور تھے۔

یات سے ذہنی طور پر میرے قریب آچکا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کا ہمدرد ہوں۔ اسی میں نے آدم خوروں سے اس کی جان بچائی ہے۔ میں نے دور بین نگاہ سے دیکھا کہ آدم خوروں لاشی بہت دور ایک دھبے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ میں حیران ہوا کہ یہ لوگ آخر کس طرف سے آئے ہیں۔ اور کس طرف کو چلے جا رہے ہیں۔ کم از کم ایک بات تو ظاہر تھی۔ کہ اس جزیرے کے قریب کوئی دوسرا جزیرہ بھی ہے۔ جہاں آدم خور وحشی قبیلہ آباد ہے۔

وحشی لڑکے کو میں نے ایک بار پھر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے لڑکا ایک دم میرے پاؤں پر گر پڑا۔ اور اپنی زبان میں میرے احسان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ وہ میرے بچہ چوم رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اسے اپنے ساتھ ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وحشی لڑکا بے پیچھے چل پڑا۔ میں اسے لے کر اپنے کیمپ کے باہر آگیا۔ رسی کی سیڑھی ابھی تک لکڑی کی نیم مدور اس سے نیچے لٹک رہی تھی۔ میں سیڑھی چڑھ کر اوپر آگیا اور لڑکے کو بھی اوپر آنے کا اشارہ کیا، تو وہ ذرا جھجکا۔ لیکن میرے اشارے پر وہ خوشی خوشی کیمپ میں آگیا۔ میرا کتا اسے دیکھ کر رزور سے بھونکنے لگا۔ میں نے کتے کو چپ رہنے کے لئے کہا۔ پھر لڑکے کو لکڑی کی پلیٹ اچھیکا دیا ڈال کر کھلایا۔ پہلے تو اس نے دیے کو غور سے دیکھا۔ پھر چمکا اور شوق سے رسی پلیٹ کھا گیا۔

میری یہ کوشش تھی کہ میں اس سے پوچھوں وہ کون ہے۔ اور یہ آدم خور اسے لقمہ اجل بنانے لئے کہاں سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ میں اس کی زبان نہیں جانتا تھا اور وہ بے زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اشاروں اشاروں میں اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے۔ اور کہاں سے آیا ہے۔ ایک مدت سے اس بے آباد جزیرے پر انسانوں کی صحبت سے محروم رہنے کی وجہ سے میں اشاروں کی زبان بہت حد تک سمجھنے لگا تھا۔ وحشی لڑکے نے اشاروں غول غاں سے مجھے جو کچھ بتایا اس سے میں اتنا ہی سمجھ سکا کہ وہ اس جزیرے سے قریب ہی جزیرے میں اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا باپ جزیرے کے قبیلے کا سردار ہے۔ قبیلے نے ان کے قبیلے پر حملہ کر کے سارے لوگوں کو قتل کر دیا اور اب اس کو گرفتار کر کے بے آباد جزیرے پر لائے تھے تاکہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھون کر کھایا جائے۔

اڑ گئے۔ دوسرے لمحے ریت پر آدم خور وحشی کی لاش خون میں لت پت پڑی توڑ رہی تھی۔ اپنے ایک ساتھی کو مرنے دیکھ کر دوسرے آدم خور ایک دم سے رک گئے۔ چڑکا بھاگ کر میرے پاس آگیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا بابتنا ہوا کبھی تعجب ہے مجھے دیکھتے اور کبھی ریت پر ترپنے والی لاش کو تک رہا تھا۔ دوسرا آدم خور وحشی آگے بڑھا تو میں نے اس پر بےستول سے فائر کر دیا۔ میرا نشانہ اتنے سالوں کے بعد بھی اتنا اچھا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ گوئی دوسرے آدم خور وحشی کے ماتھے پر لگی۔ اور وہ بھی خون آلود ہو کر ریت پر گر پڑا۔ اس کی لاش کو دیکھ کر وحشی آدم خور اپنے پاؤں بھاگ اٹھے۔ میں نے ان پر ایک اور فائر کر دیا۔ یہ نشانہ خط گیا۔ لیکن آدم خور اس قدر غم زدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بگڑ بھاگتے ہوئے کشتی میں سوار ہوئے اور اسے تیزی سے چلاتے ہوئے کھلے سمندر میں نکل گئے۔

وحشی لڑکا اسی طرح بھائیوں میں کھڑا میری طرف حیرانی سے تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر اور ممنونیت کے جذبات تھے۔ اس کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہ آ رہی تھی۔ کہ میں نے اس کی جان کیوں بچائی اور میرے پاس ایسا کون سا آلہ ہے جس کی مدد سے میں نے اتنی دور سے دو آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ میں بھی ایک طویل مدت کے بعد اپنے سامنے انسان کے بچے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ اپنی جگہ سہما ہوا سا کھڑا تھا میں اس کے پاس آگیا۔ میں نے اسے جھک کر اس طرح دیکھا۔ جیسے کسی عجیب مخلوق کو دیکھ رہا ہوں۔ ایک انسان کو دیکھ کر میرے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے اس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے انگریزی میں کہا۔

”میں تمہارا دوست! تم میرے دوست!“

لڑکا کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ ابھی تک ملہما ہوا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

”تم میرے بچے۔ تم انگریزی نہیں سمجھتے؟“

میری زبان لڑکے کی سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن وہ میرے چہرے کے تاثرات اور میری دودنا

کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ آدم خور وحشیوں نے جزیرے کا ابھی تک رخ نہ کیا تھا۔ اس غرصے میں فرائی ڈے میرے ساتھ کافی کھل مل گیا تھا۔ اس نے مجھ سے انگریزی کے چند موٹے موٹے ضروری لفظ بھی سیکھ لئے تھے۔ وہ کتے کو انگریزی میں COME کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھے ماسٹر کہنے لگا تھا۔ ایک روز وہ بڑے تعجب کے ساتھ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اس آدم خور جزیرے پر کیسے آگیا میرا کپن، میرا صلیب اور میرے بڑے ہونے بال دیکھ کر اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ایک عرصے سے اس جزیرے پر پڑا ہوں۔

میں نے اشاروں اور ٹوٹی بھوٹی انگریزی میں اسے بتایا کہ مجھے اس جزیرے پر آئے ایک عمر ہو گئی ہے اور میرا جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر غرق ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اسے اوپر بہاڑی پر لے جا کر وہ صلیب دکھائی جس پر میں نے اس جزیرے میں وارد ہونے کی تاریخ اور دن لکھا تھا۔ دنوں کے شمار کی لکڑی کو گھن کھا گیا تھا۔ میں نے بھی چار پانچ سال گزرنے کے بعد اس پر دنوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ فرائی ڈے میری ایک ایک شے کو حیرانی اور تعجب سے دیکھتا اور سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں میری بہادری اور بہمت کی داد دے رہا ہے۔ فرائی ڈے میرے بڑے کام کرتا۔ وہ زمین پر آگے ہونی گندم کاٹ کر اسے جھاڑ کر گہوں الگ کرتا۔ پھر گہوں کو پتھر کے سسل بٹے پر بیٹتا۔ اسے گوندھ کر روٹی پکاتا۔ سمندر جا کر کتے کو ہنلاتا۔ جنگل میں جا کر انگور کے کچھے توڑ کر لاتا اور انہیں خشک کرنے کے لئے درختوں کی ٹہنیوں پر ڈال دیتا۔ ایک روز وہ تیرکان سے کر جنگل میں گیا اور واپسی پر دو بکریوں کا شکار کر کے لایا۔ اس روز ہم نے بکریوں کا گوشت بھون کر کھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ فرائی ڈے کو بکری کے گوشت کا مزہ نہیں آ رہا۔ میں نے ذرا گھبرا کر اس سے اشاروں میں پوچھا کہ کیا۔ اسے بھی انسانوں کا گوشت کھانے کی عادت ہے؟

اس پر وہ شرمایا اور گردن کو ادھر ادھر ہلا کر اشاروں میں بتانے لگا کہ اس نے انسانوں کا بہت گوشت کھایا ہے اس لئے اس بکری کے گوشت کا مزہ نہیں آ رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اب بھی انسانوں کا گوشت کھانا چاہتا ہے؟ اس نے سر کو نفی میں ہلا کر کہا کہ انہیں اب وہ انسان کا گوشت نہیں کھانا چاہتا۔ اسے بکری کا گوشت ہی بہت پسند ہے۔ فرائی ڈے

یہ کافی روٹنے لکھڑے کر دینے والی کہانی تھی۔ میں خود آدم خور وحشیوں سے بہت دنوں تک خوف زدہ رہا تھا۔ ساہا سال تک جزیرے پر زندہ رہنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی آدم خور نہیں ہے۔ لیکن اب پتا چلا کہ جزیرے پر تو کوئی آدم خور وحشی قبیلہ نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک جزیرہ ہے۔ جہاں یہ عالم درندے آباد ہیں۔ ان آدم خور وحشیوں کا ہمارے جزیرے پر دوسری بار حملہ یقینی تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ ان کے دشمن نے یہاں کے میرے پاس پناہ لے رکھی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے ان کے دو آدمیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ جن کی لاشیں ابھی تک سمندر کے کنارے ریت پر پڑی تھیں میں نے حفظ قدم کے طور پر آدم خور وحشیوں سے بچنے کے لئے پوری تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے تو میں نے وحشی لڑکے کو پستول چلائی سکھائی۔ میں نے اس لڑکے کا نام فرائی ڈے رکھ دیا تھا۔ کیونکہ جس روز وہ میرے جزیرے پر مجھ سے ملا وہ مجھے یعنی فرائی ڈے کا دن تھا۔ دو چار روز کی کوشش کے بعد فرائی ڈے نے پستول چلانا سیکھ لیا۔ وہ اچھا نشانہ تو نہیں لگا سکتا تھا لیکن اپنے سامنے آئے ہوئے دشمن کو گولی جلا کر ہلاک ضرور کر سکتا تھا۔ میں نے لکڑی کی دیوار میں چھ جگہوں سے چھوٹے چھوٹے سوراخ بنا دیئے تاکہ اگر دشمن حملہ کرے تو اس پر گولی چلائی جاسکے۔ بارود میرے پاس بہت تھا۔ اور لوہے کے چہرے بھی تھیلی میں بھرے پڑے تھے۔

لکڑی کی دیوار کے اوپر میں نے جنگل سے لمبے لمبے کانٹوں والی جھاڑیاں توڑ کر اس طرح سے بچھا دیں کہ اندر آنے میں رکاوٹ پیدا ہو سکے۔ وحشی لڑکا فرائی ڈے تیرکان چلانے میں بڑا ماہر تھا۔ میں نے اسے درخت کی ایک مضبوط شاخ کاٹ کر کمان بنادی اور لکڑی کے نوکیلے تیر بھی بنا کر دے دیئے۔ اب وہ میری طرح سے مکمل طور پر مسلح ہو چکا تھا۔ فرائی ڈے نے بھی اشاروں میں مجھے خبردار کر دیا تھا کہ دشمن حملہ کر کے اسے حاصل کرنے اور اپنے مرے ہوئے ساتھیوں کا بدلہ لینے کسی نہ کسی وقت جزیرے پر ضرور آئیں گے۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔ صبح شام دور بین ہاتھ میں لئے جزیرے کے مغربی ساحل کا چکر کاٹ کر پہرے داری کرتا۔ اور دور بین لگا کر دیکھ لیتا تھا کہ کہیں دشمن چوری چھپے جزیرے میں داخل تو نہیں ہو گیا۔ اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ آدم خور وحشیوں نے جزیرے میں داخل تو نہیں ہو گیا۔ اس واقعے

کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ کوئی پتوں پر چلتا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے خاص طور پر کہیں کی دیوار کے باہر خشک پتے بکھر دیئے تھے تاکہ اگر کوئی رات کو حملہ کرنے کی نیت سے آئے تو ہمیں اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دے جائے۔

میں نے فرائی ڈے کی طرف دیکھ کر سرگوشی میں کیا۔

”فرائی ڈے۔ کون؟ کہاں؟“

فرائی ڈے نے ایک ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر منہ سے کسی جانور کی ہلکی سی آواز نکالی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دشمن کا کوئی آدم غراس جزیرے پر آیا ہے۔ اور اس نے جانور کی خاص آواز نکال کر اپنے دوسرے ساتھی کو خبردار کیا تھا۔ ان آوازوں کو چونکہ فرائی ڈے سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ ہوشیار ہو گیا۔ اور اس نے مجھے جگا دیا۔ ہم دونوں اپنے اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک سوراخ میں پستول کی نالی اور بندوق کی نالی رکھی تھی اور دوسرے سوراخوں سے ہم باہر اندھیرے میں جھانک رہے تھے۔ اب میرے لئے رات کا اندھیرا، اندھیرا نہیں رہا تھا۔ میں اندھیرے میں بھی اس طرح صاف دیکھ لیتا تھا۔ کہ جس طرح روشنی میں کبھی دیکھا کرتا تھا۔ پندرہ برس سے میں اس جزیرے پر راتوں کے اندھیرے میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں تو اوی کی طرح اب رات کے اندھیرے میں بھی دیکھنے لگا تھا۔

ویسے آسمان کے ستاروں کی بھی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر سوائے سمندر کی طرف سے آنے والی لہروں کی ہلکی ہلکی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جنگل کی طرف بھی گہری خاموشی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ فطرت کی گود میں پرورش پانے والے لڑکے فرائی ڈے کے کان جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس نے اگر سچ کچ کوئی آواز سنی ہے۔ تو پھر اس آواز میں ضرور کوئی حقیقت ہوگی یہی وجہ تھی کہ میں پوری طرح دشمن کے حملے کا جواب دینے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ میرے پاس گھڑی تو کوئی نہیں تھی۔ میں وقت کا اندازہ آسمان کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ستاروں کا جھوم مغرب کی طرف زیادہ جھک گیا ہے۔ اس لئے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ میں نے بارود کی تھیل۔ لوہے کے چھروں کی تھیلی، بندوق صاف کرنے والی نالی اور اسی طرح فرائی ڈے کی پستول کا سامان بھی اس کے پاس تخت پر رکھ دیا تھا۔ فرائی ڈے

کو میرے پاس رہتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران میں اس نے انگریزی کے بہت سے لفظ سمجھ لئے تھے اور وہ ٹوٹے پھوٹے لفظ بول کر اپنا مطلب ادا کر دیتا تھا۔ میری محبت نے اس کا جنگلی پن کسی حد تک دور کر دیا تھا۔ میں اسے قصداً بکری کا گوشت کم دیتا تھا۔ اسے زیادہ تر روٹی اور انگوڑ کھانے کو دیتا تھا کہ اس کے گوشت کھانے کی عادت بالکل چھوٹ جائے۔ ایک مہینے بعد کا ذکر ہے کہ ایک رات میں حسب عادت اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ پستول صاف کر کے میں نے تخت پر رکھا ہوا تھا۔ ان کی صفائی میں بلاناغہ کیا کرتا تھا۔ فرائی ڈے پتھر کی سل پر گہروں کے دانے رکھے میں آگ جل رہی تھیں۔ جس کی روشنی میں گہروں پیتے ہوئے فرائی ڈے پتھروں کے بنے ہوئے چوہے میں آگ جل رہی تھیں۔ آج میں نے اپنی کشتی میں بیٹھ کر سمندریں کنارے کنارے گشت کی تھی اور سارے جزیرے کا چکر لگایا تھا۔ صبح اور شام کو اپنی روز کی عادت کے مطابق اُونچے ٹیلے پر چڑھ کر دور میں سے دیر تک سمندر میں دیکھتا رہا تھا کہ کہیں کوئی مھولا بھٹکا جہاز تو ادھر سے نہیں گزر رہا۔ اور حسب عادت نا اُمید ہو کر واپس آگیا تھا۔ تھکن اور نا اُمیدی نے میرے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ رات کو تھوڑا بہت کھانا کھاتے ہی مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے فرائی ڈے کو سمجھا یا کہ میں سو رہا ہوں۔ وہ کچھ دیر پہرہ دے اور پھر غور دہی سو جائے۔ میں تخت پر ہی ٹانگیں پھیلا کر سو گیا۔

آدھی رات کو فرائی ڈے نے مجھے اچانک جگا دیا۔ وہ میرے کندھے کو زور زور سے ہلا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ فرائی ڈے؟“

اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھا یا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کہیں کے باہر پھر رہا ہے۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ ایک دم سے جو کس ہو گیا۔ پستول فرائی ڈے کو دے کر دیوار کی سوراخ کے موڑے پر بیٹھا دیا۔ خود داخل لے کر دوسرے سوراخ کے موڑے پر بیٹھ گیا۔ دیوار کے اوپر کھٹنے دار جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے جزیرے کی آدھی رات کی خاموشی پر کان لگا دیئے۔ صرف سمندر کی طرف سے لہروں کے ہلکے ہلکے شور کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر میں نے سوراخ میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی

اپنا بنایا ہوا تیر کمان بھی لئے ہوئے تھا۔

ہم ہمہ تن گوش ہو کر اس دشمن کے حملے کا انتظار کر رہے تھے جس کی نشان دہی فرئی ڈے نے کی تھی۔ ہماری آنکھیں اور کان باہر لگے ہوئے تھے۔ باہر سوائے خاموشی کے اور کچھ بھی نہیں تھا اب میں نے فیصلہ کیا کہ باہر نکل کر دشمن کا سراغ لینا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔ میں جزیرے کے سارے جنگل کے ایک ایک چپے سے واقف تھا میرے لئے چھپ کر دشمن کو تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ میں نے فرئی ڈے کو سرگوشی میں سمجھایا کہ میں دیکھ بھال کے لئے باہر جا رہا ہوں لہذا وہ اندر چوکس رہے۔ میں جس سیڑھی سے اتر کر باہر جاؤں گا۔ وہ اسے میرے باہر اترتے ہی اوپر کھینچ لے اور جب میں سیٹی بجاؤں تو فوراً سیڑھی باہر پھینک دے۔ میری سیٹی کا مطلب یہ ہو گا کہ میں باہر آ گیا ہوں۔ اور اوپر آنا چاہتا ہوں۔ فرئی ڈے اگرچہ ایک آدم خور وحشی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن وہ بلا ذہین نوجوان تھا۔ وہ میرے اشاروں اور انگریزی کے بعض الفاظ کو بوسے مفہوم کے ساتھ سمجھ جاتا تھا۔ اس نے ذرا سا مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور میں نے آہستہ سے رمی کی سیڑھی باہر لٹکا دی۔

بڑی خاموشی سے بندوق ہاتھ میں لئے میں کہیں سے باہر آ گیا۔ بندوق بھری ہوئی میرے ہاتھ میں تھی۔ ایک چھڑ بھی میں نے دوسرے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ کم بخت اس وقت میرا کہیں کے اندر سویا ہوا طوطا جاگ کر نہیں ٹپک کر کے بول اٹھا۔ شاید وہ بھی اپنی عادت کے مطابق میرے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت طوطے کی آواز مجھے بہت بری لگی۔ کیونکہ اسے بولتا ہوا سن کر کسی درخت پر سے الونے بھی اپنی ہو ہو شروع کر دی۔ فرئی ڈے نے میری ہدایت کے مطابق اسی وقت سیڑھی اوپر کھینچ لی۔ میں کچھ دیر ایک درخت کی ادٹ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ خدا کا شکر ہوا۔ کہ طوطا اس کے بعد بالکل نہیں بولا۔ اب بھی خاموش ہو گیا۔ پھر میں درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا اس ٹیلے کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں سے میں نے دور بین کے ساتھ پہلی بار آدم خور وحشیوں کو دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ اگر آدم خور اس جزیرے پر حملے کے لئے اترے ہیں تو ان کی کشتی ضرور سمندر کے کنارے کھڑی ہوگی۔ جو مجھے اندھیری رات میں بھی نظر آ جائے گی۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ بھونک بھونک کر قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اس دشا دی سے چل رہا تھا کہ میرے قدموں کی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ چلتے چلتے میں ٹیلے آ گیا۔ دور بین کا رات کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں جھانک کر سمندر کی طرف دیکھا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک کشتی واقعی دور کنارے پر کھڑی تھی۔ فرائی ڈے کا انداز رست تھا۔ دشمن ہمارے جزیرے پر اتر چکا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ظاہر ہے اس کشتی میں چار انچ آدم خور ضرور آئے ہوں گے۔ اب میں تیزی سے واپس مڑا اور جھاڑیوں اور درختوں کی وٹ میں پھپھتا پھپھاتا واپس اپنے کہیں کی طرف چل پڑا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آدم خوروں نے میری عدم موجودگی میں کہیں پر حملہ نہ کر دیا ہو۔ اگر فرائی ڈے کے پاس پستول اور تیر کمان بھی تھا لیکن وہ اکیلا چار پانچ آدم خور وحشیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ٹھیک اس وقت کہیں کی طرف سے فرائی ڈے کے پستول چلانے کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔ درختوں پر پرندوں نے شور مچا دیا۔ میں کہیں کی طرف بھاگنے لگا۔ اب مجھے آدم خور وحشیوں کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں بھاگ کر کہیں کے پاس آیا اور ایک بڑے سے درخت کے تنے کے پیچھے ہو کر چھپ گیا اور دیکھنے لگا کہ آدم خور کہاں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ دو آدم خور کہیں کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فرائی ڈے دیوار کی سوراخ میں سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پستول کا فائر داغ دیتا تھا۔ دو ٹنگ دھڑنگ آدم خور کہیں پر تیروں کی بارش کر رہے تھے میں نے درخت کے پیچھے کھڑے کھڑے بندوق سے ایک آدم خور کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ گولی چلی اور وہ آدم خور چیخ مار مار کر اچھلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے دوسری گولی بھی چلا دی۔ یہ گولی دوسرے آدم خور کو لگی اور وہ لنگھتا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔ اب فرائی ڈے بھی شیر ہو گیا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں مقابلے پر آچکا ہوں اس نے بھی اندر سے دھڑا دھڑا پستول کے فائر کرنا شروع کر دیئے۔ اگرچہ اس کی ایک بھی گولی نشانہ پر نہیں لگ رہی تھی۔ تاہم پستول کے دھماکوں نے آدم خور وحشیوں کو بکھلا دیا اور وہ بھاگ گئے۔

میری بندوق میں اب بارود نہیں تھا۔ لہذا میں اب کوئی فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اس

وہ فرائی ڈے کو ہر قیمت پر ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ شاید انہوں نے ایک آدمی کو جزیرے سے لے چھوڑ دیا تھا کہ جب ہم مطمئن ہو کر کہیں سے باہر نکلیں تو اپنی جان پر کھیل کر فرائی ڈے کی کر دیا جائے۔

میں نے اوپر درختوں کا جائزہ لیا۔ اب دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ گھنٹی شاخوں پھیا ہوا آدم خور مشکل ہی سے نظر آ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ننگے ہوتے ہیں۔ اور ان کے جسم کا رنگ ی مائل سیاہ ہوتا ہے۔ جو شاخوں کے پتوں کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔ پھر بھی اندازے کے مطابق درخت کی طرف سے تیر آیا تھا۔ میں نے اس طرف بندوق کا فائر داغ دیا۔ فرائی ڈے نے بھی دل چلا دی۔ ہم کم از کم دشمن کی گولیوں سے دھماکوں سے خوف زدہ ضرور کرنا چاہتے تھے ہم ایک درخت کی اوٹ میں چھپے رہے۔ میری پیٹھ فرائی ڈے کی طرف تھی اور فرائی ڈے نے راپشت میرے ساتھ لگا رکھی تھی۔ ہم نے پستول اور بندوق ایک اور فائر داغ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی ہوا میں ایک فائر کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سارے جنگل کے پرندوں کو بیدار کر دیا۔ وہ شور مچاتے آسمان کی طرف رواں کر گئے۔

پھر ہم نے بڑی جوشی سے چل پھر کر دشمن کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ فرائی ڈے نے اشاروں میں مجھے بتایا کہ ان کے قبیلے میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جنہیں جاننا زکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی جان قبیلے کی آن پر نچھا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ آدم خور وحشی جلتے جاتے پیچھے اپنے قبیلے کے ایک جاننا زکو چھوڑ گئے تھے۔ اس آدم خور جاننا ز کا کام یہ تھا کہ اپنی جان پر کھیل کر کسی طرح سے فرائی ڈے کو قتل کر دے۔ یہ شخص سر پر کفن باندھ کر آیا تھا۔ اسے تو اپنی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ پس اس سے اپنی جان کا بچاؤ بہت ضروری بھی تھا۔ اور ہوشیاری بھی چاہتا تھا۔ اب آدم خور جاننا ز کو ہلاک کرنا ہمارے لئے بھی ضروری ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ بالکل کسی وقت بھی نئے آکر فرائی ڈے سے پر یا مجھ پر تیر چلا سکتا تھا۔

ہم نے لک چھپ کر جزیرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر یہ دروازہ آدم خور ہمیں کہیں نظر نہ ظاہر ہے۔ وہ اسی جزیرے میں کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور موقع کا انتظار کر رہا تھا

لے واپس کہیں میں جانے کو بے تاب تھا۔ پھر ضرور میرے ہاتھ تھا۔ مگر آدم خور وحشیوں کے تیروں کے آگے یہ پھر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے۔ تو میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔ فرائی ڈے نے کہیں کی دیوار کے ایک طرف رسی کی سیڑھی لٹکادی۔ میں بھاگ کر سیڑھی سمیٹ کر اندر پھینک دی۔ فرائی ڈے کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اور اس کا چہرہ پسینے میں سرلا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی بندوق میں بارود بھرا اور دیوار کی سوراخ میں اس کی نالی رکھ کر دوسرا سوراخ میں سے باہر کے حالات کا جائزہ لینے لگا۔

آدم خور اپنے ساتھی کی لاش گھسیٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔ باہر کل خاموشی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ دشمن پسپا ہو کر بھاگ چکا تھا۔ پھر بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ کس طرف سے کوئی تیر آجائے یا کوئی آدم خور درخت کے اوپر چڑھ کر کہیں کے اندر چھلانگ لگا دے۔ اگرچہ میں نے ٹھیک کہیں کے اوپر سے درخت کی شاخوں کو کاٹ تراش دیا تھا۔ ہم کتنی دیر تک اپنے اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے لیکن کوئی آدم خور وحشی پھر نہ آیا۔ اب رات ڈھلنی شروع ہو گئی تھی۔ آسمان پر صبح کی آمد آمد کی نیلی روڈ نے نمودار ہونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے فرائی ڈے سے اشاروں میں کہا کہ وہ سو جائے میں پہرہ دوں گا۔ فرائی ڈے نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ میں آرام کروں۔ مگر وہ آرام کا وقت نہیں تھا کیونکہ دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ کہ وہ کہیں پاس ہی چھپا ہوا ہو اور ہمیں غافل پا کر پھر سے حملہ کر دے۔

جب مشرق میں صبح کا اجالا پھیلنے لگا تو میں نے فرائی ڈے کو کہیں میں رہنے کے لئے کہا اور وہ کہیں سے باہر آکر پیچھے سے ہو کر ٹیلے پر آگیا۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ دن کی روشنی سمندر کے کنارے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں آدم خوروں کی کوئی کشتی نہ تھی۔ دشمن واپس بھاگ گیا تھا میں جلدی جلدی اپنے کہیں میں واپس آیا اور فرائی ڈے کو آواز دے کر بتایا کہ آدم خور جا چکے ہیں وہ بھی کہیں سے باہر آگیا۔ ہم خوش خوش ساحل سمندر کی طرف چلے ہی تھے۔ کہ اچانک ایک طرف سے سن کر کے ایک تیر آیا اور فرائی ڈے کی گردن کے بالکل قریب سے نکل کر ایک درخت میں گڑ گیا۔ ہم بھاگ کر ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو گئے۔ دشمن کا کوئی آدمی وہاں موجود تھا۔ تاکہ چھپ کر حملہ کر سکے۔ یہ تیر ایک درخت کی کمر سے آیا تھا۔ اور نشانہ فرائی ڈے کی گردن

یا پھر وہ ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے فرائی ڈسے سے کہا۔

”فرائی ڈسے..... واپس کہیں میں چلو۔“

میں نے یہی فیصلہ کیا کہ فرائی ڈسے کو کہیں سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ کیونکہ بنیادی طور پر آدم خور فرائی ڈسے کو یہی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ میرے تو وہ اس لئے دشمن ہو گئے تھے کہ میں نے فرائی ڈسے کو پناہ دی تھی اور ان کے کچھ لوگوں کو اپنی بندوق سے مار ڈالا تھا۔ وہ میرے مجبور کرنا پر کہیں کے اندر چلا گیا۔ میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ آدم خور وحشی کی تلاش شروع کر دی۔ میں بھاڑا اور درختوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اگر اس جزیرے کے جیسے جیسے واقف تھا تو وہ آدم خور وحشی بھی جنگل کا باشندہ تھا۔ اس کے لئے درختوں یا بھاڑیوں میں بندر کی طرح چڑھنا اور چڑھ کر چھپ جانا کوئی مشکل اور وقت طلب کام نہیں تھا۔ میں جزیرے کے مشرقی ساحل کی طرف نکل آیا۔ میری آنکھیں ادھر ادھر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں ذرا دیر سی آہٹ سن رہا تھا۔ اور معمولی سی آہٹ پر ہوشیار ہو جاتا تھا۔

یہ ایک ایک تیر سن کر کے میرے بازو کے بالکل قریب سے گزر کر سامنے ایک پتھر کو جاڑ میں جلدی سے زمین پر بیٹھا اور کسی جنگلی بے کی طرح گھٹنوں کے بل دوڑتا ہوا ایک چٹان کے عقد میں چھپ گیا۔ میں نے بے سوچے سمجھے جس طرف سے تیر آیا تھا ادھر بندوق کا فائر داغ دیا۔ اس نتیجہ کو نہ نکلا۔ کیونکہ خدا جانے وہ جنگلی وحشی کہاں اور کس درخت کی گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور کیا خبر وہ میری ساری نقل و حرکت کی نگرانی بھی کر رہا ہو۔ میں ابھی دوسری بار بندھا چلنے کے لئے اس میں بارود بھر رہی رہا تھا کہ ایک اور تیر میرے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے ٹکرا کر دور جاگرا۔ میں نے فوراً دوسرا فائر بھی بھونک دیا۔ اس فائر کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ گولی درخت میں جھپے ہوئے وحشی کو لگتی اور وہ ایک ہی جھج کے ساتھ زمین گر پڑتا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ میرے فائر کے دھماکے سے صرف درختوں کے پرندے شور مچا۔ ہوئے اڑ گئے۔ مجھے ایک ڈر تھا کہ کہیں فرائی ڈسے میرے فائروں کی آواز سن کر کہیں سے باہر نہ نکل آئے۔ اس کا باہر آنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

میں تیسری بار بندوق میں بارود بھر کر حملے کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ اچانک آدم خور وحشی کی خوفناک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور پھر کسی شے کے درخت سے دھم کے ساتھ گرنے کی آواز میں جلدی سے بھاگ کر وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آدم خور وحشی کی گردن میں ایک تیر مت ہے اور اس کے خون سے زمین لالہ زار ہو رہی ہے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ تیسرے آدم خور وحشی کے پیچھے سے فرائی ڈسے مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ اس کا کارنامہ تھا۔ یہ پہلے فائر کی آواز سن کر وہ اپنے آپ کو کہیں کے اندر قید نہ رکھ سکا اور سیڑھی لگا کر باہر آ گیا اور پستول کی بجائے کمان پر تیر چڑھا کر وحشی کی تلاش شروع کر دی۔ وہ آدم خور وحشی کی چالاکیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس جگہ چھپ کر حملہ کر سکتا ہے۔ پھر اس کی جیتے ایسی تیز آنکھوں نے ایک درخت کی شاخوں میں وحشے کو چھپے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کی تیر فرائی ڈسے نے سن سے تیر چلا دیا۔ فرائی ڈسے کا تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاسکتا تھا۔ آدم خور وحشی زمین پر پڑا تو پ رہا تھا کہ فرائی ڈسے نے اپنے لنگوٹ کے ساتھ اڑسا ہوا تو کمال کمزیرے دیکھتے دیکھتے بڑی بے دردی سے اس کا پیٹ چاک کر دیا اور پھر اس کا کلیجہ کال کر اسے چبانے لگا۔ میں نے کراہت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں فرائی ڈسے کو اس انتقامی کارروائی سے نہ روک سکوں گا۔ کیونکہ یہ وہ آدم خور وحشی تھا۔ جس کے ماتھیوں نے اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کر کے بھون کر کھالیا تھا۔ فرائی ڈسے کے ہاتھ اور منہ خون آلود تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر ادب سے جھکا اور انگریزی کے دو لفظوں میں صرف اتنا کہا۔

”ماسٹر! اینی می ماسٹر! مائی ماما! اکل ماسٹر!.....“

میں سمجھ گیا وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے آدم خور کا کلیجہ چاک کر وحشیوں کی قدیم رسومات اور روایات کے مطابق اس سے اپنے خاندان کے قتل عام کا بدلہ لیا تھا۔ ہم نے وحشی کی لاش کو گڑھا کھود کر دبا دیا تاکہ جنگل میں بدلہ نہ پھیلے۔ اب ہم بے فکر ہو گئے تھے۔ کہیں میں واپس آنے سے پہلے فرائی ڈسے اور میں، ہم دونوں سمندر کے کنارے گئے۔ وہاں جا کر پانی میں جی بھر غسل کیا اور واپس آ گئے۔ سمندر پر کوئی کشتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

خوب چپک رہی تھی۔ فضا میں سردی ختم ہو رہی تھی۔ دھوپ بڑی بھلی لگتی تھی۔ سمندر کا
لہنے دھنستوں سے اٹا پڑا تھا۔ ان درختوں پر سرخ اور نیلے رنگ کے پھولوں والی بے شمار
پڑھی ہوئی تھیں ان پھولوں کی ہلکے دل کو بڑی اچھی لگتی تھی۔

میں واپسی پر اپنی روز کی عادت کے مطابق پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر گیا اور درمیان لگا
سمندر کی طرف دیکھنے لگا کہ شاید کوئی جہاز دکھائی دیے جائے۔ مگر میں برس سے مجھے کوئی جہاز
دکھائی نہیں دیا تھا۔ میری آنکھیں دور سے جہاز کے بھولے ہوئے باد بانوں کو دیکھنے کو تر
لگی تھی سمندر کا سینہ دھوپ میں حد نظر تک ویران تھا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں دور دور سے ا
کر سمندر میں نکلے ہوئی ان چٹانوں سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی تھیں۔ جنہوں نے میرے جہاز کو میں
بائیں برس پہلے دو ٹکڑے کر کے سمندر میں ڈبو دیا تھا۔ یہ چٹانیں میری تباہی کی نشانی بن کر ہر
میرا منہ بڑایا کرتی تھیں۔ میں ناامیدی سے سر جھکائے واپس کہیں میں آگیا۔ فرائی ڈے نے ناظر
تیار کر رکھا تھا ناشتا کیا تھا۔ بس پھیکا دلیر خشک انگور اور پتھر پر پکائی ہوئی موٹی روٹی کے
ٹکڑے کھائے۔ ناشتا کرتے ہوئے میں نے فرائی ڈے سے اشاروں اور ٹوٹے بھوٹے الفاظ میں پوچھا
کہ اس کا دشمنوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ وہ دوبارہ جزیرے پر حملہ
کریں گے؟

فرائی ڈے نے بھی ٹوٹے بھوٹے لفظوں اور اشاروں میں بتایا کہ جب تک اس آدم خور
وحشی قبیلے کا ایک فرد بھی زندہ ہے، وہ مجھ سے انتقام لینے ضرور آتا رہے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا
کہ اب اس جزیرے پر ہماری زندگی ایک مسلسل خطرے میں تھی۔ ہمیں ہر وقت چوکس رہنے کی
ضرورت تھی۔ اس خطرے کے احساس نے میرے اندر زندگی کا ایک بھرپور جذبہ پیدا کر دیا۔
مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی مقصد کے لئے زندہ ہوں۔ اور کچھ نہیں تو دشمن سے مقابلہ کرنے کے
لئے ہی ہوں۔ ناشتے کے بعد میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ وہ خشک انگوروں کو خوشوں سے اچھی
طرح توڑ کر لکڑی کے کبس میں جمع کرے اور میں کشتی میں بیٹھ کر جزیرے کے ساحل کی گشت کے لئے
باہر آگیا۔ میری کشتی ایک طرف سمندر میں چٹان کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ میں اس میں سوار
ہو گیا اور چوچو چلاتا اسے لے کر جزیرے کے ساحل کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ جزیرے کی گشت
بھی میرے روز کے معمولات میں سے تھی۔ میں مغربی کنارے سے نکل کر جزیرے کے مشرقی کنارے
پر آگیا جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ یہ جزیرہ اتنا بڑا جزیرہ نہیں تھا۔ میں بڑے مزے سے چو
چلاتا کنارے کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان صاف تھا۔ اور

میں بڑی نرم روی سے کشتی چلاتا جا رہا تھا کہ میری کشتی کو ایک دھچکا لگا۔ دھچکا
نہایت تھک۔ کہ میں گرتے گرتے بچا کشتی گھوم گئی۔ میں بھونچکا رہ گیا کہ یا خدا یہ کیا نئی مصیبت
میں ابھی منہ بھلا ہی تھا۔ کہ کیا دیکھتا ہوں کہ کشتی کے نیچے سے ایک شارک مچھلی کا باہر
اٹھوا بلید سمندر کی لہروں میں ایک طرف کو جا رہا ہے۔ تو گویا یہ بلائے ناگہانی شارک
اس سمندر میں پہلے بھی میں نے بڑی بڑی شارک مچھلیاں دیکھی تھیں۔ مگر یہ ان سب
بڑی تھی۔ شارک عام طور پر میری کشتی کے قریب سے ہو کر گزر جایا کرتی تھیں۔ لیکن اس
نملہ کر دیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی آدم خور شارک تھی۔ جس کو انسان کے خون کی چاٹ
ن تھی۔ اور جو انسان کے جسم کی بومیوں سے محسوس کر لیتی تھی۔ شارک کے آگے جا کر مڑی
بڑی تیزی سے کشتی پر حملہ کرنے کے لئے کشتی کی طرف آئی۔ میں ہوشیار ہو گیا تھا۔ میرے پاس
ری ہوئی بندوق تیار تھی۔ میں نے شارک کے سر کا نشانہ باندھ لیا۔ شارک کے سر کا بلیڈ
ہر نکلا ہوا تھا جو نہی اس کا سر کشتی کے قریب آیا۔ میں نے گولی داغ دی۔ دھماکہ ہوا اور
مارک اچھل کر سمندر میں اتر گئی۔ میں نے سوچا کہ گولی ٹھیک نشانے پر لگی اور شارک مڑ گئی۔
لیکن وہ مری نہیں تھی، شدید زخمی ہوئی تھی۔ اس نے آخری بار کشتی کو اس زور کی ٹکرماری
کر کشتی سمندر میں الٹ گئی اور پانی میں گر پڑا۔ خدا کا شکر تھا کہ شدید زخمی ہونے کی وجہ سے
شارک میں اب اتنی ہمت نہیں رہی تھی۔ کہ حملہ کر کے میرے جسم کو دو ٹکڑے کر سکتی۔ میں سمندر
میں تیرنے لگا۔ شارک سمندر کی تہ میں نہ جانے کدھر گم ہو گئی تھی۔ میں تیرتے تیرتے کشتی تک
پہنچا۔ اسے اپنی طرف کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا۔

کنارے پر لا کر میں نے اسے بڑی مشکل سے سیدھا کیا۔ اس پر سوار ہوا اور دوبارہ کنارے
کی گشت لگاتا واپس اپنے کنارے والی چٹانوں کے پاس آگیا۔ فرائی ڈے نے میری بندوق
چلنے کی آواز سن لی تھی اور کہیں سے باہر نکل کر چھادیوں میں چھپا سمندر کی طرف تشویش بھری

نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں اسے نظر آیا تو وہ بھاگتا ہوا میرے پاس پہنچا۔

”ماسٹر! ماسٹر!“

میں نے اسے بتایا کہ سمندر میں ایک شکار نے حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس پر گولا چلائی تھی۔ اس کی جان میں جان آئی اور اس نے جلدی سے کشتی کنارے پر کھیچ کر چٹان کے ساتھ باندھ دی۔ کپتن میں آکر میں نے بندوق صاف کر کے رکھ دی۔ اب میرے پاس بارود صاف کر کے رکھ دی۔ اب میرے پاس بارود کی صرف دو تھیلیاں رہ گئی تھیں۔ چونکہ مجھے آدم خور وحشیوں کے حملے کا ڈر تھا، اس لئے میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ ہم آئندہ سے بندوق اور پستول استعمال نہیں کریں گے۔ اس کی جگہ ہم تیر کمان سے کام لیں گے چنانچہ ہم نے ایک درخت کو کلبھاڑے سے گرا دیا اور اس کی شاخوں سے تیر کمان بنانے لگے۔ دو دن کی محنت کے بعد ہم نے ہزاروں تیر بنائے۔ یہ تیر اس قدر نوکیلے تھے کہ ہاتھ کے جسم سے بھی پار ہو سکتے تھے۔ ان تیروں کو فرائی ڈے نے اپنے خاص انداز میں بنایا تھا۔ اور وہ لوہے کی انی والے تیروں سے زیادہ تھلک ہو گئے تھے۔ اب ہم دن کو جنگل میں گھوم کر بڑے مزے سے اڑتی مرغابیوں اور پرندوں کا شکار کرتے۔ ہفتے میں دو ایک بار کوئی نہ کوئی جنگلی بکری ہاتھ لگ جاتی۔ کسی روز سمندر میں کانٹا ڈال کر اکثر لوں میں بیٹ جاتا اور ٹھنڈی کاشکار کرتا۔۔۔۔۔ اسی طرح تین ہفتے گزر گئے۔ آدم خور وحشیوں نے پھر کوئی حملہ نہ کیا تھا۔ فرائی ڈے کا خیال تھا کہ وہ لوگ اسے ہرگز نہیں بھولے اور ضرور حملہ کریں گے میرا خیال تھا کہ وہ میری بندوق کے دھماکوں سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ اور اب کبھی ادھر کا رخ نہ کریں گے۔

ایک روز بڑا اندھنناک حادثہ ہوا۔

میں صبح کے وقت عادت کے مطابق پہاڑی کی چوٹی پر دور بین لئے کھڑا سمندر میں دیکھ رہا تھا۔ کہ میں نے جو کچھ دیکھا اس پر مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے دور بین آنکھوں سے ہٹا کر زور زور سے آنکھیں ملیں اور پھر سے دیکھا۔ دور بین سے میری آنکھوں کے سامنے سے ایک سفید رنگ کا بادبانی جہاز گذر رہا تھا۔ غشی سے میرا دل سینے سے

رہا ہر کوئی نہ لگا۔ میں نے دور بین ہٹا کر زور زور سے اچھل اچھل کر چلانا شروع کر دیا۔

”مدد! مدد! مدد!“

میری آواز سن کر فرائی ڈے بھی بھاگتا ہوا آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ جہاز ہے۔ ہلک جلاؤ۔ ہلک دیوں کا ایک گٹھا خشک جھاڑیوں سمیت وہاں اس وقت کے لئے تیار رکھا تھا۔ اسی ہلک جلا کر دھواں کر دیا گیا۔ میں نے اپنی بکری کی کھال کی جیکٹ اتار دی۔ اور اس سے زور سے ہوا دیتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں اڑانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے یل عرصے بعد جو یہ جہاز ادھر آیا ہے۔ تو وہ ضرور دھواں اٹھتا دیکھ کر جزیرے کی طرف لے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں نے دوبارہ دور بین لگا کر دیکھا تو جہاز دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے میری پہاڑی کے دھوئیں کو نہیں دیکھا تھا یا اگر دیکھا بھی تھا تو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اچھل اچھل کر جہاز والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن ازوالوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جزیرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ میں نے دور بین لگا کر دیکھا تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ جہاز سمندر کی لہروں سے اوٹ میں گم ہوتے ہوئے نگاہوں سے چھل ہو رہا تھا۔ اور پھر وہ غائب ہو گیا۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بائیس برس کے بعد زندگی میں آزادی اور رقیہ سے رہائی کی ایک ہلکی سی امید کی کرن چمکی تھی۔ اور وہ بھی بجھ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خدا نے میری قسمت میں اس سنگ دل جزیرے کی عمر قید لکھ دی ہے۔ میری تقدیر میں ہی یہ لکھا ہے کہ میں ساری باقی عمر اسی جزیرے پر بسر کروں اور میری قبر اسی اجاڑ گنم جزیرے پر رہے۔ میں پہاڑی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے گھٹنوں میں سر دے لیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ فرائی ڈے بہت پریشان ہو گیا۔ وہ بھی زمین پر ایک طرف بیٹھ کر رونے لگا۔ لیکن میں نے میرا کتا بھاگتا ہوا میرے پاس آگیا تھا۔ اور وہ میری گردن پر پیار کر رہا تھا۔ میرا پالتو بھائی میرے کندھے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اور بار بار مٹیں مٹیں کر رہا تھا۔ جیسے کہہ کر رہا ہو۔ کہ مالک ہمت نہ ہارو۔ حوصلہ کرو۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ ایک نہ ایک روز ضرور کوئی ایسا سبب پیدا کر دے گا کہ تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس جہنم سے نجات مل جائے

گی۔

..... میں نے تعجب سے فرائی ڈے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا بادل آگئے ہوئے ہیں؟“

”YES! ماسٹر! YES“

فرائی ڈے نے آکر بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے آنسوؤں سے بھرا ہوا ہلکے اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

”ماسٹر! ماسٹر!“

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ میرا کتا بھی میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ طوطا میری گردن پر بیٹھا بار بار اپنی گردن گھما رہا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ جیکٹ کی آستینوں سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھیں اور اٹھ کر سر جھکائے پھاڑے سے نیچے اترنے لگا۔ منزل مجھ سے دو قدم دور رہ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ایک عمر گزر گئی تھی۔ مجھے اس جنمی جزیرے پر انیس برس کا لڑکا تھا۔ کہ اس جزیرے پر آیا تھا۔ اب پچیس پچیس برس کا ہو گیا۔ بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ کبھی کسی بادبانی جہاز نے ادھر کا رخ نہ کیا تھا آج ایک طویل مدت گزر جانے پر جہاز نظر بھی آیا تو وہ بے رخی سے منہ موڑ کر چل دیا۔ میرے خدا! ابھی میری قسمت میں اور کتنی مصیبتیں برداشت کرنی لکھی ہیں؟

وہ رات میں نے تھوڑی تھوڑی دیر روتے گزار دی۔ میری آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آجالتے تھے۔ مجھے اپنے باپ کا خیال آجاتا تھا۔ اس کی شکل آنکھوں میں گھومنے لگتی۔ وہ اگر زندہ ہوا تو بہت بوڑھا ہو گیا ہوگا۔ اگر میں اس حلیے میں اس کے سامنے چلا جاؤں تو وہ مجھے کبھی نہ پہچان سکے۔ شاید اب میں بھی اسے نہ پہچان سکوں۔ وقت نے ہمارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی تھی۔ خدا جانے مجھے میری کس خطا کی اتنی شدید سزا مل رہی تھی۔ رات میں بالکل نہ سکا۔ صبح اٹھ کر میں سمندر کی گشت پر بھی نہ جاسکا اور کہیں میں ہی پڑا رہا۔ بے چارہ فرائی ڈے بھی میرے ساتھ پریشان تھا۔ لیکن میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ پریشان نہ ہو اور باہر جا کر کھیت میں اپنا کام کرے۔ وہ بادل نخواستہ باہر چلا گیا اور میں تخت پوش پر لیٹ کر سو گیا۔

میں شام تک سویا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ فرائی ڈے نے آگ جلا رکھی تھی اور اس پر بیکری کے سوکھے گوشت کے ٹکڑے بھون رہا تھا۔ ایک دم سے بجلی چمکی اور بال

وہ خوش ہو کر بولا۔ اب میرے دل سے کلی کے دردناک حادثے کا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ مجھے صبر آگیا تھا۔ فضا میں خشکی ہونے لگی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں لے لگی تھیں۔ میرا طوطا زور زور سے بول رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے بنجر سے بند کر دیا۔ کم بخت بول شور چلا رہے ہو؟ کتا فضا میں کسی شے کی جیسے بوسونگھ کر اچھل کود مچا رہا تھا۔ میں نے اس کو بھی سزائے کی۔ بے چارہ مالک کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر خاموش ہو گیا۔ بجلی ایک بار پھر چمکی اور بادل پہلے سے بھی زوردار کڑا کے کے ساتھ گر جا۔۔۔ پھر ایک دم سے بارش شروع ہو گئی۔۔۔

رائی ڈے نے لکڑی کی دیوار کے سوراخ سے باہر دیکھ کر کہا۔

”ماسٹر! ہوا بڑی تیز ہے۔“

یہ جلد اس نے ٹوٹے پھوٹے دو تین لفظوں میں ادا کیا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ فکر نہ کرے۔ ایسی تیز ہوائیں جلا ہی کرتی ہیں۔ بارش بڑے زور سے شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کی ترچھی بوجھاؤ کہیں کی لکڑی کی دیواروں پر بڑے شور کے ساتھ پڑ رہی تھی۔ کہیں کی چھت ہم نے درخت کی موٹی شاخیں ڈال کر اوپر لکڑی کے تختے جڑ کر بنائی تھی۔ اس پر بھی بارش کا شور اٹھ رہا تھا۔ ہم اس قسم کے شور کے عادی ہو گئے تھے۔ اور یہ شور نہ ہمیں پریشان کرتا تھا اور نہ ہماری باتوں میں حارج ہوتا تھا۔ ہم ویسے بھی زبان سے بہت ہی کم باتیں کرتے تھے۔ زیادہ گفتگو اشاروں کی نالیوں میں ہوتی تھی۔

جوں جوں رات آ رہی تھی۔ ہوا کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب سمندر کی طرف سے شہیدہ سر موجوں کا چٹانوں سے ٹکرنے کا شور بھی آ رہا تھا۔ فرائی ڈے نے لکڑی کی پلیٹ میں بکری کے گوشت کے بھنے ہوئے قتلے ڈال کر میرے آگے رکھے۔ میں نے دو تین قتلے کھائے اور اپنے گھٹنے پر بکری کی چربی کا تیل ملنے لگا۔ میرے گھٹنے کو اس وقت چوٹ لگ گئی تھی جب کشتی کو شاکر مچھلی نے ٹکرا دیا تھا۔ فرائی ڈے نے آگ کے آگے پتھر کی سل رکھ دی کیونکہ کہیں

کا تھا۔ تاہم اس طوفان کے تیور کچھ بگڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے وہ تمام چیزیں
ن کے بھیگے کا خطرہ تھا۔ چٹان کی کھوہ کے اندر چھپا دی تھیں رات کافی گزر گئی تھی۔ سمندر
ونان ایک ہی رفتار سے چل رہا تھا۔ درخت جھوم رہے تھے تیز بارش کی بوچھاڑیں پھٹت اور
یواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ بجلی رہ رہ کر کوند رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے
مندر کی طرف سے پھری ہوئی لہروں کا چٹانوں سے ٹکرنے کا ہیبت ناک شور بلند ہو رہا
نھا۔ نیند ہم میں سے کسی کو نہیں آرہی تھی۔

فرانی ڈے نے مجھے کہا۔

”ماسٹر! سو جاؤ! میں پہرہ دیتا ہوں۔“

مگر میں نے کہا۔

”نہیں فرانی ڈے۔ مجھے نیند نہیں ہے۔“

آدھی رات کو طوفان کا زور کم ہو گیا۔ فرانی ڈے گہری نیند سوچ چکا تھا اور ہلکے ہلکے
خراٹے لے رہا تھا۔ میں بھی اب اونگھنے لگا تھا۔ پھر مجھے بھی نیند آگئی اور میں سو گیا۔ میری
آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ صبح کی دھندلی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کیونکہ
آسمان ابھی تک بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن بارش اور مہاوؤں کا شور تھم چکا تھا۔
میں نے فرانی ڈے کو جگایا۔

”اٹھو! طوفان گزر گیا۔“

فرانی ڈے نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر غوش ہو کر بولا۔

”گڈ مازنگ“

یہ صبح شام کی سلام میں نے فرانی ڈے کو سکھا رکھی تھی۔ وہ ناشتہ تیار کرنے لگا اور
میں کین سے باہر نکال آیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ رات کے طوفان نے جزیرے پر کیا تباہی
جائی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی درخت ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ سمندر میں سے لاتعداد سیب اور
گھونگے ریت پر بکھرے پڑے تھے۔ چٹانوں کے پاس میں نے دو تین شارک مچھلیوں کو دیکھا
جو ریت پر مردہ پڑی تھیں۔ رات کا طوفان کافی زبردنت تھا۔ اس نے سارے جزیرے

کے اندر تیز ہوا کے جھونکے شعلوں کو پریشان کر رہے تھے۔ اور آگ لگ جانے کا خطرہ تھا۔
مہاوؤں نے کین سے باہر تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ گھنے درخت زور زور سے آواز پیدا
کر کے جھول رہے تھے۔ بادل یوں گرج رہے تھے۔ جیسے ابھی آسمان پھٹ پڑے گا۔ بجلی چمکتی تو رات
جزیرے پر ایک پل کے لئے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی ہو جاتی۔ بارش کے قطرے ایک ایک
کی طرح گر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کین کی چھت ٹپکنے لگی۔ فرانی ڈے نے لکڑی کی ایک کھپٹی
اٹھائی۔ اور اسے اندر سے چھت کے سوراخ کے اوپر جا کر جڑ دیا۔

اس سے ٹپکا تو بند ہو گیا۔ مگر اب نئی مصیبت پیدا ہو گئی۔ ہوائے طوفان کی شکل اختیار
کرتی تھی اور وہ ہمارے کین کو تھپہڑے مار رہی تھی۔ چونکہ میرا کین ایک طرف سے چٹان کے
سوراخ میں پھنسا ہوا تھا، اس لئے اس کے ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مگر یہ اندیشہ ضرور تھا
کہ وہ ہوائیں اڑنے جلنے۔ کیونکہ زمین میں اس کی دیواروں کی بنیاد زیادہ گہری نہیں تھی۔ ابھی میں
یہ سوچ رہا تھا۔ کہ طوفان کے ایک زوردار جھکڑے دیوار کی لکڑی اوپر اٹھی۔ ہم نے اٹھ کر اسی وقت
دیوار کے ساتھ تخت پوش کو درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کو یوں لگا دیا کہ سارا زور ان پر ہی
پڑے۔ طوفان بڑے زور کا تھا۔ مہاوؤں اور بارش نے سارے جزیرے کو ہلا کر رکھ دیا تھا سمندر
کی بھری ہوئی موجیں ساحل کے اندر تک گھس آئی تھی۔ اور کئی درختوں کو انہوں نے جڑوں
سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔

ہمیں یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں ہمارے اوپر والا گھنا درخت کین کی چھت پر ٹوٹ کر گر
پڑے کیونکہ ایسی صورت میں کین کا پاش پاش ہو جانا یقینی تھا۔ پھر ہماری زندگیوں کو بھی خطرہ تھا۔ فرانی
ڈے نے میرے حکم پر آگ بھجادی۔ میں نے میٹرھی کی مدد سے دیوار کے اوپر چڑھ کر درخت کو
دیکھا۔ وہ کسی یا گل آدمی کی طرح زور زور سے تیز ہوا میں جھول رہا تھا۔ درخت کافی بڑا
اور مضبوط تھا۔ اس لئے میرے خیال کے مطابق اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ کچھ کم ہی تھا۔ اس وقت
کوئی تدبیر بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اب تو ہم صرف خدا کے رحم و کرم پر تھے۔ اگر درخت ٹوٹ
کر کین کی چھت پر گر گئی پڑتا۔ تو ہم اسے روک نہیں سکتے تھے۔ میں اس لئے بھی زیادہ نہیں
گھبرا رہا تھا۔ کہ اس قسم کے سمندری طوفان میں اس جزیرے پر جب سے آیا تھا۔ بہت دیکھ

» ماسٹر! ہمارا قبیلہ ایک پرانا آدم خور قبیلہ ہے۔ ہم لوگ باہر سے آنے والے کسی انسانی کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ گوری چڑی والے کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں ایک بار کوئی جہاز طوفان میں راستہ بھول کر ہمارے جزیرے پر آگیا۔ میں ان دنوں چھوٹا تھا۔ ہمارے قبیلے والوں نے جہاز کے سارے غلے کو بکڑ لیا۔ پھر ایک آدمی کو روزانہ قتل کر کے آگ پر بھون کر کھایا جاتا۔ اس طرح کوئی پندرہ بیس روز تک یہ تقریب جاری رہی۔«

میں نے فرائی ڈے سے پوچھا کہ کیا اس نے بھی کبھی کسی انسان کا گوشت کھایا ہے؟ اس نے کچھ مشرا کر کہا

» ماسٹر! میں نے ایک دو بار ہی انسان کا بھنا ہوا گوشت کھایا ہے۔ یا پھر اس روز اپنے دشمن کا کلیجہ چبایا تھا۔ لیکن شوق سے نہیں۔ بلکہ انتقام کے جوش میں۔ مجھے اور میرے باپ کو شروع ہی سے انسانی گوشت سے نفرت رہی ہے یہی وجہ تھی کہ قبیلے کے دوسرے لوگ میرے باپ کے دشمن بن گئے وہ انہیں سالوں کو قتل کر کے ان کا گوشت کھانے سے منع کرتا تھا۔ آدم خوروں نے دوسرے قبیلے کے سردار سے ساز باز کر کے میرے باپ کو قتل کر کے ہڑپ کر لیا اور مجھے گرفتار کر کے اس جزیرے پر بھون کر کھانے کے لئے لائے تھے کہ تم نے مجھے بچا لیا۔«

» وہ لوگ تمہیں اس جزیرے پر کیوں لائے تھے؟ «
فرائی ڈے کہنے لگا۔

» ہمارے قبیلے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو میرے باپ کے وفادار تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میرے باپ کو بھون کر کھایا جائے۔ لیکن باغی سردار ایسا کر گزارا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ مجھے بھون کھانے کی بجائے کسی کشتی میں بٹھا کر کھلے سمندر میں چھوڑ دیا جائے۔ باغی سردار یہ نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے خاص آدمیوں سے ساز باز کی کہ وہ مجھے ساتھ والے جزیرے میں سے جاکر بھون کر کھا جائیں اور قبیلے میں یہی

کو ایک بار تو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ واپس آیا تو فرائی ڈے نے ناشتا تیار کر رکھا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم نے کین کی ضروری مرمت شروع کر دی۔ دیوار دو تین جگہوں پر سے ہل گئی تھی۔ وہاں نئے مکڑی کے تھنے کاٹ کر پھنسا دیئے تھے۔ چھت پر چڑھ کر اس کی چھوٹی موٹی مڑت کی گئی۔ شام تک ہم یہی کام کرتے رہے۔ شام کا کھانا ہم نے کین کے اندر بیٹھ کر کھایا۔ اس کے بعدیں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں دور سمندر کو کتنے رنگا سمندر کی لہروں میں رات کے طوفان کے بعد اب سکون آگیا تھا۔ مونے کی ایک شاہراہ جزیرے سے ڈوبتے سورج تک پھیل گئی تھی۔

جس جہاز کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے میں چوٹی پر چڑھا کرتا تھا۔ وہ مجھے کہیں نظر آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کون سا بادبانی جہاز تھا۔ جو ایک روز پہلے مجھے دکھائی دیا تھا کیونکہ یہ جزیرہ کسی بھی سمندری تجارتی شاہراہ پر واقع نہیں تھا۔ ادھر سے کسی جہاز کے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی اس جزیرے کے ارد گرد سمندری بے شمار چٹانیں ابھری ہوئی تھیں جو جہاز کے لئے بے حد خطرناک تھیں۔ تو پھر وہ بادبانی جہاز کہاں سے آکر کدھر جا رہا تھا کیا وہ میرا وہم تو نہیں تھا؟ کیا میری تشنہ امیدوں نے ایک جہاز کو مجسم کر کے میری آنکھوں کے سامنے سمندر میں تولاکر کھڑا نہیں کر دیا تھا؟ ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا۔ کیونکہ ادھر کوئی جہاز کبھی نہیں آیا تھا۔ ساہا سال سے تو میں نے ادھر سے کسی جہاز کو گزرتے نہیں دیکھا تھا۔ میں بو بھل دل لئے واپس کین میں آگیا۔

تین برس مزید گزر گئے۔ اب مجھے اس جزیرے پر آئے ہوئے تیس برس ہو گئے تھے۔ میں اب لندن کے گلی کوچوں اور اپنے باپ کی شکل کو کچھ کچھ بھولتا جا رہا تھا۔ یہ شکلیں نکھول کے آگے مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ فرائی ڈے کو اب میں نے اتنی انگریزی سیکھا دی تھی۔ کہ وہ مجھ سے اپنا مطلب اور مفہوم بیان کر دیتا تھا۔ میں نے بھی اس کی وحشی زبان کچھ کچھ سیکھ لی تھی۔ اس کی زبانی مجھے اتنا معلوم ہو چکا تھا۔ کہ یہ جزیرہ ٹرینی دار کی خلیج اور نوکو میں واقع ہے۔ فرائی ڈے نے انگریزی زبان سیکھنے کے بعد مجھے بتایا کہ ان کے قبیلے کا جزیرہ وہاں سے تھوڑی دور رہی ہے۔

نکل آیا تھا۔ جس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی اور دور ہی سے گذر گیا۔
میں نے فرائی ڈے سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے جزیرے میں واپس جانا چاہتا ہے؟ اس نے
”سوچ کر سر جھکا لیا۔ پھر سراٹھا کر بولا۔

مشہور کر دیا جائے کہ مجھے کھلے سمندر میں جلا وطن کر دیا گیا ہے۔“
میں نے پوچھا۔

”تمہارا کوئی اور بھائی زندہ ہے؟“

”ہیں ماسٹر۔“ فرائی ڈے نے کہا۔ ”میرے سارے خاندان کو مار کر آدم خور وحشی ٹریپ
کر گئے ہیں۔ جزیرے پر سرداری کا اصل حق میرا ہے۔ مگر میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا
اگرچہ جزیرے پر میرے کچھ وفادار لوگ موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں
ہے۔“

میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ اگر ہمارے پاس بہت سی طاقت جمع ہو گئی تو فکر نہ کرو۔
ایک دن فوج لے کر تمہارے جزیرے پر حملہ کریں گے اور جزیرہ فتح کر کے تمہیں وہاں کا سردار بنا
دیں گے۔ فرائی ڈے زور سے ہنس پڑا۔

”ہیں ماسٹر! یہ خواب کی بات ہے۔ ایسا بھلا کہاں ہو سکتا ہے۔“

پھر وہ حیران ہو کر بولا۔ ”ماسٹر! تم بڑے بہادر ہو۔ تم نے زندگی کے تیس برس اس
ویران جزیرے پر بسر کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی تمہاری جگہ دوسرا ہوتا تو اپنے آپ کو سمندر
میں گرا کر ہلاک کر چکا ہوتا۔“
میں نے تمباکو کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

”فرائی ڈے! میرے بھائی! میں سمجھ گیا تھا۔ کہ اب باقی ساری زندگی اسی
جزیرے پر بسر ہوگی۔ کیونکہ ادھر کبھی کوئی جہاز نہیں آئے گا۔ اس فیصلے نے میرے
اندر زندگی کی آخری گھڑیوں تک زندہ سلامت رہنے کی طاقت پیدا کر دی
تھی۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے دل میں شمع اسیر روشن رکھی ہے۔ مجھے یقین تھا
ایک نہ ایک روز کوئی نہ کوئی باد بانی جہاز اس جزیرے کی طرف سے بھی گذرے گا
جو مجھ جلا وطن کو اٹھا کر واپس انگلستان لے جائے گا۔ مگر ایسا تو میرے وہم و
گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس جزیرے پر زندگی کے تیس برس گزر جائیں گے۔ اور
کوئی جہاز اس طرف سے نہیں گزرے گا۔ خدا جانے وہ باد بانی جہاز ادھر کیسے

”ماسٹر! اب میرا اس جزیرے پر کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ
بہن۔ سب مر کھپ گئے۔ دشمنوں نے انہیں ختم کر دیا۔ ہاں کچھ فسادار ساتھی ضرور
ہیں۔ مگر وہ بے اثر ہیں۔ ان کی کوئی آواز نہیں ہے۔ اب میں واپس جزیرے
میں جا کر کیا کروں گا؟ ہاں ایک جذبہ، ایک خیال دل میں ضرور ہے کہ اپنے دشمنوں
سے بدلہ لے سکوں۔ کسی روز ایک فوج لے کر وہاں جاؤں اور سردار کو قتل کر کے
اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے قتل کا انتقام لے سکوں۔“
میں نے کہا۔ ”فرائی ڈے! اگر ہم ایک بڑی سی کشتی بنا کر اس جزیرے سے خدا کا نام
لے کر چل پڑیں تو کسی نہ کسی روز ٹرینی دار کے ساحل پر ضرور جا لگیں گے۔ تم ساری نشانیاں اسی
سمندر کی بیان کر رہے ہو۔ کیا خیال ہے؟ اگر ہم ٹرینی دار پہنچ گئے تو پھر ایسا ہو سکتا ہے کہ
وہاں ہم کام کر کے پیسہ کمائیں اور پھر کرائے کے سپاہی بھرتی کر کے ان کو اسلحہ دے کر تمہارے آبائی
جزیرے پر حملہ کر کے اسے فتح کریں۔ اور باغی سردار کو قتل کر کے تمہاری بادشاہت تمہیں واپس
دلائیں کیا خیال ہے؟“

فرائی ڈے کچھ سوچ کر بولا

”ماسٹر! کرائے کے سپاہی بھرتی کر کے حملہ کرنے کا خیال بڑا مشکل لگتا ہے۔

لیکن اتنا ضرور ہے۔ کہ اگر ہم کوشش کر کے ایک بڑی کشتی بنا کر کھلے سمندر میں نکل
چلیں تو تمہیں اس عمر قید سے ضرور رہائی مل سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر کیا خیال ہے۔ کل سے کشتی بنانا شروع کر دیں؟“

”ہاں! میں تیار ہوں۔“

رات اسی قسم کے منصوبے بناتے بناتے ہم سو گئے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں لندن
واپس پہنچ چکا ہوں۔ میرے سونے سے بھرے صندوق جہاز پر سے اتارے جا رہے ہیں

ایک ہجوم میرے خیر مقدم کے لئے بندرگاہ پر کھڑا تھا ہلا ہلا کرتا لیاں بجا کر مجھے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ اخباری نمائندے مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ میرا باپ میرے پاس کھڑا ہے اور مجھے گلے لگا کر پیار کر رہا ہے۔ میں جزیرے سے بے پناہ دولت لے کر واپس لندن چلا ہوں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو رہی تھی۔ فرائی ڈے گھوڑے نیچ کر مسور ہا تھا۔ میں نے فرائی ڈے کو جگایا اور کہا

”فرائی ڈے! میری ابھی نیند پوری نہیں ہوئی۔ میں ابھی کچھ دیر سوؤں گا۔ تم ایسا کرو کہ کہیں سے کلباڑے کہ جنگل میں جاؤ اور کوئی ایسا مناسب درخت دیکھ کر اس پر نشان لگا دو جس کی کشتی بنا کر ہم یہاں سے کوچ کر سکیں۔“

فرائی ڈے نے کلباڑا پکڑا اور رسی کو بیڑھی لگا کر کہیں سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ مجھے سوئے بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا ہو گا کہ گولیوں کے دھماکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ سب سے پہلے میں نے اپنی بندوق اور پستول کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھیں۔ پھر یہ بندوق جزیرے میں کسی نے چلائی؟ کیا کوئی فوج یہاں آگئی ہے؟ میں خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس جزیرے سے رہا ہو کر جا سکتا تھا۔ میں آزاد ہو سکتا تھا۔ اتنے میں فرائی ڈے سیڑھیاں اتر کر پانتا ہوا میرے پاس آکر بولا

”ماسٹر! ماسٹر! دو کشتیوں پر سمندری ڈاکو آئے تھے۔ انہوں نے تین گورے گورے ملاحوں کو ساحل پر لا کر گولی سے اڑا دیا اور پھر واپس چلے گئے۔“

میں تیزی سے اٹھا اور کہیں کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا فرائی ڈے کے ساتھ بھاگتا ساحل پر آگیا۔ سب سے پہلی جوشے مجھے نظر آئی وہ ایک سیاہ بادبانوں والا بحری ڈاکوؤں کا جہاز تھا جو ساحل سے کافی دور سمندر میں کھڑا تھا۔ لیکن جس کے مسئول پر کھوپڑی والا سمندری قزاقوں کا سیاہ جھنڈا دور سے لہراتا صاف نظر آ رہا تھا۔ دو کشتیاں ساحل چھوڑ کر بیڑی تیزی سے واپس جہاز کی طرف جارہی تھیں۔ ان کشتیوں میں سمندری ڈاکو بیٹھے تھے۔ انہوں نے سروں پر نیلے لال رو مال باندھے ہوئے تھے اور دھوپ میں ان کے کانوں کے سنہری مندرکے دور سے چمک رہے تھے۔ آزادی کی ترپ نے مجھے بے چین اور بے تاب کر دیا۔ مجھے ایک

کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ بحری قزاق ہیں اور یہ تو کسی بھی اجنبی کو اپنے جہاز پر آنے جازت نہیں دیتے اور اسے بے دریغ ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر رو رو کر سے چلاتے ہوئے سمندر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ میں انہیں مدد دے کہہ کر رہا تھا۔ ڈاکوؤں کی کشتیاں ساحل سے دور جا چکی تھیں۔

فرائی ڈے بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سمندری ڈاکوؤں نے دو وحشی سے انسانوں بناد ریت پر بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دور سے فائرنگ شروع کر دی۔ فرائی ڈے دھکا دے کر مجھے ریت پر گر لیا۔ ڈاکوؤں کی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزری ہیں۔ آزادی کی ترپ اتنی شدید تھی کہ میں نے فرائی ڈے پرے گر کر دوبارہ سمندر کی طرف ہانکا شروع کر دیا۔ اب میں گھٹنے گھٹنے سمندری لہروں میں داخل ہو چکا تھا۔ اور مسلسل ہاتھ ہلا کر آوازیں دے رہا تھا

”مجھے بھی اس جہنم سے بچو! میں تیس برس سے یہاں زندہ درگور

ہوں۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو مجھے جہاز پر لے جا کر گولی مار دو۔ مگر اس جزیرے سے نکال کر لے چلو۔ ایک بار مجھے جہاز کے تختے پر اپنے پاؤں رکھ لینے دو۔“

دور سمندری ڈاکوؤں کے قہقہوں کی آوازوں کے ساتھ کچھ پستول چلے اور خدا جانے اس کی گولیاں کہاں جا کر گر گئیں۔ پھر وہ لوگ اپنے جہاز پر سوار ہو گئے۔ رسوں کی مدد سے کشتیوں کو اوپر اٹھا لیا گیا۔ اور بد نصیب آنکھوں کے سامنے جہاز نے ننگر اٹھایا اور وہ واپس روانہ ہو گیا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ میرے دیکھتے دیکھتے سمندر کے سینے پر اتنی دور چلا گیا۔ کہ میں اب ایک سیاہ دھبہ سا نظر آنے لگا۔ فرائی ڈے مجھے تھام کر واپس ساحل پر لے آیا۔ میرا دل صدمے سے پھٹا جا رہا تھا۔ قسمت میرے ساتھ بڑا بھیانک مذاق کر رہی تھی۔ جہاز ساحل پر آتے تھے اور مجھے آزادی کی جھلک دیکھا کہ ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ فرائی ڈے یہ کہہ کر مجھے پھر سے ہوش میں لے آیا کہ ساحل کی ریت پر تین گوری رنگت داے مردہ پڑے ہیں۔ مجھے اب یاد آیا کہ ان ڈاکوؤں نے تین آدمیوں کو جزیرے کے ساحل پر لا کر گولی مار دی تھی۔

۱۔ یہ کافی زیادہ گولیاں تھیں۔ سگریٹ ہم نے ایک ایک سلگا لیا۔ بڑا خوشبودار سگریٹ
۱۔ اس کے دھوئیں کی مہک سے مجھے لندن کی مہک یاد آگئی اور دل اداس ہو گیا۔ پنسل
چاقو بھی میں نے سنبھال کر رکھ لیا۔ میں نے فرائی ڈے سے کہا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ اگر
بڑی کشتی میں سوار ہو کرواں سے روانہ ہوں تو ٹرینی دار ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ فرائی ڈے
بتایا کہ اس نے ایک درخت کو کشتی کے لئے جہن کر اس پر نشان لگا دیا ہے۔

ہم نے اگلے دن درخت کو کاٹنا شروع کر دیا۔ شام کو درخت جڑ سے کٹ کر زمین پر آں
اب اس کو کاٹ کر اس کے تنوں سے ایک کشتی تیار کرنی تھی جس میں سوار ہو کر ہم اس
زیرے سے نجات حاصل کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے تھے۔ ہمیں کشتی پر کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ
لنگر گیا اور ارنہ ہونے کی وجہ سے کام کی رفتار بڑی سست تھی۔ لوہے کے کیلوں کی جبکہ
ہم کدو کی مینیں بنا کر ٹھونک رہے تھے۔ فرائی ڈے میرے ساتھ پوری محنت اور جانفشانی
سے کام کر رہا تھا۔ ایک مہینہ لنگر گیا۔ کشتی آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ ہم نے اس میں
دھلوانی چھت کا سا بنان بھی بنایا۔ تاکہ بارش سے بچ سکیں۔ اور دھوپ سے بھی محفوظ
رہا جاسکے۔ جن لوگوں نے سمندروں میں سفر کیا ہے۔ وہ سمندر کی گرم دوپہر سے اچھی طرح
واقف ہوں گے۔ جب دھوپ کی چمک ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور پانی سے گرم
بخارات اٹھتے ہیں۔ فرائی ڈے مجھ سے بھی پہلے صبح اٹھ کر کام سے جڑ جاتا۔ وہ اس
جزیرے سے نجات حاصل کر کے کسی ماڈرن شہر کو دیکھنے کا بہت شوقین تھا۔ وہ بھی میری
طرح اپنی پہلی فرصت میں اس جزیرے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سارا دن وہ بڑی
نوجوانی سے کام میں لگا رہتا۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ فرائی ڈے نے تھوڑی سی روٹی کھائی۔ بکری کے دودھ کا ایک
پیالہ پیا اور تیر گمان گلیے میں لٹکا کر کشتی کی تیاری کے لئے کیمپ سے نکل کھڑا ہوا۔ میں رات
بھر کی گشت کا تھکا ہوا تھا۔ ابھی تک تخت پر لیٹا نیند کے عالم میں تھا۔ میں نے ایک
آنکھ کھول کر فرائی ڈے کو کام پر جاتے دیکھا۔ اس نے اُونچی آواز میں کہا۔
”گڈ مارنی!“

میں تیز تیز چلتا ہوا تین لاشوں کے پاس آیا جو ریت پر پڑی تھیں۔ یہ سفید فام تھے اور
شکل و صورت سے انگریز معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے دو تو مر چکے تھے۔ گولیاں ان کے دل سے
پار ہو گئی تھیں۔ البتہ ایک جہازی میں ابھی کچھ سانس باقی تھے۔ میں اس پر جھک گیا۔ میں نے اُس
سے پوچھا۔
”کیا تم انگریز ہو؟“

یہ سرخ بالوں اور مڑی ہوئی ناک والا ایک صحت مند صلاح تھا۔ جس نے کپتان کی وردی پہن
رکھی تھی اس کی ساری وردی خون میں لت پت تھی۔ سمندری ڈاکوؤں کی گولیاں اس کے پیٹ میں
سے گزر گئی تھیں۔ اس میں ابھی کچھ سانس باقی تھے۔ اس نے لڑکھڑائی ہوئی زبان میں بتایا کہ
وہ فرانسیسی جہاز کا کپتان ہے۔ اس کے جہاز پر بحری ڈاکوؤں نے حملہ کر کے اسے ڈبو دیا۔ سارا
مال لوٹ کر اپنے جہاز پر ڈال لیا۔ سارے مسافروں کو جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں غرق کر دیا
وہ مر رہا تھا۔ میں نے چلا کر اس سے پوچھا

”یہ جزیرہ کس خلیج میں ہے؟ کیا یہ ٹرینی دار کی خلیج ہے؟“

فرانسیسی کپتان نے آہستہ سے اثبات میں گردن ہلائی اور پھر اس کی گردن ایک طرف کو
ڈھلک گئی۔ وہ مر چکا تھا۔ ایک بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ کہ یہ ٹرینی دار کی خلیج ہی تھی۔ اس کا مطلب
یہ تھا کہ اگر میں ہمت کر کے سمندر میں نکل پڑوں تو ایک نہ ایک روز ٹرینی دار پہنچ سکتا ہوں۔
میں نے فرائی ڈے سے کہا۔

”ان لاشوں کی تلاشی لو۔ شاید کوئی کارآمد شے مل جائے۔“

ان تینوں کی وردیوں کے اندر پستول لگے تھے اور گولیوں کی بیٹیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔
کمال کی بات یہ تھی۔ کہ ڈاکوؤں نے ان گولیوں اور پستولوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ہم نے ان
کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک چاقو۔ ایک پنسل۔ سگریٹوں کا ایک بیگ اور ایک بڑی دیا سلانی
کی ڈبیا برآمد ہوئی۔ یہ ساری چیزیں اپنے قبضے میں کرنے کے بعد ہم نے ان کے کپڑے اتارنے
کو ارنہ کئے اور انہیں اسی طرح وردیوں میں پورے اعزاز کے ساتھ ساحل کی ریت میں دفن کر کے
اوپر درختوں کی مٹلیں گاڑ دیں۔ کیمپ میں آکر میں نے تینوں پستول اور گولیاں سنبھال کر رکھ

میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں نے ان قدموں کے نشان میں فرائی ڈے کے پاؤں کا نشان بنایا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اسے زبردستی گھسیٹ کر لے جایا جا رہا تھا۔ لیکن فرائی ڈے چیخ مار کر مجھے مدد کے لئے کیوں نہیں بلایا؟ ضرور آدم خوروں نے اس کا منہ بند رکھا ہوگا مارے پرستی کے گھسنے کا نشان بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے بڑی پریشانی ہو گئی فرائی ڈے اغوا میرے لئے ایک بے حد تکلیف دہ حادثہ تھا۔ وہ لوگ تو اسے کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ خدا جانے انہوں نے اسے اس جزیرے پر قتل کیوں نہیں کیا؟ وہ تو رسی آسانی سے اس کی گردن اڑا کر اس کے ٹکڑے کر کے بھون کر کھا سکتے تھے مگر شاید انہوں نے اس لئے آگ نہیں جلائی کہ مجھے خبر ہو گئی۔ تو میں دھماکے والی بندوق لے کر ان کے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ میں فوراً کیبن میں آ گیا۔ میں نے رسی کی سیڑھی اندر کھینچ لی اور کونے میں بیٹھ کر غور کرنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔

غور کرتے کرتے سمجھ رہی ہو گئی۔ میں نے تھوڑی سی ڈبل روٹی زہر مار لی اور باہر نکل کر سمندر کے کنارے ٹہلنے لگا۔ طوطا میری گردن پر بیٹھا تھا۔ کتا میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا میرے گلے میں پستول اور دو رہین لٹک رہی تھیں۔ پیٹی میں شکاری چاقو تھا۔ سر پر بکری کی کھال سے بنی ہوئی چھتری تان رکھی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے میں اس نشان کے پاس آ گیا جس پر میں نے لکڑی کی صلیب پر دنوں کے نشان اور اپنے پہلی بار اس مخوس جزیرے پر آنے کی تاریخ لکھ رکھی تھی۔ موسم کے اثرات نے لکڑی کی صلیب کو خستہ حالت میں کر دیا تھا میں نے اس صلیب پر اپنی ایک پرانی پتلون بھی لٹکا رکھی تھی۔ سمندر کی تیز ہوا میں لہرا لہرا کر اس کے پھوٹنے اڑ گئے تھے۔ یہ اس خیال سے لٹکا رکھی تھی کہ اگر خوش قسمتی سے کسی گزرتے جہاز ران کی اس پر نظر پڑ جائے تو وہ میری مدد کو یہاں آجائے۔ لیکن میری قسمت اتنی اچھی نہیں تھی شاید کہ کوئی جہاز میری مدد کو یہاں پہنچتا۔ ایک جہاز نظر آیا تو وہ ادھر کا رخ کئے بغیر آگے نکل گیا دوسرا جہاز آیا تو وہ بحری ڈاکوؤں کا تھا جس نے مجھ پر بھی گولیاں چلا کر مجھے ہلاک کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

میں سمندر کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ سمندر دور تک ویران تھا۔ چھوٹی چھوٹی

میں نے ایک ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کا جواب دیا۔ میری آنکھیں نیم دانتھیں اور میں نہ خوابی کے عالم میں تھا۔ فرائی ڈے چلا گیا۔ اس نے باہر سے رسی کی سیڑھی اچھال کر اندر پھینک دی میں پھر سو گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر سویا ہوں گا۔ کہ چڑیلوں اور طوطے کے شور سے میری آنکھ کھل گئی خاص طور پر میرے طوطے نے مجھے سوتا دیکھ کر بہت شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ میں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور طوطے کو ڈبل روٹی اور خشک انگور دیئے اب معلوم ہوا کہ اسے بھوک لگی تھی اور وہ خشک انگوروں کا ناشہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر میں نے بھی تھوڑا بہت ناشہ کیا اپنے کتے کو روٹی اور دو دودھ ڈالا پستول اور دو رہین گلے میں لٹکا کر کیبن سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر میں نے سیڑھی کو ایک طرف درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ آج طبیعت کچھ سست تھی اور کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مجھے معلوم تھا کہ فرائی ڈے کشتی کے تختے جوڑ رہا ہوگا اور میرا منتظر ہوگا۔ میں نے سوچا کہ اسے جا کر کہہ دینا چاہیے کہ بھائی میرا آج کام کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ بس تو اکیلا ہی کام کئے جا۔ چنانچہ اس خیال کے ساتھ میں اس گھنے درخت کی طرف چل دیا جس کی چھاؤں میں درخت کاٹ کر کشتی بنائی جا رہی تھی۔ وہاں فرائی ڈے نہیں تھا۔ ہر شے اپنی جگہ پر ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ وہ چٹنے پر پانی پینے گیا ہوگا۔ لکڑی اور میں میخیں ٹھونکنا شروع کر دیں۔ کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ فرائی ڈے واپس نہ آیا۔ اب مجھے تشویش ہوئی کہ وہ کہاں چلا گیا۔

میں چٹنے پر آیا۔ وہاں وہ نہیں تھا۔ میں واپس کیبن میں آیا کہ کہیں یہاں کوئی شے لینے نہ آ گیا ہو۔ کیبن بھی خالی پڑا تھا۔ اب تو مجھے بڑا فکر لگا۔ میں نے گھوم پھر کر سارے جزیرے میں اسے تلاش کیا۔ اُسے اُونچی اُونچی آوازیں بھی دیں۔ جنگل میں سوائے میری بازگشت کے اور کوئی جواب نہ ملا۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ یا خدا! فرائی ڈے کہاں چلا گیا؟ میں مغرب کی کنارے ریت پر چل رہا تھا کہ اچانک میں نے وہاں تازہ قدموں کے نشان دیکھے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ نشان چھ سات آدمیوں کے تھے اور بالکل تازہ تھے۔ پہلے یہ نشان جنگل کی طرف گئے تھے۔ دختاً ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں چمکا۔ کہیں فرائی ڈے کو آدم خوروں وحشیوں نے تو اغوا نہیں کر لیا۔

یہ سہ پہرے گئے ہوں۔ میری کشتی ساحل سے بہت آگے نکل آئی ہے۔ مجھے اپنا جزیرہ دور ہوتا آ رہا تھا جس رات میں آج سے تیس برس کے قریب پہلے پہل اس جزیرے پر آیا تھا۔ تو رے یہ مجھے بالکل ایسا ہی دکھائی دیا تھا۔ ایک پل کے لئے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اس محسوس جزیرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر یاد کہہ رہا ہوں۔

آدھی رات تک میں کشتی کھیتا رہا۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں میں غلط سمت پر تو نہیں لی نکلا ہوا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں اس کمزور سی کشتی پر کھلے سمندر میں جان لکوں گا۔ یہ تو اپنی تباہی و غد و آواز دینے والی بات تھی۔ کیونکہ اتنی معمولی اور کمزور سی کشتی پر سکون سمندر میں تیس تیس میل کا فاصلہ تو طے کر سکتی تھی۔ لیکن کھلے سمندر کی اونچی اونچی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی میرے دل کو مختلف قسم کے دوسوسوں نے گھیر لیا۔ اگر اس جزیرے کو ہمیشہ کے لئے خیر یاد کہنا تھا تو پھر بڑی کشتی پر نکلتا۔ چھوٹی کشتی پر تو میں کسی صورت وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ میرا خیال ہے مجھے واپس چلے جانا چاہیے نہیں تو میں ضرور کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ اگر کسی بڑی لہر پر کشتی سوار ہو گئی تو پھر ساری زندگی کنارے پر نہ لگ سکوں گا۔

یہ سوچ کر میں کشتی کو موڑنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر مشرق کی طرف گئی۔ دور مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں کسی جزیرے پر پہنچنے والا تھا۔ یہ جزیرے میں کسی جگہ آگ جل رہی تھی تو کیا یہی فرائی ڈے کے ماں باپ کا جزیرہ تھا۔ یقیناً یہی ہوگا۔ اب پیچھے مجھے اپنا جزیرہ نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ بس ان دونوں جزیروں میں اتنا ہی فاصلہ تھا کہ جب ایک جزیرہ نظروں سے اوجھل ہوتا تھا۔ تو دوسرا جزیرہ نظر آنا شروع ہو جاتا تھا۔ میں بڑے غور سے اس روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ جو مجھے دور جزیرے پر نظر آرہی تھی۔ شاید کسی نے یہ آگ پہاڑی پر جلا رکھی تھی۔ روشنی لمحہ بہ لمحہ قریب آرہی تھی۔ اب جزیرے کے درختوں کی سیاہ لکیر خاصی قریب آگئی تھی۔ اور درختوں کے گھنے سائے دکھائی دینا شروع ہو گئے تھے۔ میں کشتی میں نیم دراز ہو گیا اور بڑی احتیاط سے چپو چلانے لگا۔ اس خیال سے کہ اگر کوئی آدم خور چوک دار کی کر رہا ہو تو اس کی نظر سے بچ سکوں، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری طرح سے ان آدم خوروں کی نگاہ بھی اندھیرے میں ہر شے کو دور سے دیکھ لیتی ہے۔ میں کشتی کو مشرق کن رے کی طرف

لہریں دور دور سے آکر ساحل کی ریت کو چوم کر واپس جا رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں فرائی ڈے کی شکل گھوم رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آدم خور اس کو آگ پر بھون کر کھا رہے ہیں میں ایک دم سے اٹھ کھڑا ہو گیا میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس ڈرائے کا ایک خاموش تماشا بنی نہیں بنوں گا۔ بلکہ جس طرح سے بھی ممکن ہوا فرائی ڈے کی مدد کروں گا۔ اس کی جان بچاؤں گا۔ میں نے غور کرنا شروع کر دیا کہ مجھے اپنے دوست کی جان بچانے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟ میرے پاس بندوقیں اور بندوق تھی جس کا مقابلہ وحشی لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ تو کیا میں کشتی لے کر آدم خوروں کے جزیرے پر جاؤں اور فرائی ڈے کو ان کے جنگل سے بچا کر لاؤں؟

فرائی ڈے کو بچانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ میں فرائی ڈے کی مدد کرنے اس کے جزیرے پر جاؤں گا۔ اور آدم خور وحشیوں کا مقابلہ کر کے اسے ان کے پنجے سے چھڑا کر لاؤں گا۔ میں فوراً کہیں میں آگیا۔ میں نے جزیرے سے روانگی کے لئے رات کا وقت چنا۔ وہ راتیں تاریک تھیں۔ اور چاند نہیں نکلا کرتا تھا۔ میرے لئے ایسی ہی رات موزوں تھی کہ جس میں کوئی مجھے سمندر پر کشتی میں نہ دیکھ سکے۔ کہیں میں آکر میں نے ضروری تیاری شروع کر دی پانچوں کے پانچوں بندوقوں سے بھر کر گلیے میں لٹکائے۔ بندوق بھی بغل میں دہالی۔ دور بین بھی ساتھ رکھی اور اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں بہہ نکلا۔ میں رات کی دھیمی دھیمی روشنی اور اندھیرے میں جزیرے کے شمال مغرب کی طرف کشتی کھے رہا تھا۔ یہی وہ سمت تھی جدھر سے آدم خور وحشی آیا کرتے تھے۔ فرائی ڈے نے بھی اس سمت کو اشارہ کر کے مجھے بتایا تھا کہ وہ ادھر کسی جزیرے میں آباد تھا۔

سمندر بڑا پرسکون تھا۔ آسمان پر بے شمار چھوٹے بڑے ستارے چمک رہے تھے۔ ان کی ہلکی نیلی روشنی میں سمندر دور تک پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ میرے چپوؤں کی چھپک چھپک کی آوازیں کی خاموشی میں پیدا ہو رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں ہی فرائی ڈے کے جزیرے پر پہنچ جاؤں۔ کیونکہ دن کی روشنی میں، میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اب ایک یہ خیال بھی سنانے لگا کہ کیا خبر آدم خور فرائی ڈے کو اس جزیرے پر نہ لائے ہوں۔ بلکہ کسی دوسرے

ہزار اندھیرا تھا میں نے آنکھیں بند کیں اور اندھیرے میں دیکھنے والی حس کو بیدار کر کے میں پوری کھول کر جھانکا۔ اب مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ اندر سوائے پانی کے ایک مسئلے اور کچھ نہیں تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ یہ شخص اکیلا ہی پہرہ دے رہا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی اور حوصلہ بلند ہو گیا۔ اس اکیلے آدم غور کو زیر کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہ میں پستول نہیں چلانا چاہتا تھا۔ کہ کہیں سارے آدم غور بیدار ہو کر مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔ پھر میرے لئے جان بچانا مشکل ہو گا۔ میں نے پستول گلے میں لٹکا لے کر تھکے اور دونوں ہاتھوں میں بکری کی کھال کی بنی ہوئی رسی تھام رکھی تھی۔ وحشی شاید گہری نیند میں تھا۔ میں اس کے بالکل پاس پہنچ گیا تھا۔ دراز سے کوئی خبر نہیں ہوئی تھی حالانکہ یہ لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں اور جنگل میں ذرا سی آہٹ پر بھی چوکنے ہو جاتے ہیں۔ وحشی کے عقب میں جاتے ہی میں نے جیتے ایسی تیزی کے ساتھ کھال کی رسی اس کے گلے میں ڈال کر اس زور سے مروٹی کہ وحشی کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر مجھے دیکھا۔ میں اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا جھونپڑی کے اندر لے گیا۔ میں نے اس کا گلا اتنا دبا رکھا تھا کہ اس کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ میں نے اس کے کان کے پاس منہ سے جا کر اس کی زبان میں کہا۔

”تم لوگ ساتھ دالے جزیرے سے آج صبح ایک لڑکے کو اغوا کر کے لائے

ہو؟“

میں نے وحشی کی رسی ذرا سی ڈھیلی کر دی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور زور سے چیخنے لگا کہ میں نے رسی پھر سے کس دی اور ساتھ ہی پستول اس کی کپٹی پر رکھ کر کہا۔

”یہ وہ شے ہے جس میں سے آگ نکلتی ہے اور دھماکا ہوتا ہے۔ اور

انسان تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ اگر جان کی امان چاہتے ہو تو اسی طرح خاموش

بیٹھے رہو۔ یہ دیکھو میرے پاس اس قسم کے کتنے ہی پستول ہیں۔ میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بڑی آسانی سے ہلاک کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ وہ

لیتا گیا۔ یہ کنارہ میں نے غور سے دیکھا کھنڈ درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں میرے جزیرے کے مقابلے میں بہت زیادہ اور بہت ہی گھنے اور اونچے اونچے درخت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ایک آباد جزیرہ تھا۔ آگ ایک جھونپڑی کے باہر جل رہی تھی۔ جو ایک ٹیلے کے اُن میں سمندر کے کنارے پر تھا۔

ظاہر تھا۔ کہ یہ جھونپڑی ایک طرح کی نگرانی کی چوکی ہے۔ ضرور یہاں کوئی چوکیدار پہرہ دے رہا ہوگا۔ میرے لئے زیادہ دیر سمندر میں رہنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں کشتی کو کھینٹا ہوا بڑے اطمینان اور ہوشیاری سے سمندر کے مشرقی کنارے کی طرف لے آیا۔ میں نے سمندر میں اتر کر کشتی کو کھینچا اور اسے گھسیٹا ہوا۔ ایک باہر کو نکلی ہوئی چٹان کی کھوہ میں لے گیا۔ یہاں سمندری بلیں اُگی ہوئی تھیں۔ میں نے کشتی کو ان بلیوں میں چھپا دیا اور دونوں ہاتھوں میں پستول تھام کر دبے پاؤں اس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ جس کے باہر آگ جل رہی تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ میں ٹھیک جزیرے پر آیا ہوں اور کیا یہ واقعی فرانی ڈے کا جزیرہ ہے اور کیا وہ اسی جزیرے میں قید ہے؟ اگر یہ فرانی ڈے کے دشمن قبیلے کا جزیرہ تھا تو پھر مجھے ان لوگوں کی زبان آتی تھی۔

رات کے سائے بڑے گہرے تھے۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے جن کی روشنی بہت مدھم تھی۔ سمندر پر سکون تھا۔ لہریں بڑے آرام سے ریت کے پاؤں دھلا کر واپس چلی جاتی تھیں میں کنارے کے درختوں کے نیچے سے ہو کر جھکا جھکا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں جھونپڑی کے بالکل قریب اس کے عقب میں آ گیا۔ آگ ایک چھوٹے سے الاؤ کی صورت میں جھونپڑی کے آگے جل رہی تھی ایک آدم غور رنگ دھڑنگ وحشی گھٹنوں میں سر دیئے اُوندھ رہا تھا یا سو گیا تھا۔ برس با برس سے ایک بے آباد جزیرے پر رہتے ہوئے مجھے جانوروں کی طرح بغیر آواز پیدا کئے چلنے کا فن خوب آ گیا تھا۔ میں دبے دبے جھونپڑی کے پیچھے آ گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جھونپڑی کے اندر بھی کوئی ہے یا نہیں؟ یہ جھونپڑی اسی طرح کی گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی۔ جس طرح کی جھونپڑیاں وحشی لوگوں کی ہوا کرتی ہیں۔ جھونپڑی کی مخروطی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے ایک جگہ سے گھاس ذرا ہٹائی اور اندر دیکھا

جاتا تھا کہ آدم غور ضرور کہیں اس پاس ہی ہوں گے اور ان کی آنکھیں اور کان بڑے تیز تھے ہیں۔ میں بھی جزیرے کا ایک وحشی ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آدم غور نہیں تھا۔ میں دور سے ہلکی سے ہلکی آہٹ سن لیتا تھا۔

ایک جگہ بہت سارے درختوں کا گھنا بھاڑ تھا۔ آسمان پر صبح کی روشنی پھیل چکی تھی اب

لگے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ان گھنے درختوں میں سے ایک جگہ سے ہلکا ہلکا دھواں

ٹھہر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آدم غور وحشیوں کے جھونپڑے ہیں۔ چند قدم

اگے جا کر میں نے بھاڑیوں کو ہٹا کر دیکھا۔ سامنے ایک صاف جگہ تھی۔ کنارے کنارے درختوں

کے نیچے جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک جھونپڑی سب سے اونچی تھی اور اس کے

اوپر پائس کے ساتھ کسی بد نصیب انسان کی کھوپڑی لٹک رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ قبیلے

کے ظالم سردار کی جھونپڑی ہے۔ اس کے عقب میں وہ جھونپڑی کے عقب میں جانا چاہیئے؟ پھر خیال

آیا کہ دن نکلنے والا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ وحشی اپنی اپنی جھونپڑیوں

سے باہر نکل آئیں گے۔ اس نے کسی جگہ چھپ کر موقع کا انتظار کیا جائے۔ ایک ادربات مجھے

یشان کر رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ بہت جلد ان آدم غوروں کو علم ہو جائے گا کہ ان کے ایک ساتھی

وغائب کر دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کھانسی میں وحشی آدم غوروں کی لاش پھول کر اوپر

اُجائے۔ یہ وحشی قاتل کی تلاش میں جزیرے کا کونہ کونہ پھان ماریں گے۔ اس لئے میرے واسطے

بہت مزوری ہو گیا تھا کہ میں کسی ایسی جگہ چھپ کر اندھیرا ہونے کا انتظار کروں۔ جہاں

ان وحشی آدم غوروں کی نگاہ نہ پہنچ سکے۔ مصیبت ایک یہ بھی تھی کہ یہ جزیرہ میرے لئے

اجنبی تھا اور وہ لوگ اس کے چپے چپے سے واقف تھے۔

پھر بھی کسی جگہ چھپنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اپنی عارضی کمین گاہ کی تلاش

شروع کر دی۔ یہ جزیرہ میرے جزیرے کے مقابلے میں زیادہ گھنا تھا۔ یہاں بڑی گھن دار

بھاڑیاں اور گھاس تھی۔ آخر مجھے چھپنے کے لئے ایک جگہ مل گئی۔ یہ ایک کھوہ تھی جو ایک

چٹان کے عقب میں بھاڑیوں کے اندر جا کر آتی تھی۔ ایک کھوہ کے منہ پر گنجان بھاڑیوں نے

سایہ کر رکھا تھا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ پردہ ڈال رکھا ہے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ میں

اغوا شدہ نوجوان کہاں پر ہے؟

کیا تم لوگوں نے اسے بھون کر کھالیا ہے؟

وحشی نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

”نہیں۔“

میں نے پوچھا ”تو پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟ کس جھونپڑی میں قید ہے؟“

یہ پریدار وحشی مجھ سے کچھ اس طرح سے خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اس نے دوبارہ اپوں نہ

نہ کی اور صاف صاف بتا دیا کہ فرائی ڈے اس جنگل کے اندر سردار کی بڑی جھونپڑی کے نیچے

ایک جھونپڑی میں قید ہے۔ جہاں ہر وقت دو آدم غور پھرتے اور تیر کر مان لئے پھرہ دیتے ہیں اس

نے یہ بھی بتایا کہ فرائی ڈے کو اس لئے ابھی تک ہلاک نہیں کیا گیا کہ کسی دیوتا کے تہوار کا دار

قریب ہے۔ سردار اس روز دیوتا کے حضور میں فرائی ڈے کا خون اور گوشت پیش کرنا چاہتا

ہے یہ بات میرے لئے بڑی غرض کی تھی کہ فرائی ڈے ابھی تک زندہ تھا۔ مجھے اب اس وحشی

کو ٹھکانے لگانا تھا۔ اگر میں اسے زندہ چھوڑ دیتا ہوں تو خطرہ تھا کہ وہ بھاگ جائے اور جا

سارے آدم غوروں کو خبر کر دے یا ایک تیغ مار کر سب کو ہوشیار کر دے۔

میں نے اس سے پوچھا ”تم نے کتنے انسانوں کو ہلاک کر کے ان کا گوشت کھالیا ہے۔“

اس نے اشارہ کر کے کہا۔ ”ہارہ آدمیوں کا گوشت کھا چکا ہوں۔“

میرے لئے اس آدم کو کفر کر دار کو پہچاننے کے لئے اتنا جواز کافی تھا۔ میں نے پیچھے سے پستول

کا دست اس کے سر پر مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا میں اسے گھسیٹ کر سمندر کے ساحل تک

لے گیا اور ایک اونچی چٹان سے دھکیل کر گہرے سمندر کی کھاڑی میں گرادیا۔ اب میں بھاگ

کر جھونپڑے میں آیا۔ میں نے جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر ایک مکار چور کی طرح ساحل کے درختوں

کا جائزہ لیا۔ اب آسمان پر صبح کی نیلی نیلی روشنی کا بخار سا پھیلنے لگا تھا جس میں درخت منہ

دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بڑے ہی گھنے درخت تھے۔ ان میں ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی

بھاڑیوں کے درمیان سے جنگل چلی گئی تھی۔ اس راستے سے جنگل میں داخل ہونا خطرناک تھا

میں دوسری طرف سے جنگل میں داخل ہو گیا۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا کیونکہ

ایس اور ہزار بار میری زندگی خطرے میں بھی پڑی۔ مگر میں نہیں گھبرایا تھا۔ زندگی میں شاید ہزار میری زندگی خطرے میں بھی پڑی۔ میں نہیں گھبرایا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار میں ان افروں کے عزائم سے خراخوف زدہ ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی میں نے اپنے آپ کو جاتی وچرند یا۔ میری فطری دلیری اور نڈر پن مجھ پر غالب آگیا۔ میں غور سے آدم غور وحشیوں کی باتیں نے لگا۔ وہ آپس میں جانوروں کی طرح بول رہے تھے۔ ان کی آوازیں بڑی تیز اور لوکی تھیں۔ یہ بندر آپس میں لڑ رہے ہوں۔ ان کے بعض الفاظ میری سمجھ سے باہر تھے۔ اب معلوم ہوا کہ رائی ڈے کی زبان ان وحشیوں کی زبان سے کافی مہذب اور شائستہ تھی۔

اس کھوہ میں آکر بیٹھ گیا۔ میں نے بندوق چٹان کی اندرونی دیوار کے ساتھ لگائی اور ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں تھک گیا تھا۔ کشتی چلاتے چلاتے میرے بازوؤں میں درد ہونے لگا تھا۔ مجھے درختوں پر پرندوں کے چھپانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ جس کی روشنی بھائیوں میں سے چھن کر اندر کھوہ تک آرہی تھی۔ میں بہت چوکس ہو کر بیٹھا تھا۔ میرے کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے مجھے معلوم تھا۔ کہ اب تک آدم خوروں کو پہریدار وحشی کی کم شدگی کا علم ہو چکا ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے۔ انہیں کھاڑی میں سے لاش بھی مل گئی ہو۔

دور سے مجھے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ہمت تن گوش ہو گیا۔ آوازیں قریب آ گئیں۔ یہ آدم غور وحشی لوگ تھے۔ جو میری طرف چلے آ رہے تھے کم از کم مجھے تو یہی محسوس ہوا۔ کیونکہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ دے قریب سے قریب تر ہو رہی تھیں۔ وہ آپس میں اسی وحشی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ چونکہ میں ان لوگوں کی زبان جانتا تھا۔ اس لئے ان کی ایک ایک بات سمجھتا تھا۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ سخت غصے میں تھے۔ وحشی پہریدار کی لاش سنا کی کھاڑی سے مل گئی تھی اور سردار نے حکم دیا تھا۔ کہ قاتل جزیرے میں ہی کہیں ہے اسے پکڑ کر اس کے سامنے لایا جائے تاکہ وہ اپنے ماتھے سے اس کا سرن سے جدا کرے اور خود بھون مگر کھائے۔ میرے جسم میں ایک سنسی سی دوڑ گئی۔ تو گویا یہ لوگ میرے خون کے پیاسے تھے اور میرے سر کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ آوازیں میرے قریب آ کر ڈک گئیں۔ وہ شاید چٹان کے سامنے کسی جگہ بیٹھ گئے تھے۔ آوازوں سے معلوم ہوا کہ وہ تعداد میں چار ہیں۔ وہ آپس میں قاتل یعنی میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بار تو میرا خون خشک ہو گیا۔ میں موت کے منہ میں آ گیا تھا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں تھا یہ بلا میں نے خود مول لی تھی۔

اب مجھے حوصلے سے کام لینا چاہیے تھا۔ میری ذرا سی گھبراہٹ مجھے ہمیشہ کے لئے موت دیند سلا سکتی تھی۔ بلکہ ایک اذیت ناک موت کے منہ میں جھونک سکتی تھی۔ میں اپنی جگہ پر تہ ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے دل کو حوصلہ دیا۔ ہمت اور دلیری کے جذبے کی مجھ میں کمی نہیں تھی میں نے پچیس برس ایک ویران جزیرے پر تنہا بسر کئے تھے۔ ان میں سینکڑوں خوفناک ساتیا

وہ اپنے ساتھی کے قاتل کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ آپس میں کسی ایسے انسان کی لاش کے بارے میں بھی لڑ جھگڑ رہے تھے۔ جسے انہوں نے حال ہی میں بھون کر کھایا تھا۔ اور جو کسی دوسرے قبیلے کا آدمی تھا۔ یہ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ لڑائی کس بات پر کر رہے ہیں اسی طرح باقیں کرتے کرتے وہ آگے نکل گئے۔ کچھ دور تک جنگل میں ان کی آوازیں آتی رہیں پھر غائب ہو گئیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ باہر نکل کر دیکھنا چاہیے کہ کدھر گئے ہیں۔ میں جھاڑیوں ہٹا کر باہر آ گیا۔ جنگل سناں تھا۔ پرندے خوراک کی تلاش میں درختوں پر سے اڑ کر جا چکے تھے۔ سامنے دائیں بائیں دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا۔ سارا دن کہاں چٹان کی کھوہ میں پڑا رہوں گا۔ کیوں نہ اسی وقت فرائی ڈے کے جھونپڑے کی تلاش کیا جائے؟ یہ ایک خطرناک فیصلہ تھا، ہو سکتا تھا۔ جنگل میں آگے جا کر وحشی بھائیوں یا درختوں میں چھپے بیٹھے ہوں۔ کیونکہ نہیں تپا چل گیا۔ کہ ان کا ایک ساتھی ہلاک ہو چکا ہے۔ اور قاتل جزیرے میں ہی ہے۔ دوسری طرف چٹان کے اندر یونہی بیکار پڑے رہنے سے کہیں بہتر تھا۔ کہ جنگل میں چھپ چھپ کر فرائی ڈے کی جھونپڑی تلاش کی جائے۔ چنانچہ میں نے پستول ہاتھوں میں پکڑے اور بڑی احتیاط سے بھائیوں میں سے نکل کر آگے چل دیا۔

میں اندازے کے مطابق اس طرف جا رہا تھا۔ جہاں سردار کی جھونپڑی کا عقب تھا۔ میں کافی فاصلہ دے کر نصف دائرے کی شکل میں جنگل میں آگے بڑھ رہا تھا کہ دفعتاً ایک درخت کے قریب جاتے جاتے میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ مجھے ایک لمحے کے لئے تو اپنی آنکھوں

نہی۔ میں نے لاش کو ایک جگہ زمین پر ٹا دیا اور اس کے اوپر پتے اور جھاڑیاں ڈال دیں
 کام سے فارغ ہو کر میں کھوہ سے باہر نکل آیا اور پھر اپنی منزل کی طرف پھونک پھونک
 دم اٹھاتا روانہ ہو گیا۔ میں اس جنگل درخت بڑی بے ترتیبی سے اگے ہوئے تھے تنوں پر
 ہوتی ہوئی جنگلی سیلوں نے درختوں پر اپنے جھاڑ پھیلارکھے تھے۔ ایک جگہ لال رنگ کا
 نپ اپنا پھن پھیلا کر میرا راستہ روکے کھڑا ہو گیا۔ میں بھی دبیں رک گیا۔ میں نے چہرہ ہاتھ میں
 لایا۔ سانپ نے زبان سے ایک سیٹی سی بجائی اور ذرا سا پیچھے جھک کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ یہ
 لمحہ اس قدر اچانک اور شدید قسم کا جارحانہ تھا کہ میں اگر بھرتی سے کام نہ لیتا تو آج یہ کہانی
 مانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔ میرے چہرے کا پہلا ہی وار کام کر گیا اور سانپ کی گردن بھن کے
 بچے سے کٹ کر الگ جاگری۔

میں درختوں کی اوٹ لیتا۔ جھاڑیوں میں پھپھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے دور سے
 عورتوں اور آدمیوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آدم غوروں کی جھونپڑیاں تھیں
 میں اپنی منزل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں ایک گھنے درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے درہن رنگا
 کر دیکھا۔ سامنے آدم غور قبیلے کے سردار کی اونچی جھونپڑی تھی۔ جس کی چھت پر انسانی کھوپڑی
 بانس پر لٹکی تھی۔ اس جھونپڑی کے پیچھے فرانی ڈے کا بندی خانہ تھا۔ وہ مجھے دکھائی نہیں
 دے رہا تھا۔ لیکن وہ تھا۔ ان ہی درختوں کے پیچھے..... میں درخت سے اترنے ہی والا
 کہ دو آدم غور وحشی آپس میں باتیں کرتے ہنستے دور سے آتے نظر آئے۔ میں نے اپنا آپ درخت
 کی شاخوں میں چھپا لیا۔ وہ میرے درخت کے نیچے سے گذر گئے۔ پھر ذرا آگے جا کر رُک
 گئے اور جھک کر زمین کو دیکھنے لگے یہ وہ جگہ تھی جہاں میں نے سانپ کو دو ٹکڑے کیا تھا
 ایک آدم غور نے زمین پر سے سانپ کی کٹی ہوئی سری اٹھالی اور بڑی حیرانی سے دوسرے
 کو دکھانے لگا۔ دوسرے نے ہنس کر اپنی زبان میں کہا۔

”یہ مری ہوئی شکر قدی ہے۔ کھا لو۔ کھا لو۔“

اور پھر زور سے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے دہرا ہو گیا۔ پہلے آدم غور نے زور سے اس
 کی کمر پر مکا مارا اور غصے میں بولا۔

پربھین نہ آیا۔ میرے بالکل قریب کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر ایک آدم غور وحشی میری طرف
 پیٹھ کے جھک کر کھڑا زمین پر کسی شے کو دیکھ رہا تھا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ دو قدم
 پیچھے ہٹ کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا وحشی نے شاید میرے قدموں کی چاپ
 سُن لی تھی۔ میں نے جھاڑیوں کے پتوں میں سے دیکھا کہ وہ ایک دم سے چونک کر پیچھے گھوما اس
 کی لال لال آنکھیں آتش پارے کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ وہ ناک سیکڑ کر فضا میں
 شاید کسی اجنبی انسان کی بوسونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب میں بھی ہوشیار ہو گیا۔ میں نے
 پستول کی بجائے چہرہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر کچھ سوچ کر اسے بھی پیٹی میں لگا لیا۔ اور وہی بکری کی
 کھال کی مضبوط رسی دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔

وحشی نے کان میں تیر چڑھایا تھا اور قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے نتھنے سیکڑ رکھے تھے
 کم بخت کی قوت شامہ ہلا کی تیز تھی۔ وہ ٹھیک اس طرف آ رہا تھا۔ جدھر میں درخت کے پیچھے جھاڑیوں
 میں چھپا ہوا تھا۔ اب میں گھبرا گیا۔ اگر میں نے گولی چلا دی تو اس کے دھمکے سے سارا جنگل گونج
 اٹھے گا۔ یہ وحشی تو مرجلے گا۔ مگر باقی سارے وحشی بیدار ہو جائیں گے۔ پھر نہ تو فرانی ڈے
 ہی یہاں سے نکل سکے گا اور نہ میں بچ کر جاسکوں گا۔ آدم غور میری طرف برابر چلا آ رہا تھا۔
 عین جب وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر رہ گیا۔ تو میں نے جیب سے سکے کی ایک خالی
 گولی نکال کر اس کے سر کے اوپر سے پیچھے پھینک دی۔ سکے کی گولی اس کے عقب میں پتوں پر
 گہری تو وہ چونک کر پیچھے گھوما۔ بس میرے حملہ کرنے کا یہی نازک اور سنہری وقت تھا۔ میں
 بجلی ایسی تیزی کے ساتھ درخت کے پیچھے سے نکلا اور دوسرے لمحے چڑے کی رسی اس وحشی آدم
 کی گردن میں بڑی طرح سے کسی جارہی تھی۔ وہ پوری طاقت سے اپنی گردن میرے ہاتھوں کی
 گرفت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت جھیلی
 پڑتی گئی۔ چڑے کی رسی اس کی گردن کے سیاہ گوشت میں اندر ہی اندر دھنستی چلی گئی۔ اس
 کی زبان باہر نکل گئی۔ آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں۔ میں نے اسے اس وقت چھوڑا جب وہ
 مرجکا تھا۔

میں گھسیٹ کر اس کی لاش کو جٹان کی اسی کھوہ میں لے گیا۔ جس میں میں نے پناہ لے

”چُپ..... چُپ.....“

دوسرا چپ ہو گیا۔ پہلے آدم غور نے اب کلمے ہوئے سانپ کا بقیہ حصہ بھی اٹھا لیا۔ اور بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ کہ اس نے مجھے درخت پر ٹانگ دیا تھا پھر اس نے سانپ کو منہ میں ڈالا اور شکر قندی کی طرح بڑے شوق سے کھاتا ہوا اپنے ساتھی کے ہمراہ آگے نکل گیا۔

یہ وحشی میری نظروں سے اوجھل ہوئے تو میں چپکے سے درخت پر سے نیچے اتر آیا۔ میرے آدم غوروں کے علاقے میں آگیا تھا۔ یہاں ہر قدم پر کسی نہ کسی وحشی سے واسطہ پڑ جانے کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہا تھا۔ مجھے بہت زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ پھر بھی ہتھ احتیاط میں گرسکتا تھا۔ اتنی احتیاط ہی کر سکتا تھا۔ اب میں غائب تو ہو نہیں سکتا تھا۔ لبر سنبھل سنبھل کر قدم قدم پر دائیں بائیں دیکھتا اس جھونپڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جو رے کے بڑے جھونپڑے کے پیچھے تھی اور جس میں فرائی ڈے قید تھا۔ ایک چھوٹے سے تالاب پر اکڑنے کے کچھ کپے سنگھڑے اکھاڑ کر کھائے اور پانی پیا۔ تازہ دم ہو کر میں تالاب کے اوپر سے چپکے لگتا ہوا سامنے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سچ مچ ایک بانس کا بڑا مضبوط چھوٹا سا جھونپڑا درختوں میں گھرا ہوا ہے جس کے آگے دو نیم برسہ آدم غور وحشی کندھوں پر تیر کمان لٹکائے اور ہاتھ میں چھیرے لئے پہرہ دے رہے ہیں۔

ان میں سے ایک جھونپڑی کے بند دروازے کے بالکل آگے زمین پر بیٹھا تھا۔ اور دوسرا اپنی جگہ پر قریب ہی کھڑا اس سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ہوشیار لومڑی کی طرح دائیں بائیں بھی دیکھ لیتا تھا۔ میں اسی جگہ جہاں کھڑا تھا بیٹھ گیا۔ اور جھاڑیوں میں سے غور سے اس جھونپڑی کو دیکھنے لگا۔ اس کی دیواریں بانس جوڑ کر بنائی گئی تھی اور بڑی مضبوط تھیں ان کو توڑنا بڑا مشکل تھا۔ آدم غور پوری طرح ہوشیار بیٹھے تھے۔ دیبے بھی دن کا وقت تھا اور ان کے سامنے یا اونگھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا چھوٹا دوسرا فرائی ڈے اسی جھونپڑی میں اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہی تھا کہ میں اس سے پچاس قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا اسے آزاد کرانے کے منصوبے پر عمل پیرا تھا

نے سوچا کہ اپنی مخصوص سیٹی بجا کر فرائی ڈے کو اپنی آمد کی اطلاع کر دوں۔ پھر خیال آیا کہ میں کہیں وہ بھی سیٹی نہ بجا دے اور یوں آدم غوروں کو شک پڑ جائے اور وہ میری تلاش ادھر کو آجائیں اور مجھے پھر جنگل میں ادھر ادھر بھاگتے پھرنا پڑے۔ اس سے یہ کہیں بہتر تھا یا خاموشی سے اپنے منصوبے پر عمل کروں اور فرائی ڈے کو اس وقت ہی خبر ہو جب میں کی جھونپڑی میں پہنچ جاؤں۔

فرائی ڈے کی جھونپڑی میں پہنچنے کے لئے ان دونوں پریدار آدم غوروں کو ٹھکانے لگانا بہت درمی تھا۔ ضروری آدم غور رات کو بھی پہرہ دیں گے۔ یا اگر دوسرے وحشی جوان بھی ہوں گے۔ وہ بھی چوکس رہیں گے اور مجھے جھونپڑی کے قریب بھی پھٹکنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میرے پاس اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلحہ موجود تھا۔ مگر میں اس وقت تک ایک گولی بھی نہیں بلانا چاہتا تھا۔ جب تک کہ فرائی ڈے میرے پاس نہ آجائے یا میں اس کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔ بہر حال ایک بات واضح تھی۔ کہ اس حصار کو میں دن کے وقت نہیں بلکہ رات کے وقت ہی توڑ سکتا تھا۔ چنانچہ ہر حالت میں مجھے رات کے اندھیرے کا انتظار کرنا ہی تھا۔ ابھی پہاڑی اسدان باقی تھا اور میں یونہی جنگل میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اپنے ارد گرد درختوں کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک درخت جنگلی بیری کا درخت تھا۔ میں اس درخت پر چڑھ گیا اور اوپر جا کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا شاخوں میں کانٹے بہت تھے مگر میں اتنا سخت جان ہو چکا تھا۔ کہ کانٹے مجھے زیادہ تکلیف نہیں دے سکتے تھے۔ ویسے بھی میرا لباس بکری کی کھال کا بنا ہوا تھا۔

درخت میں چھپے چھپے مجھے سہ پہر ہو گئی۔ بھوک لگی تو میں نے ٹہنیوں پر سے لال لال کپے ہوئے بیر توڑ کر کھلنے شروع کر دیے۔ میں نے ایک دو شاخے سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ اس طرح مجھے کچھ آرام ملا آخر خدا خدا کر کے سورج مشرق کے آسمان میں غروب ہونے لگا۔ دن کی روشنی مدھم ہونا شروع ہو گئی۔ میرے درخت پر ٹوٹے آکر شور مچانے لگے۔ ایک طوطا میرے سر پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے اڑا دیا۔

شاید وہ سرور کو درخت کا کوئی ٹھنڈھ سمجھا تھا۔ اس عرصے میں میری نظریں جھونپڑے کا ہر دس منٹ کے بعد جائزہ لیتی رہی تھیں۔ شام ہوتے ہی پہریدار بدل گئے پہلے آدم غور

شکل سے یہاں پہنچا ہوں اور اکیلا واپس نہیں جاؤں گا۔ بلکہ فرائی ڈے کو ساتھ لے کر جاؤں
وفادار وحشی کو ج میں پڑ گیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے نفروں میں بتایا کہ وہ فرائی ڈے کے
ہم باپ کے وفادار ساتھیوں میں سے ہے۔

”ہم بہت تھوڑے ہیں۔ ہماری طاقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم چاہیں
بھی تو فرائی ڈے کو مکار سردار کے جنگل سے نہیں بچا سکتے۔ میری سمجھ میں نہیں
آتا کہ تم اکیلے اسے اتنے بڑے قبیلے کے درمیان لے کر کیسے نکل سکو گے؟“
میں نے کہا۔

”میں فرائی ڈے کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر کے آیا ہوں۔ یہ دیکھو
..... میرے پاس چھ سات پستول اور ایک بندوق ہے۔ اگر کسی طرح تم مجھے
چھ سات ایسے وفادار ساتھی ملا دو جو بندوق چلانا جانتے ہوں۔ تو میری مشکل
آسان ہو سکتی ہے۔“

وفادار وحشی نے کہا کہ اس جزیرے پر سوائے فرائی ڈے کے اور کوئی بھی اسلحہ استعمال
ناہیں جانتا۔ بلکہ اس نے تو پستول پہلے بار دیکھا تھا۔ میں نے اسے کہا۔
”تو پھر کسی طرح فرائی ڈے کے جھونپڑے تک پہنچنے میں میری مدد
کرو۔ میں سارا دن اسی بیری کے درخت پر ٹنگا رہا ہوں۔“
وفادار وحشی بولا۔

”ماسٹر! میں تمہیں فرائی ڈے کی جھونپڑی تک نہیں بے جا سکتا۔ سردار میرے
بھی ٹکڑے کر کے بھون کر کھا جائے گا۔ ہاں تمہیں اپنی جھونپڑی میں چھپا سکتا ہوں،
جہاں سے تم صبح صبح منہ اندھیرے سمندر کے راستے فرار ہو سکتے ہو۔“

میں نے سوچا کہ اس درخت کی صلیب سے تو نجات ملے گی۔ کوئی خبر نہیں کہ اس ڈرپوک
وفادار کی جھونپڑی میں کسی دلیر وفادار وحشی نے ملاقات ہو جائے جو فرائی ڈے کی جان بچانے
میں میری کچھ مدد کر سکے۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے جنگل کے ایک بے حد گھنے
علاقے میں سے گزار کر ایک چھوٹے سے تالاب کے پاس آ گیا۔ یہ جگہ گھنی بیلوں سے چاروں
طرف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہاں میں نے غیر معمولی سنا محسوس کیا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی

کیلے کے پتوں پر شاید شکر قندی کے کچھ ٹکڑے لے کر جھونپڑی کے اندر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ
خالی تھے۔ شاید وہ فرائی ڈے کو رات کا کھانا دے کر آیا تھا۔ مجھے بیاس محسوس ہوئی۔ میرے
درخت سے ذرا فاصلے ایک تالاب تھا۔ اس تالاب سے میں نے منگھا ڈے توڑ کر کھائے تھے۔
میں نیچے اتر آیا۔ تالاب پر جا کر پانی پیا۔ چھپ چھپ کر واپس آ رہا تھا کہ ایکا ایکا ایک ایک ادھیڑ
عمر کے آدم خور وحشی سے میری آنکھیں چار ہو گئیں۔

میں یہ دیکھ کر کچھ حیران سا رہ گیا۔ کہ مجھے دیکھ کر بجائے چیخنے اور شور مچانے کے وہ آدم خور
ویسے ہی کھڑا مجھے ٹکتا رہا۔ میں نے پستول نکال کر اس کا نشانہ لے لیا۔ میں نے اپنی جان
بچانے کے لئے اس پر گولی چلانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اس آدم خور وحشی نے آہستہ سے کہا۔

”ماسٹر! انگلش ماسٹر!“

میں بھونچکا ہو کر اس کا منہ ٹکٹنے لگا۔ یہ زبان تو فرائی ڈے کی تھی۔ سوائے فرائی ڈے کے
اور کبھی کسی نے مجھے ماسٹر کے لقب سے کیوں پکارا تھا؟ ایک خیال میرے دماغ میں بجلی کی
طرح چمکا۔ فرائی ڈے نے مجھے بتایا تھا کہ اس جزیرے پر اس کے باپ سے ہمدردی رکھنے
والے کچھ وفادار وحشی موجود ہیں۔ مگر ان کی گنتی آٹے میں نمک کے برابر ہے کہیں یہ آدم خور
فرائی ڈے کے باپ کے وفادار ساتھیوں میں سے تو نہیں ہے؟ فرائی ڈے نے اسے کسی نہ
کسی طرح میرے بارے میں ضرور بتا دیا ہو گا کہ میں اس کا ماسٹر ہوں اور میں نے ہی اس کی
جان بچائی تھی میں چونکہ ان کی زبان جانتا تھا۔ اس لئے آگے بڑھ کر اسے کہا۔

”فرائی ڈے کہاں ہے؟ میں انگلش ماسٹر ہوں۔ میں اسے چھڑانے آیا ہوں؟“
وفادار وحشی کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔ وہ بلا خوف و خطر میرے قریب آ گیا
اس کی آنکھیں سرخ تھیں رنگ بے حد کالا تھا اور سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ اس نے گلے
میں جانوروں اور انسانوں کی ہڈیوں کی مالا پہن رکھی تھی۔ میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

”وہ بانس کی جھونپڑی میں قید ہے۔ دو روز بعد اسے سردار اپنے ہاتھ سے ٹکڑے
ٹکڑے کر کے بھون کر کھا جائے گا۔ ماسٹر! بھاگ جاؤ..... سردار تمہاری تلاش
میں ہے۔ وہ تمہیں بھی بھون کر کھا جائے گا۔ بھاگ جاؤ..... بھاگ جاؤ.....“
میں اس وفادار وحشی کو کھینچ کر ایک جھاڑی کے پیچھے لے گیا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں

ہوئی تھی۔ تالاب کے کنارے ذرا پرے ہٹ کر کیلے کے درختوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی گھاس پھوس کی جھونپڑی بنی تھی۔ وفادار وحشی مجھے اس جھونپڑی میں لے آیا۔ یہاں اس نے مجھے تالاب کا پانی پلایا اور کھانے کو زرد رنگ کے کیلوں کا گچھا سامنے رکھ دیا۔ مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ میں کیلے کھانے لگا۔ وہ مجھے جھونپڑی کے اندھیرے میں اپنی چمک دار لال لال آنکھوں سے متکارتا رہا۔ کسی وقت مجھے خدشہ مجھے محسوس ہوتا کہ کہیں میں کسی حال میں تو نہیں پھنس گیا۔ پھر اپنے اسلحہ کا خیال کر کے دل کو حوصلہ دیتا کہ اگر مر بھی گیا تو کم از کم دس بارہ آدم خوروں کو مار کر مردن گا۔ جھونپڑی میں ایک عجیب قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ انسانی خون کی بو تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کیا وہ بھی انسانوں کا گوشت کھاتا ہے؟ اس کا اس وحشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس مجھے اندھیرے میں ٹٹکی باندھتے متکارتا رہا۔

باہر کچھ آہٹ ہوئی اس نے جلدی سے مجھے کونے میں چھپا دیا اور خود اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر وہ باہر کسی سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے لیا۔ میں ہر خطرے کے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے باہر آدم خوروں کی صرف سیٹیوں ایسی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں لفظ ایک بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آوازیں آئی بند ہو گئیں۔ وہ اندر آ کر کونے میں میرے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں وہ مجھے ایک چھوٹا سا کالا بھوت معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پستول اس کی کھوپڑی کے ساتھ لگا کر کہا کہ اگر اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو چاہے میری جان چلی جائے مگر میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے میرے گھٹنے پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھ کر مجھے ایک بار اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ فرائی ڈے کے باپ کا دوست ہے وہ مرحوم کا وفادار ساتھی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ باہر وہ کس سے باتیں کر رہا تھا؟ اس نے کہا۔

”مامسٹر! اسار قبیلہ تمہاری تلاش میں ہے۔ سردار کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ تم جزیرے میں پہنچ گئے ہو۔ اس نے فرائی ڈے پر نگرانی سخت کر دی ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا کہ میری کشتی تو نہیں پکڑ لی گئی؟ اس کا جواب اس نے نفی میں دیا اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے کشتی کس جگہ چھپا کر رکھی ہے؟ میں نے اسے بتانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے فرائی ڈے کے پاس لے چلے یا اسے جا کر اطلاع کر دے کہ میں

”مامسٹر! میں فرائی ڈے سے نہیں مل سکا۔ پہریداروں کو شک پڑ جاتا۔“

میں نے اس سے پوچھا کہ پہریدار کیا کر رہے ہیں؟ اس نے بتایا کہ پہریدار بہت چوکس ہیں۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ وقت گذر رہا تھا۔ یہ وقت بڑا قیمتی تھا۔ اب میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کشتی کے بارے میں میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کا خیال ہے کہ میری کشتی آدم خوروں کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ میں نے جس چٹان کے نیچے کشتی چھپائی تھی، ادھر کوئی نہیں گیا تھا۔ مجھے اس سے بڑا حوصلہ ہوا۔ اگر کشتی بھی ان کے پاس چلی جاتی تو مجھے وہاں سے فرار ہونے میں بہت دقت پیش آ سکتی تھی اب میں ایک

لے بغیر دوسرا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا اور رسی کے شکنجے سے
 لپکنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اس میں
 باب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ میری گرفت بے حد مضبوط تھی۔ وہ دو منٹ کے اندر
 مر گیا۔

اس کی لاش کو گھسیٹ کر میں جھاڑیوں میں لے گیا۔ اتنے میں مجھے دوسرا پہریدار بھی
 دکھائی دیا۔ وفادار وحشی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔
 ہم غور اپنے ساتھی کو آوازیں دیتا اور ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ میں خاموش ہو کر جھاڑیوں
 میں دبکا رہا۔ اپنے ساتھی کو نہ پا کر آدم خور پہرے دار کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس نے کمان
 بن تیر چڑھایا اور جھک کر آگے بڑھنے لگا۔ شاید اس نے خطرے کی بوسونگھ لی تھی۔ کیونکہ اس
 بات کا تو انہیں علم ہو گیا تھا۔ کہ ان کا دشمن جزیرے پر آچکا ہے۔ کم بخت وہ سیدھا ان جھاڑیوں
 کی طرف آ رہا تھا۔ جن کے پیچھے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ادھر میں بھی تیار ہو گیا۔ میری تیاری بڑی
 فیصلہ کن تھی۔ کیونکہ میں تو اس کو جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ سوائے اس کے میرے لئے
 اور کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ یہ بات درست نہیں تھا۔ اس
 طرح سے میرا بھانڈا بھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح سے اس کی
 پشت میری طرف ہوتا کہ میں پیچھے سے اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر سکوں لیکن وہ مور
 کی طرح بالکل ناک کی سیدھ میں چلا آ رہا تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ پھر میں نے
 اپنی وہی پرانی چال چلی۔ تھیلی میں سے چپکے سے لوہے کی ایک گولی نکالی اور اس کو اچھال
 کر آدم خور کے پیچھے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ آدم خور اچھل کر کسی خرگوش کی طرح پیچھے
 گھوما۔ جونہی وہ مڑا میں تیزی کے ساتھ جھاڑیوں میں سے باہر نکلا اور میں نے پوری طاقت
 سے پستول کا بھاری لوہے کا دستہ اس کے سر کے پیچھے گدی پر دے مارا۔ وہ اوندھے منہ گر
 پڑا۔ میں نے دوسری بار اسی شدت سے پھر وار کیا۔ آدم خور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس
 کے گلے میں پھنڈا ڈال کر اسے بھی جہنم میں پہنچا دیا۔
 میرے سامنے میدان صاف تھا۔ میں بھاگ کر جھونپڑی کے پاس گیا۔ اسی کے بانس
 کے دروازے کو زور سے لات مار کر چوڑے کھول دیا۔

نئے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ اگر کسی طرح سے میں اس قبیلے کے سردار کو یہ خیال بنالوں تو اس
 کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر فرائی ڈے کو اس جزیرے سے نکال سکتا ہوں۔ اس
 میں دو باتیں تھیں۔ پہلی بات جیسا کہ وحشی نے بتایا، سردار کی جھونپڑی کے باہر بے حد
 سخت پہرہ تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہو سکتا تھا۔ یہ پاگل آدم خور سردار کی زندگی کی بھ
 پرواہ نہ کریں اور مجھ پر حملہ کر بیٹھیں۔ ایسی صورت میں فرائی ڈے اور میری دونوں
 کی موت یقینی تھی۔ آخر میں نے فرائی ڈے کی جھونپڑی پر ہی حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور
 وحشی سے کہا کہ کم از کم وہ ایک کام کرے کہ وہاں جا کر پہریداروں کو باتوں میں لگائے یا ایک پہریدار
 کو کسی بہانے دوسری طرف سے لے جائے۔ پہلے تو وہ کچھ گھبرا گیا لیکن جب میں نے اُسے بتایا کہ
 اس کی بخبری کوئی نہیں کرے گا۔ کیونکہ میں دونوں پہریداروں کو جان سے مار ڈالوں گا۔
 تو وہ راضی ہو گیا۔ اس کے بعد ہم دونوں جھونپڑی سے باہر آ گئے۔

رات بڑی خاموش اور سسنان تھی۔ ہوا میں خشکی تھی۔ درختوں پر پرندے سو رہے
 تھے۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ایک ٹیکری کی اوٹ میں
 جا کر ہم رک گئے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر فرائی ڈے کی جھونپڑی سامنے نظر آ رہی تھی۔
 وہ مجھے اسی جگہ کھڑا کر کے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ پہریداروں میں سے
 ایک پہریدار کو باتوں میں لگائے ایک طرف چلا گیا ہے۔ یہ میرے حملہ کرنے کا وقت تھا میں
 دبے پاؤں اٹھا تا زین پر بھجھا جا بھکا اس کے عقب سے آگے بڑھنے لگا۔ میں بڑی احتیاط اور
 ہوشیاری کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ گھاس گیلی تھی جس کی وجہ سے کوئی آہٹ تک پیدا نہیں
 ہو رہی تھی۔ چڑے کی رسی میرے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ اور میں اسے مروڑ رہا تھا۔ میرے
 لئے امید کی کرن ہی ایک رسی تھی۔ درخت کے پیچھے جا کر میں رک گیا۔

آدم خور پہریدار شاید یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا کہ اپنے ساتھی کو دیکھے وہ
 کہاں چلا گیا ہے۔ یہ بڑی خطرناک گھڑی تھی۔ اگر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو مقابلہ آئے سامنے
 کا ہو جائے گا۔ میں یقیناً اس پر پستول چلا دوں گا۔ اور جزیرے کے سارے آدم خور وہاں
 آ کر میری تکابوئی کر دیں گے۔ میں نے آدم خور کو اٹھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ پلک جھپکنے میں
 چڑے کی رسی اس کی گردن میں ڈال کر اسے اس بری طرح سے کس دیا کہ آدم خور آواز

» فرائی ڈسے۔ «

میں نے آواز دی۔ فرائی ڈسے کو نے میں پڑا تھا۔ شاید وہ جاگ رہا تھا۔ میری آواز سن کر لپک کر دروازے میں آگیا اور میرے پاؤں پر گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھا کر سیٹے سے لگایا اور کہا۔

» جلدی سے بھاگ چلو..... جلدی کرو۔ «

ہم وہاں سے منہ اٹھا کر اندازاً سمندر کی طرف اٹھ دوڑے۔ مجھے سمت کا صحیح اندازہ اس لئے تھا۔ کہیں ستاروں کی رہنمائی میں چل رہا تھا۔ ہم دونوں رات کے اندھیرے میں جنگل میں بھاگے جا رہے تھے۔ کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ اچانک درخت پر سے ایک وحشی آدم خور چھلانگ لگا کر ہمارے سامنے پھراتا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے فرائی ڈسے کو پچھا لیا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں چیخ کر کہا کہ وہ دونوں کو ہلاک کر دے گا۔ میرے لئے پستول نکال کر اس پر فائر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ گولی چلتے کے دھماکے کی آواز سے سارا جنگل ایک دم گونج اٹھا۔ وحشی آدم خور چیخ مار کر گر پڑا۔ شاید اس نے چیخ اپنے دوسرے ساتھیوں کو خبردار کرنے کے لئے ماری تھی۔ کیونکہ یہ بڑی ہی بھیانک چیخ تھی ہم گھبرا کر وہاں سے بھاگے ہی تھے کہ جزیرے میں آدم خوروں کی چیخیں گونجنے لگیں۔ وہ ہمارے طرف بھاگے آ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے دو پستول فرائی ڈسے کو بھی تھما دیئے۔ ہم منہ اٹھائے دوڑے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ٹاپوں میں الجھ رہے تھے۔ اب سارا ہمیں سمندر کا کنارہ دکھائی دینے لگا ہم جنگل سے باہر نکل آئے۔ یہاں صبح ہونے کی پہرہ نیلی نیلی روشنی کا بخار سا پھیلا ہوا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ میں صبح سمت پر آیا تھا۔ سا۔ وہی بھوری چٹان تھی جس کے پنجے میں نے اپنی کشتی چھپا رکھی تھی۔

جوہنی ہم چٹان کی طرف بڑھے دس بارہ آدم خور ہمارے سامنے آگئے۔ انہوں نے ہاتھ تیروں کی باڑ ماری۔ ہم بچ گئے ہم نے فوراً ایک ہی وقت میں چاروں پستول چلا دیئے۔ آگ لگنے سے تین آدم خور ریت پر گر کر تر پنے لگے۔ میں نے پستول بھر کر دوبار فائر کیا۔ ایک آ پرے ہٹ گئے ہم بھاگ کر چٹان کے پاس آگئے۔ اب وہاں سینکڑوں ننگ دھڑنگ آدم خور جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب ہم پر شور مچاتے وحشتانہ انداز میں تیروں کی بارش کر رہے

۷۔ ہم چٹان کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئے اور فائرنگ کرنے لگے۔ میں نے بندوق بھر کر چلائی روع کر دی۔ بندوق کے پھروں نے کتنے ہی آدم خوروں کو شدید زخمی کر دیا مگر وہ بڑے دیر تھے اب قدم پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے۔ وہ برابر آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ میں اور فرائی ڈسے ایک بعد دیکر سے ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ بہت سے آدم خور مر چکے تھے۔ مشرق کی طرف سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ چاروں طرف دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ روشنی میں دیکھا کہ جگہ جگہ آدم خوروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ زخمی ہو چکے تھے۔ اور رینگ رہے تھے، ان کے پیچھے وحشیوں کی ایک اور قطار تیر کمان لئے ہم پر حملے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ گویا ایک باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی تھی۔ میں نے فرائی ڈسے سے کہا کشتی میں سوار ہونے کی کوشش کرو۔ کشتی ہمارے نیچے پھروں کے درمیان پانی میں سمندری لہروں پر ہلچولے کھا رہی تھی۔ فرائی ڈسے کھسکتا ہوا کشتی میں جا پہنچا۔ میں نے وحشیوں پر بندوق اور پستول سے دو فائر کئے۔

دو آدم خور گر پڑے۔ اب بھی فائرنگ کرتا ہوا پیچھے کشتی کی طرف کھسکنے لگا۔ فرائی ڈسے کشتی کو کھول کر چٹانوں سے نکال کر سمندر کے کنارے لے آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دوسری طرف سے آدم خوروں کی ایک جماعت بھی کشتیوں میں سوار ہو رہی تھی۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ہم کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے کی کوشش میں ہیں۔ فرائی ڈسے نے مجھے زور سے آواز دی کہ ماسٹر کشتی میں آ جاؤ۔ میں فائر کرتا ہوا پیچھے کو بھاگا اور کشتی میں چھلانگ لگا کر سوار ہو گیا۔ میرے سوار ہوتے ہی فرائی ڈسے نے تیزی کے ساتھ چوچلائے شروع کر دیئے۔ ہماری کشتی چٹان کی اوٹ سے نکل کر کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگی۔ اب ہم دشمنوں کے بالکل سامنے تھے۔ ہم پستیلوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ہماری کشتی بڑی تیزی سے جزیرے کو پیچھے چھوڑ رہی تھی۔ آدم خور وحشی بھی کشتیوں میں سوار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ فرائی ڈسے چوچلا رہا تھا آدم خوروں کی کشتیاں ہمارے قریب آ رہی تھیں۔ ان کی رفتار تیز تھی کیونکہ ایک ایک کشتی کو چار چار آدمی چلا رہے تھے۔ میں نے فرائی ڈسے سے کہا کہ چوچھوڑ کر میرے ساتھ فائرنگ شروع کرو۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے آدم خوروں سے

نپٹ لیا جائے۔ کیونکہ رفتار میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ چند لمحوں میں وہ ہمارے سر پہنچ جائیں۔

فرائی ڈسے نے میرے حکم کے مطابق چپو چھوڑ کر پستول منہال لئے۔ وہ بھی میرے ساتھ مل کر فائرنگ کرنے لگا۔ آدم خوروں کی چاروں کشتیاں ہماری سیدھ میں آگئی تھیں وہ بے تحاشہ کوئی خطرہ محسوس کئے بغیر ہماری طرف بڑھ رہے تھے ہم نے ایک کشتی کا نشانہ باندھ کر گولیوں کی بارڈھ ماری۔ تین آدم خور جو جہاز مار کر کشتی میں گر پڑے۔ ایک تڑپ کر سمندر میں گر گیا۔ دوسری کشتی کے آدم خور ہماری طرف بڑھے۔ ہم نے دوبارہ پستول بھر کر ان پر گولیاں چلائیں۔ دو اس کشتی میں سے بھی ہم پر پھینکیے۔ ایک نیزہ سیدھا آکر گڑ گیا۔ فرائی ڈسے نے دونوں پستولوں کے فائر جھونک دیئے ان میں ایک کار گر ہوا اور ایک آدم خور ڈھیر ہو گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے بندوق کا فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک اور آدم خور خون لت پت ہو کر سمندر میں گر پڑا۔ اب صرف دو آدم خور الگ الگ کشتیوں میں رہ گئے تھے۔ اتنے میں ہم نے کنارے پر سے چار اور دشمنوں کی کشتیاں تازہ دم کھینچ لے کر ہمارے مقابلے کو چل نکلیں۔ میں نے فرائی ڈسے سے کہا۔ کہ چپو چلانے شروع کر دو۔ ہماری کشتی اب سمندر میں آگے بڑھنے لگی۔ میں برابر گولیاں برسار رہا تھا۔ دو میں سے ایک اور آدم خور مر گیا۔

میری اندھا دھند فائرنگ سے آدم خوروں کی پھلی تازہ دم کھینچ کر مزید آگے بڑھنے کی جرات نہ ہوئی۔ اب میں نے بھی ایک چپو منہال لیا۔ اور بڑی تیزی سے سمندر میں کشتی چلانے لگے۔ ہماری کشتی پر سکون سمندر میں جزیرے کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ آدم خوروں کے تیراب سمندر میں گر رہے تھے۔ ہم آگے نکل آئے۔ وحشی لوگ پیچھے رہ گئے۔ اس لئے کہ وہ ہماری گولیاں سے ڈر گئے تھے۔ اور اب آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آدم خور جزیرہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور دوسری جانب ہمیں اپنے جزیرے کے درخت نظر آنے لگے۔ ہمارے دل مسرت سے لبریز تھے۔ مجھے خاص طور پر بہت خوشی ہو رہی تھی۔ کیونکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور میں نے فرائی ڈسے کو موت

نے منہ سے بچا لیا تھا۔ اپنے جزیرے پر پہنچ کر ہم نے کشتی کو گھسیٹ کر ساحل کی جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ فرائی ڈسے نے کہا۔

”ماسٹر! وہ لوگ شاید پھر کوئی بڑا حملہ کریں۔ اس لئے میرا خیال ہے۔ کہ

ہمیں اپنی کشتی کو جزیرے کے جنوبی ساحل پر چھپا دینا چاہیے۔“

فرائی ڈسے کا خیال بڑا مناسب تھا۔ ہم کشتی میں بیٹھ کر اسے کھیتے ہوئے جزیرے کے جنوبی ساحل کی طرف لے گئے اور اسے ساحل کی جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ یہاں سے ہم سیدھا اپنے کین میں آگے۔ میں تو بے حد تھک گیا تھا۔ یہی حال فرائی ڈسے کا تھا۔ فرائی ڈسے طوطے اور کتے کے لئے روٹی پکانے لگا۔ میں تخت پوش پر سونے کے لئے لیٹ گیا طوطا اور کتا میرے ساتھ لگ کر مجھے پیار کرنے لگے۔ طوطا بار بار ٹیٹیں ٹیٹیں کرتا میرے کندھے پر بھڑ بھڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آگئی۔ میں ایسے گھوڑے بیچ کر سویا کہ شام کو آنکھ کھلی۔ شام کو ہم ساحل کی نگرانی کرنے لگے۔ ہمیں ڈر تھا کہ دشمن حملہ کرے گا۔ بہر حال ہم تیار تھے۔ رات کو میں نے آدھی رات تک پہرہ دیا اور پھر سو گیا۔

اگلے روز اٹھ کر میں نے فرائی ڈسے کو ساتھ لیا اور جنوبی ساحل پر جا کر اپنی کشتی کو دیکھا۔ وہ اسی طرح موجود تھی۔ ہم نے کشتی میں سوار ہو کر سارے جزیرے کے ساحل کا ایک چکر لگایا حالات بالکل معمول پر تھے۔ سمندر پر دور دور تک کسی دشمن کا نشانہ تک نہ تھا۔ واپس آکر ہم اپنی کشتی بنانے میں مصروف ہو گئے اب مجھے فرائی ڈسے نے اپنے اغوا کا مختصر سا قصہ سنایا۔ اور وہ یوں تھا کہ فرائی ڈسے حسب عادت کشتی بنانے میں محو تھا کہ پیچھے سے آدم خوروں نے آکر اس کے منہ میں گھاس کا گولا ٹھونس کر اسے ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا کر لے گئے۔

”ماسٹر! میرے دل میں ایک خیال ضرور آتا تھا۔ کہ شاید آپ مجھے

بچانے آئیں۔ پھر سوچا کہ آپ تو کبھی پہلے اس جزیرے پر نہیں آئے۔ میں ایک طرح سے اپنی زندگی سے نا اُمید ہو گیا تھا۔ میں ان لوگوں کی قید میں تھا جو میرے خاندان کی جان کے دشمن تھے۔ وہ مجھے کھانے کو دو وقت شکر قیدی دیتے تھے جسے میں زہر مار کر لیا کرتا تھا۔ مجھے اندھیرے جھونپڑے میں ماسٹر تم بہت یاد آتے تھے

اگر تم میری مدد نہ کرتے ماسٹر! تو وہ لوگ میری تکا بونی کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے۔ ہمیں ان کے دوسرے حملے کے لئے ابھی سے تیاری کرنی چاہیے۔“

فرانی ڈسے نے کہا۔ ”ہاں ماسٹر! یہ بہت ضروری ہے۔ وہ آئیں یا نہ آئیں۔ لیکن ہمیں ان کے حملے کا جواب دینے اور اسے روکنے کے لئے ابھی سے بندوبست کر لینا چاہیے۔“

ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ رات کو باری باری کہیں کے اندر مورچہ بنا کر پہرہ دیا کریں۔ بارود کی ایک پوری پوری ابھی ہمارے پاس تھی۔ اسی طرح سے لوہے کی گولیاں بھی ایک تھیلے میں بھری پڑی تھیں۔ یہ وہ اسلحہ اور بارود تھا۔ جو میں ہمت کر کے اپنے ڈوبتے جہاز سے اٹھا لایا تھا۔ اور جسے میں نے بچا بچا کر رکھا ہوا تھا۔ اس واقعے کے سات روز بعد میرا پیارا اور وفادار کتا مر گیا۔ مجھے اس کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ وہ فیصلے بھی اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ اور کہیں میں ایک طرف بیٹھا بھی زبان نکالے بانہتے ہوئے مجھے دیکھتا رہتا تھا۔ ہم نے صلیب والی پہاڑی کے اوپر اس کو ایک قبر میں دفن کر دیا۔ میں نے اس کی قبر پر ایک تختی لگا دی جس پر لکھا تھا۔

”میرا وفادار کتا۔“

دوسرے ہفتے طوفا بھی مر گیا۔ یہ ایک اور صدمہ تھا۔ جو میرے دل پر گزرا۔ خدا جانے قدرت مجھے کیا دن دکھانے چاہتی تھی کہ اوپر تلے یہ دو دردناک وارداتیں گزر گئیں میں نے کتے کے ساتھ ہی پہاڑی پر طوطے کی بھی ایک قبر بنا کر اس پر اس کے نام کی تختی کھود کر لگا دی۔ اسی طرح پندرہ بیس روز گزر گئے۔ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ فرانی ڈسے کہنے لگا۔

”ماسٹر! میرے قبیلے کے لوگ ضرور تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ مجھے کسی قیمت پر معاف نہیں کریں گے۔ وہ مجھے ہر حالت میں اغوا کر کے لے جانے آئیں گے۔ یہ ان کے دیوتا کی بھی تو مین ہوئی ہے۔ جب تک وہ دیوتا کو خوش نہیں کریں گے، وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”فرانی ڈسے! اگر وہ آتے ہیں تو آنے دو۔“

فرانی ڈسے بولا۔ ”لیکن ماسٹر! اس بار وہ زیادہ فوج لے کر آئیں گے۔ ہم دو آدمی شاید ان کے لشکر کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”فرانی ڈسے! ہم اس جزیرے پر صرف دو انسان ہیں۔ ہم دونوں کو ہی اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہماری مدد کے لئے باہر سے کوئی فوج نہیں آ سکتی۔ اس لئے ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔“

فرانی ڈسے کچھ پریشان تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی پریشانی بے جا نہیں تھی وہ اپنے قبیلے والوں کے بارے میں بڑے صحیح خدشات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس بات کے تیسرے دن میں اور فرانی ڈسے سمندر کے کنارے ٹھہل بھی رہے تھے اور دیکھ بھال بھی کر رہے تھے کہ ہم نے دور ساحل کی ریت پر کسی شے کو پڑے دیکھا۔ میں نے جھٹ دوڑ بین لگائی اور پھر فرانی ڈسے سے کہا۔

”جلدی چلو فرانی ڈسے۔ مجھے یہ کوئی توپ معلوم ہو رہی ہے۔“

ہم بھاگتے ہوئے اس مقام تک آئے۔ وہ سچ سچ ایک درمیانے سائز کی بڑی توپ تھی ایسی توپیں جنگی جہازوں کے عرشے پر لگی ہوتی ہیں۔ وہ ایک مکڑی کے تختے پر جڑی ہوئی تھی اور ایک پہلو پر بڑی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر اسے سیدھا کیا۔ وہ بہت وزنی توپ تھی۔ فرانی ڈسے نے پوچھا۔

”ماسٹر! یہ کیا ہے؟“

اس نے آج تک توپ نہیں دیکھی تھی۔ وہ اسے بڑی حیرانی سے اوپر نیچے تک رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اسے توپ کہتے ہیں۔ اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے۔ کہ اگر اسے دشمن کی طرف منہ کر کے چلا جائے تو ایک ہی گولے سے کتے ہی آدمیوں کے پرچے اڑا سکتی ہے۔ میرے اتنا بتانے پر فرانی ڈسے بڑا خوش ہوا اور ناپچنے لگا۔ بولا۔

”ماسٹر! دیوتا ہم پر مہربان ہیں۔ انہوں نے دشمن سے مقابلہ کے لئے یہ توپ بھیج دی ہے۔ آؤ اسے کہیں کے باہر لے جا کر لگا دیں۔“

میں نے کہا۔ ”فرانی ڈسے! ہمیں خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے عین اس وقت ہماری

مدد کی جب کہ ہمیں اس کی مدد کی شدید ضرورت تھی۔“

میرا خیال ہے کہ یہ توپ اس جنگی جہاز کی توپ تھی جیسے بحری ڈاکوؤں نے سمندر میں غرق کر دیا تھا۔ توپ چونکہ لکڑی کے ایک موٹے تختے پر لگی تھی۔ اس لئے کسی تیز لہر کے ساتھ ابھر کر سطح سمندر پر آگئی اور وہاں سے سمندر کی موجیں اسے ہٹا کر کنارے پر پھینک گئیں۔ اب سوال توپ کو کہیں تک لے جانے کا تھا۔ ہمارا کہیں وہاں سے سو ڈیڑھ سو گز اندر جنگل کے کنارے پر تھا۔ توپ اتنی بھاری تھی کہ ہم اسے اٹھا کر نہ لے جاسکتے تھے۔ ہاں اسے گھسیٹ کر لے جاسکتے تھے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اس کے نیچے کسی درخت کے تنے کو ڈال دیا جائے۔ میں نے فرانی ڈسے کو یہ ترکیب بتائی۔ ہم کلبھاڑے لے کر ایک درخت کو کاٹنے لگے درخت کو کاٹ کر ہم لڑھکاتے ہوئے اسے توپ تک لائے۔ بڑی مشکل سے توپ کے تختے کو درخت کے تنے کے اوپر رکھا۔ ہم نے تنے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یوں ہم توپ کو خشک کر کے پونچھنا شروع کر دیا۔ دوپہر تک ہم توپ کو صاف کرتے رہے۔ دوپہر کے بعد وہ خوب چمکنے لگی۔ میں نے فرانی ڈسے سے کہا۔

”فرانی ڈسے! اگر اس کا رخ ایک طرف کو یعنی سمندر ہی کی طرف رہا تو ہو سکتا

ہے۔ دشمن دوسری طرف سے حملہ کر دے۔ ایسی صورت میں یہ توپ

بیکار ہو جائے گی۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اسے اس انداز سے یہاں

رکھا جائے کہ اس کا رخ تینوں طرف کو گھمایا جاسکے۔“

فرانی ڈسے نے کہا۔ ”ماسٹر! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

بے چارے فرانی ڈسے کا دماغ اتنا زیادہ تیز نہیں تھا۔ میں نے اس پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ میں نے آخر اس کا حل تلاش کر لیا۔ میں نے اسی وقت فرانی سے کہا۔

”فرانی ڈسے بکری کی جتنی خشک کھالیں سٹور میں پڑی ہیں انہیں کاٹ کر اور

جوڑ کر ایک لمبا رسہ تیار کر دو۔“

فرانی ڈسے نے حیرانی سے پوچھا۔

”ماسٹر! چڑے کا رسہ کس لئے؟“

”تم بکری کی ساری کھالیں کلبھاڑی سمیت باہر لے آؤ۔“

فرانی ڈسے اسی وقت کہیں کے اندر گیا۔ اور بکری کی جتنی کھالیں پڑی تھیں، کندھے پر ڈال کر باہر لے آیا۔ ہم نے ساری کھالوں کو لمبے رخ سے کاٹ کر اس کے لمبے اور چوڑے تیار کر لئے۔ پھر انہیں آپس میں جوڑ دیا اور مردہ کر ایک لمبہ رسہ تیار کر لیا۔ اس رسے میں نے فرانی ڈسے کی مدد سے توپ کے دونوں پہیوں کے درمیان میں ڈالا اور پھر اس کو اوپر درخت کے مضبوط ٹہنے سے جاکر باندھ دیا۔ اس کے بعد میں نے اسے دونوں طرف سے لکڑی ڈال کر بل دینا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ توپ زمین سے دو فٹ اوپر اٹھ آئی اور فضا میں جھولنے لگی۔ اب ہم جس طرف چاہیں توپ کو گھما سکتے تھے۔

”ماسٹر! فرانی ڈسے خوش ہو کر بولا۔ ”یہ تو کمال ہو گیا ہے۔ اب دشمن جدم

سے بھی آئے ہماری توپ کی زد میں ہوگا۔“

اور اس میں شک بھی کوئی نہیں تھا۔ توپ گویا اب ایک جھولے میں پڑی تھی۔ اور بڑی آسانی سے اگے پیچھے اور دائیں بائیں مڑ سکتی تھی۔

”فرانی ڈسے اب ایسا کرو کہ اندر کہیں سے بارود کی بوری اور لوہے کی

چھوٹی بڑی گولیاں کی بوری اٹھا کر یہاں لے آؤ۔“

فرانی ڈسے بارود اور لوہے کی گولیوں کی دونوں بوریاں کہیں سے اٹھا کر باہر لے آیا۔

م نے توپ کے پاس ہی گڑھا کھود کر دونوں بوریوں کو اس میں ڈال کر اوپر جھاریاں ڈال

کر انہیں چھپا دیا۔ میں نے احتیاط کچھ پتھر بھی اٹھا کر ان کا وہاں ڈھیر لگا دیا کہ اگر دشمن سے

مقابلے کے دوران گولیاں ختم ہو جائیں تو توپ کے اندر پتھر ڈال کر بھی حملہ کیا جاسکے۔ میں

دل ہی دل میں نہیں رہا تھا کہ بھلا اتنا لمبا چوڑا بندوبست کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے

خیال میں آدم خور اول تو ادھر آتے ہی نہ اور اگر آئے بھی تو تھوڑے بہت رات کو چھپ کر

آئیں گے۔ رات کے لئے ہم نے باری باری ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ پہلی رات فرانی ڈسے پہرہ دیتا

اور پچھلی رات میں پہرہ دیتا۔

اسی طرح پندرہ دن اور گزر گئے۔ کسی آدم خوروں کے لشکر نے ہمارے جزیرے پر حملہ

نہ کیا۔ میں نے رات کو پہرہ دینا چھوڑ دیا۔ فرانی ڈسے نے بہت کہا۔ کہ کہیں وہ لوگ نہ آجائیں

ن کا منہ ہوسے کی چھوٹی بڑی گولیاں سے بھر دیا۔ جتنا قے پتھر سے ایک طرف آگ لگا کر
بخنوں کی شاخیں اس پر ڈال دیں۔ اب ہم دشمن کے خیر مقدم کے لئے پوری طرح تیار تھے
رائی ڈسے توپ کے اوپر چڑھ کر کھڑا تھا۔ میں نے اُسے پر سے ہٹا کر کھڑا کر دیا۔ اور اسے بتایا
کہ جب میں توپ کو آگ دکھاؤں تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر زمین پر بیٹھ جائے۔
میں نے بھی اپنے کانوں میں بکری کی اون کے پھلے ٹھونس لئے تھے۔

دشمن اب جزیرے کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ان کی کشتیاں ساحل کی ریت پر آکر رک گئی
تھیں اور سارے کے سارے کشتیوں سے اتر کر ترکمان تیار کئے ہمارے کین کی طرف بڑھ
رہے تھے ایک آدم خور جو ان کا سردار تھا۔ نیزہ ہاتھ میں لیے سر پر کسی جانور کی سری باندھے
آگے آگے آ رہا تھا۔ وہ اپنے اپنے جنگی نعرے لگا رہے ہیں۔ فرانی ڈسے نے کہا کہ یہ آگے
سردار رہے اور یہ وہ نعرے لگا رہے ہیں۔ جو دیوتا کے لئے جنگ کرنے جاتے ہوئے لگاتے
ہیں۔ گویا ایک طرح سے وہ مذہبی جنگ کرنے آ رہے تھے۔ میں نے توپ کو بالکل تیار کر رکھا
تھا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ وہ توپ کی زد میں آجائیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی
ہیں تھا کہ کین کے پاس ایک بھیاںک آفت ان کی راہ دیکھ رہی ہے۔ وہ نیزے لہراتے نعرے
لگاتے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ جب
میرے کین اور سمندر کے ساحل کے درمیان آدھا فاصلہ رہ گیا تو انہوں نے میرے کین پر
تیروں کی پہلی باڑھ ماری۔

ایک بوچھاڑی میرے کین کی دیوار سے آکر ٹکرائی گئی۔ ہم زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ فرانی ڈسے
گھبرا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”ماسٹر! دشمن سر پر آ گیا ہے۔ اس توپ کو جلا دیں۔“

”تم خاموش رہو فرانی ڈسے! میں زیادہ بہتر جانتا ہوں کہ توپ کو کب چلانا ہے۔“

میں دور بین لگائے دشمن کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جموں پر لال لال رنگ کی تکیریں ڈالے
خونخوار چہرے لئے ہماری تکا بوٹی کرنے آگے بڑھ رہے تھے میں نے دور بین آنکھوں سے
ہٹائی۔ کیونکہ دور بین سے ان کے اور توپ کے درمیان درست فاصلے کا اندازہ نہیں
ہو رہا تھا۔ اب وہ بہت قریب آ گئے تھے۔ فرانی ڈسے تو دوڑ کر کین کے پیچھے بھاگ گیا۔ اب

اور غفلت میں ہماری توپ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ مگر میں نے کہا کہ وہ آئیں گے تو دیکھا
جائے گا۔ دراصل میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ آدم خور ایک بہت بڑا آخری حملہ
کرنے کی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ جس قدر زبردست انہوں نے حملہ کیا اگر ہمارے
پاس توپ نہ ہوتی تو ہم زندہ نہیں بچ سکتے تھے۔ یہ حملہ اچانک ہوا۔ اس دن آسمان پر
بادل چھلنے ہوئے تھے۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ میں اپنی عادت کے مطابق صلیب والی پہاڑی پر
دور بین لے کر گیا تاکہ دور سمندریں کسی جہاز کو دیکھ سکوں۔ جہاز تو اب کبھی کوئی نظر نہیں
آتا تھا۔ آج بھی سمندر دور تک ویران اور خالی تھا۔ کوئی جہاز نہیں تھا۔

میں نے دور بین گلے میں ڈالی اور پہاڑی پر سے اتر کر نیچے آ گیا۔ شام ہو رہی تھی ابھی
آسمان پر دن کی کافی روشنی تھی۔ سمندریں دن کی روشنی بہت دیر تک رہتی ہے۔ آدم
خوروں کا خیال تھا کہ اور بالکل ٹھیک خیال تھا کہ زیادہ تعداد لے کر جائیں گے۔ اور
فتح حاصل کر لیں گے۔ خواہ دن کی روشنی میں جائیں۔ خدا لگتی کہوں گا کہ اگر وہ اتنی بھاری
تعداد کے ساتھ عین دوپہر کے وقت ہمیں اطلاع دے کر بھی آتے تو ہم ان کا مقابلہ نہیں کر
سکتے۔ اور اگر انہیں کوئی لباس جس جاکریہ بتا دیتا کہ ہمارے کین کے آگے سمندر کے کنارے
پر ایک خوفناک توپ لگی ہے۔ تو پھر وہ کبھی اس جزیرے کا رخ نہ کرتے

لیکن قسمت میں جو کچھ تھا وہ ہو کر رہا۔ میں دور بین گلے میں لٹکائے سر جھکائے ہاتھ کمر پر
رکھے آگے کو بھاگا ہوا اپنے خیال میں مگن گلی ریت پر قدم اٹھاتا واپس کین کی طرف آ رہا تھا کہ
اچانک مجھے دور سے کچھ شور سنائی دیا۔ میں نے منہ اٹھا کر سمندر کی طرف دیکھا تو میرا دل دھک
سے رہ گیا۔ میں نے جھٹ دور بین لگائی۔ آدم خوروں سے بھری ہوئی میں نے کچیں کشتیاں نیزے لہراتی
شور و جہاں تیں نعرے لگاتی ساحل کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ ادھر سے فرانی ڈسے بھاگتا ہوا
میری طرف آیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

”ماسٹر! وہ آگے..... وہ آگے۔“

”گھبراؤ نہیں فرانی ڈسے۔۔۔۔۔ ہماری توپ ان کے حملے کا منہ توڑ جواب دے گی۔“

ہم جلدی جلدی بھاگتے ہوئے اپنی توپ کے پاس آ گئے۔ گڑھے میں سے بارود کی بو
اور سکے سے بھری ہوئی بوری باہر نکالی گئی۔ میں نے توپ میں بہت سارا بارود ڈال کر

» ہاں فرائی ڈے! مگر ہمیں جزیرے پر قبضہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟
کیا تم وہاں جانا چاہتے ہو؟

» میں اب وہاں جا کر کیا کروں گا۔ ماسٹر! میرا اب وہاں کون ہے؟ ویسے
بھی میں اب آدم خوروں کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں ان وحشیوں کے درمیان
واپس نہیں جانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی بڑے شہر میں جا کر کام کروں اور
اپنی روزی کماؤں۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ فرائی ڈے! تم نے بڑی اچھی بات سوچی
ہے۔ اگر میں اس جزیرے سے نکل رکا تو وعدہ کرتا ہوں۔ کہ تمہیں ہمیشہ اپنے
ساتھ رکھوں گا۔“

فرائی ڈے نے کہا۔ ”ماسٹر میں ساری زندگی تمہاری خدمت کروں گا۔“
» فرائی ڈے! اب ہمارے سامنے جزیرے میں زندگی کا ایک ہی مقصد
رہ گیا ہے کہ اپنی بڑی کشتی کو جلد سے جلد مکمل کریں اور اس میں ایک جینے کا
پانی اور خوراک رکھ کر سمندر میں نکل پڑیں۔ خدا نے چاہا تو ایک نہ ایک دن ٹرینی
دار کے ساحل پر جا پہنچیں گے۔“

ہم نے توپ کو خوب اچھی طرح سے صاف کیا۔ باقی بچا ہوا بارود اور گولیاں کیبن میں
لے جا کر رکھ دیں۔ اس رات ہم بڑے آرام کی نیند سوئے صبح ہوئی تو ضروری کاموں سے
فارغ ہو کر فرائی ڈے زیر تعمیر کشتی کی جانب چلا گیا اور میں دور بین لے کر صلیبی پہاڑی پر آ
گیا۔ میں دور سمندر میں دیکھنے لگا۔ کسی جہاز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو
آگئے۔ اب میرا اس جزیرے میں ایک پل کے لئے بھی جی نہ لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی
جلدی ہنس کے اس منحوس جزیرے کو خیر باد کہہ دوں جہاں میں نے اپنی جوانی برباد کر دی تھی
اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ میں پہاڑی پر سے اتر کر فرائی ڈے کے پاس آ گیا۔ وہ کشتی کی چھت
پر بیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلا کر کہا
» ماسٹر! بس کشتی تیار ہو گئی ہے۔ ایک ہفتے بعد ہم اس جزیرے کو ہمیشہ
کے لئے چھوڑ دیں گے۔“

توپ چلانے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے دور پر سے جلتی ہوئی آگ میں سے ایک شاخ اٹھا
اور بارود کو دکھا دی۔ بارود کو آگ دکھانے کی دیر تھی کہ اس زور سے دھماکا ہوا کہ سارا
جزیرہ گونج اٹھا۔ یوں لگا جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا ہو۔ توپ کی اس باڑھ نے
جو تباہی مچائی وہ دیکھنے کے لائق تھی۔ آدم خوروں کی پہلی قطار کے سارے کے سارے
آدم خوروں کے پرچے اڑ گئے۔ فرائی ڈے زمین پر اوندھے منہ گر اٹھا اور کانپ رہا تھا
میں نے نیزی سے توپ کو دوبارہ بھر دیا۔ اور ایک بار پھر بارود کو آگ دکھا دی۔
اس دفعہ پھر غوناک دھماکا ہوا۔ اور آدم خوروں کی دوسری قطار بھی خون آلود تو کھڑے ہو
کر فضا میں بکھر گئی۔ میں نے تیسری بار پھر توپ کو بھر دیا۔ آگ دکھانے سے پہلے میں نے آدم خور
کو دیکھا۔ ان کی آدھی سے زیادہ تعداد مر گئی تھی۔ باقی بوکھلا گئے تھے۔ وہ تیر چلانا بھی بھول
گئے تھے۔ کچھ وہیں بت بن کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔ کچھ واپس سمندر کی طرف بھاگ
اٹھے تھے۔

میں نے بارود کو آگ دکھا دی۔ ایک اور زوردار دھماکا ہوا اور جو آدم خور کھڑے
تھے۔ وہ بھی ہوا میں اڑ گئے۔ بھاگتے ہوئے نے خوف زدہ ہو کر اور زیادہ زور سے بھاگ
شروع کر دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ وہ کشتیوں میں سوار ہوئے اور انہو
نے اتنی زیادہ تیز رفتاری سے چوچلائے کہ دیکھنے دیکھتے وہ دور سمندر میں جا چکے تھے۔ میر
نے فرائی ڈے کو زمین سے اٹھایا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے بھٹی بھٹی آنکھوں
سے توپ کی طرف دیکھا اور کہا۔

» ماسٹر! یہ کیا شے ہے؟

میں ہنس پڑا۔ » فرائی ڈے! اب وہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔“
میں نے جا کر ریت پر دیکھا۔ وہاں آدم خوروں کی لاشوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔
ریت پر بکھرے پڑے تھے۔ کوئی بھی لاش صبح و سلاں نہیں تھی۔ ڈر سے بھاگ ہوئے آدم خو
کشتیوں میں بیٹھ کر فرار ہو چکے تھے۔

» ماسٹر! اس توپ نے تو کمال کر دیا۔ اس کی مدد سے تم ہم اپنے جزیرے

پر قبضہ کر سکتے ہیں۔“

”یہ تو میرے باپ کا دوست ہے۔“
میں نے اسے اٹھنے کے لئے کہا اور پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے؟ اس آدم خور نے ہاتھ جوڑ

کر کہا

”ماسٹر! ظالم سردار نے آپ سے عبرت ناک شکست کھانے کے بعد جزیرے پر
فرائی ڈسے کے باپ کے تمام وفادار آدمیوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید
میں ڈال دیا ہے۔ وہ ان سب کو دیوتا کی خوشی کے لئے پورے چاند کی رات
کو قربان کرنے والا ہے۔ میں بڑی مشکل سے جان چکا کہ آپ کے پاس آیا ہوں
ہمارے بچوں کی جان بچاؤ۔ ہمیں اس ظالم سردار سے نجات دلاؤ۔“

میں نے فرائی ڈسے کی طرف دیکھا اور آدم خور سے پوچھا
”لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم تم لوگوں کو ظالم سردار سے کیوں کر نجات دلا

سکتے ہیں؟“

آدم خور بولا۔ ”ماسٹر! تمہارے پاس جادو ہے۔ تم جادو کے زور سے دشمن کو ہلاک
کر دیتے ہو۔ تمہارے پاس جو چھوٹا آتش فشاں پہاڑ ہے۔ اسے لے کر ہمارے
جزیرے کو فتح کرو اور سردار کو ٹھکانے لگاؤ۔ ہم تمہیں دعاؤں دیں گے جنہیں
تو سردار ہماری عورتوں، ہماری ماؤں بہنوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو فوج
کر ڈالے گا۔“

میں نے فرائی ڈسے سے کہا

”تمہارا کیا خیال ہے فرائی ڈسے! کیا ہمیں ان لوگوں کی مدد کرنی چاہیے؟“

فرائی ڈسے بولا۔ ”ماسٹر! یہ لوگ ہمیشہ میرے باپ کے وفادار رہے ہیں۔ انہوں
نے ہر مشکل وقت میں میرے باپ کا ساتھ دیا ہے۔ میں ضرور اس مصیبت کے
وقت ان کی مدد کروں گا۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کشتی میں توپ لے کر اپنے
جزیرے پر جاؤں اور ان لوگوں کو ظالم سردار سے نجات دلاؤں۔“

میں نے کہا۔ ”فرائی ڈسے! تم اکیلے توپ نہیں چلا سکو گے۔ میں تمہاری زندگی خطرے

فرائی ڈسے کے یہ الفاظ کہ ہم ایک ہفتے بعد اس جزیرے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے
مجھے عجیب سے لگے۔ کیا یہ منحوس جزیرہ اب میری رہائی پر آمادہ ہو جائے گا؟ مجھے یقین نہیں
آ رہا تھا۔ میں نے بچپن میں اپنے باپ سے ایسی کہانیاں سنی تھیں جن میں ایک جہازی جہاز
عرق ہونے کے بعد کسی دیران جزیرے پر نکل آیا۔ وہاں اس نے بڑی تکلیفیں برداشت
کیں اور پھر ایک روز ایک جہاز وہاں آیا اور اسے اٹھا کر پھر سے مہذب دنیا میں لے
گیا۔ میں نے ایسی کوئی کہانی نہیں سنی تھی۔ کہ جس میں ایسے جزیرے پر گیا ہوا انسان ساری
عمر کے لئے وہیں قید ہو کر رہ گیا ہو۔ شاید سمندری جزیروں کی تاریخ میں یہ پہلا المناک
حادثہ تھا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں اپنی بد نصیبی پر جتنا بھی ماتم کرتا کم تھا۔

میری ساری امیدیں اب اپنی بنائی ہوئی کشتی پر ہی لگی تھیں۔ میری مدد کو کوئی جہاز تو نہیں
آیا تھا۔ لیکن یہ ایک کشتی ضرور مجھے اس جزیرے سے نجات دلا سکتی تھی۔ ایک نئے عزم کے ساتھ
میں فرائی ڈسے کے ساتھ کشتی کی تعمیر میں لگ گیا۔ ہم سارا دن کشتی پر کام کرتے رہے۔ دو دن
کے بعد کشتی بالکل تیار ہو چکی تھی۔ اب ہم نے کین میں سے ضروری چیزیں لا کر اس میں احتیاط
سے رکھنی شروع کر دیں۔ لکڑی کے ایک بہت بڑے ڈرم کو پانی سے بھر دیا۔ روٹی کے بے شمار
سوکھے ٹکڑے اور بکری کا خشک گوشت ایک صندوق میں بھر کر وہاں رکھ دیا۔ اس کے
علاوہ سمندری سفر میں ہمیں جس شے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ ہم نے اپنی کشتی میں لا کر جو
کر دیا اب ہم اچھے موسم کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی سمندر میں طوفان آنے کے دن تھے اور
بارشیں بھی شروع ہونے والی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ بارشوں کا موسم ختم ہوتے ہی ہم اس
جزیرے کو چھوڑ دیں گے۔

ایک روز میں ساحل کی ریت پر فرائی ڈسے کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہ اچانک
میری نظر سمندر میں ایک ڈونگا نما کشتی پر پڑی۔ یہ ہمارے جزیرے کی طرف آ رہی تھی
میں نے فرائی ڈسے کو وہ کشتی دکھائی اور پوچھا کہ اس کے خیال میں یہ کون ہو سکتا تھا؟ فرائی
ڈسے نے دو رہن میں دیکھ کر کہا۔ کہ یہ جزیرے کا کوئی آدم خور ہے۔ میں نے پستول نکال
لیا۔ ڈونگا نما کشتی کنارے پر آ کر رک گئی۔ اور اس میں سے ایک آدم خور وحشی نکل کر
بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا تھا اور کچھ فاصلے پر سجدے میں گر گیا۔ فرائی ڈسے نے اسے پہچان

دشمن پھینے لگی تو ہمارا اپنا جزیرہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور آدم غدروں کا جزیرہ دکھائی دینے لگا۔

[illegible]

» فرزائی ڈسے ! ہم آج صبح منہ اندھیرے آدم خوروں کے جزیرے پر حملہ کر رہے ہیں۔ «
وہ میرا منہ تکتے لگا۔ اسے مجھ سے اتنی پھرتی کے ساتھ فیصلے کی توقع نہیں تھی۔ میں نے
اُسے بتایا کہ اس معاملے میں تاخیر بہت خطرناک ہو سکتی ہے۔ اگر ہم سینکڑوں بچوں، مردوں
اور عورتوں کی زندگیوں بچانا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ پس صبح کا وقت
طے ہو گیا۔ رات گئے تک ہم تیاریاں کرتے رہے۔ صبح منہ اندھیرے جبکہ ابھی تاریکی ہی تھی
میں اور فرزائی ڈسے کہیں سے نکل کر کشتی میں آگئے اور کشتی کو کھلے سمندر کی طرف لے جانے لگے
ہماری یہ کشتی پہلی بار سمندر کے پانوں میں اتری تھی۔ ہم دونوں اپنی کارکردگی پر بڑے خوش
ہوئے۔ کیونکہ کشتی بڑی عمدگی سے بھی چلی جا رہی تھی۔ سمندر کی لہروں پر صبح کی ہلکی ہلکی

کی طرف کیا اور بارود کو آگ لگا دی۔ ایک قیامت خیز دھماکا ہوا۔ جنرل کے درختوں کے پرندے شور مچاتے پھر بھڑکتے اڑ گئے۔ جھیل کے کشتی پیچھے کوٹھڑی میں چپو کی مدد سے اسے پھرا گئے آیا۔ بارود کا دھواں پھلتا تو سامنے سردار کے شاہی جھوڑ پر سے کی دیوار غائب تھی وہاں ایک ہنگامہ اور قیامت کا شور مچا تھا۔ وحشی دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ وہ تیر برس اتنے جیتنے جلاتے ہماری کشتی کی بڑھے۔ اس سے پہلے کہ میں توپ کو دوبارہ بھرتا اور درخت میں چھپے ہوئے فراٹی ڈے نے تاک تاک کر آدم خوروں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا وہ گولیاں لگنے سے گرتے گئے اور بڑھتے گئے۔ میں اس عرصے میں دوبارہ توپ میں بارود ڈال چکا تھا۔ میں نے توپ

فرانی ڈے! اپنے آدمیوں سے کہو کہ آگے بڑھ کر سردار کے ہاتھ پیر باندھ ڈالیں۔“
فرانی ڈے بلند آواز سے اپنے آدمیوں کو پکارا، ہجوم میں سے کتنے ہی لوگ باہر نکل آئے
باقی سردار کے چند ایک آدم غور رہ گئے۔ وفادار وحشیوں نے رسیوں سے سب سے پہلے سردار
کی مشکیں کسیں اور پھر باقی آدم غوروں کو بھی قید کر لیا۔ میں کشتی سے اتر کر سردار کے پاس آ گیا
تھا میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ میں نے سردار سے کہا۔

”تم نے اس جزیرے کے سب سے پرانے قبیلے کے لوگوں پر بہت ظلم کیا
ہے۔ تم اب تک سینکڑوں آدمیوں کو ہڑپ کر چکے ہو اور تمہارے حکم سے ہزاروں
انسان اب تک قہراً جل بن چکے ہیں۔ اب تمہاری باری ہے۔ تم سے ایک ایک
مظلوم انسان کا بدلہ لیا جائے گا۔ بولو کیا تمہیں کچھ کہنا ہے؟“
سب سے زیادہ سردار کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں ان وحشیوں کی زبان
بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ دوسرے وحشی بھی میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے
دیکھ رہے تھے۔ ایک دم دہ سارے کے سارے سجدے میں گر پڑے اور مجھے دیتا
دیتا کہہ کر پکارنے لگے۔ میں نے اُدبھی آواز سے کہا۔

”سنو! میں کوئی دیتا نہیں ہوں۔ دیتا یہ نوجوان فرانی ڈے ہے۔ یہ
ہی تمہارا دیتا ہے۔ یہی تمہارا سردار ہے۔ ہاں! میرے پاس ایک ایسا ہتھیار
ضرور ہے جس کی مدد سے میں تم سب کو ایک پل میں ہلاک کر سکتا ہوں۔ میں سردار
کے ساتھیوں کو معاف کرتا ہوں اور انہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ فرانی ڈے کی
غلامی قبول کر لیں۔ لیکن میں سردار کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

ایک بار پھر سارے وحشی سجدوں میں گر پڑے۔ انہوں نے میرے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے
فرانی ڈے کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ سردار کو وفادار وحشیوں نے اسی وقت اپنے قبضے میں
لیا۔ وہ مجھے اور فرانی ڈے کو ایک جلوس کی شکل میں جزیرے کے اندر اس جگہ لے گئے جہاں
سینکڑوں عورتیں اور بچے قید تھے۔ انہیں اسی وقت رہا کر دیا گیا۔ وہ خوشی سے ہنستے مسکاتے
میرے ارد گرد اک جمے ہوئے۔ میں نے بچوں کو پیار کیا۔ ایک وحشی عورت نے میرے گلے

داغ دی ایک اور دھماکا ہوا اور کتنے ہی وحشیوں کے جسم قیمہ بن کر فضا میں اڑ گئے۔ ان میں
ایک بار پھر دہشت پھیل گئی۔ کچھ آدم غور ہیں رک گئے۔ اور کچھ پیچھے بھاگ اٹھے۔ فرانی ڈے
ان پر لڑک لڑک کر بندوق کے فائر کر رہا تھا۔ میں نے تیسری بار توپ چلائی تو سردار کی بچی
کچھی جھونپڑی بھی اڑ گئی۔

میں نے چوتھی بار توپ میں بارود بھرا اور اسے آگ دکھا دی۔ بھیانک دھماکے کے
ساتھ ان گنت بھاگتے ہوئے وحشی خون میں لت پت ہو کر گر پڑے اب میں نے اُدبھی آواز
میں ان کے سردار کو ان ہی کی زبان میں پکارا۔

”آدم غوروں کے سردار! ہتھیار ڈال کر میری قید میں آ جاؤ۔ میں تم پر
رحم نہیں کروں گا۔ تم ہزاروں انسانوں کو قتل کر کے ہڑپ کر چکے ہو۔ میں تمہارے
جزیرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔“

میری اس للکار کا کسی نے جواب نہ دیا۔ آدم غور لاشیں چھوڑ کر دوپوش ہو چکے تھے میں
توپ کو کھٹائی میں اور آگے لے آیا۔ اور اسے ایک بار پھر بھر کر دھماکے ساتھ چلا دیا۔ اس
دفعہ مجھ سے بارود کچھ زیادہ ہی بھرا گیا تھا۔ یہ دھماکا اتنا خوف ناک تھا کہ خود میں اس سے
لرز گیا۔ سردار کے جھونپڑے کی رہی سہی چھت اور ایک آدھ دیوار بالکل ہی زمین کے ساتھ
مل گئی۔ اور ان میں آگ لگ گئی۔ شاید چھت جلتی ہوئی آگ پر گری تھی۔ آگ نے وہاں ایک
افزاتری مچا دی۔ میں نے اب توپ کی بجائے پستول سے فائرنگ شروع کر دی۔ تھوڑی
دیر بعد آدم غور وحشی ہاتھ بلند کئے سروں کو جھکائے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ سردار ان کے
آگے آگے تھا۔ اب میں نے فرانی ڈے سے کہا کہ وہ نیچے اتر کر اپنے وفادار ساتھیوں سے کہے
کہ وہ ان لوگوں کو سردار سمیت گرفتار کر لیں اور جزیرے پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیں۔
فرانی ڈے چھلانگ لگا کر درخت سے نیچے آ گیا۔ سردار نے اسے قہراً کود نظروں سے دیکھا
میں نے ہوائی فائر داغ کر کہا۔

”آدم غور سردار! تیری زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ تو نے لوگوں
پر جتنا ظلم کرنا تھا تو کر چکا۔ اب اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے۔“

میں پھولوں کا ہار ڈال دیا اور اپنی زبان میں مجھے دیوتا کہہ کر سر جھکا دیا۔

فرانی ڈسے میری طرف دیکھ کر منہں رہا تھا۔ جزیرے کے لوگوں نے اسی وقت فرانی ڈسے کے سردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوپہر کے بعد جزیرے میں ایک شاندار دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں آدم خور عورتوں اور مردوں نے رقص پیش کئے، سالم بکریوں کا گوشت بھون کر کھایا گیا۔ فرانی ڈسے نے میرے کان میں کہا کہ یہ صرف میری وجہ سے بکریوں کو بھونا جا رہا ہے۔ نہیں تو آج انہوں نے سردار کو بھون کر کھانا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”تو کیا یہ اسے چھوڑ دیں گے؟“

فرانی ڈسے بولا۔ ”نہیں ماسٹر! وہ آج ہی بلکہ ابھی اسے قتل کر کے اس کے جسم کے ٹکڑے آپس میں جا کر اسے مزے لے لے کر کھائیں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ماسٹر انسانی گوشت کھانے کو پسند نہیں کرتا۔“

اور ایسا ہی ہوا! ضیافت کے ختم ہوتے ہی سردار کو لایا گیا۔ وہ رسیوں میں بندھا ہوا تھا۔ اسے فرانی ڈسے کے وفادار ساتھی گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ سردار کی بہت بُری حالت تھی۔ وہ سخت پریشان تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ایک پروقار سکوت تھا۔ اس کی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ کہ وہ موت سے خائف ہے۔ سردار کے پیچھے پیچھے ایک آدم خور ہاتھ میں چھرائے آ رہا تھا۔ سردار کو درمیان میں لاکر بٹھا دیا گیا۔ سردار میری اور فرانی ڈسے کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک بار بھی گڑ گڑا کر زندگی کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی۔ میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھایا اور کہا۔

”اگر فرانی ڈسے اجازت دے تو میں آپ لوگوں سے کہوں گا۔ کہ اس شخص کی جان بخشی کر کے اسے کسی غیر آباد اور دروازے کے جزیرے پر جلا وطن کر دیا جائے۔“

فرانی ڈسے نے کہا۔ ”ماسٹر! میری طرف سے اجازت ہے۔“

اس پر عورتوں، بچوں اور مردوں نے سب سے مل کر شور مچانا شروع کر دیا۔ کہ ہم اس ظالم شخص کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ جس نے ان کے بے درد قتل عام کا فیصلہ

کھا تھا۔ اور اس میں شک بھی نہیں تھا۔ مگر اگر میں توپ لے کر ان کی مدد کو نہ آتا تو سردار ان بے گناہ بچوں اور عورتوں کی تکا بولی کر دینی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ وہ لوگ اسے کسی درت معاف کر دینے پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے سردار کے ارد گرد وحشیانہ رقص شروع دیا۔ سردار کو زمین میں میخ گاڑ کر اس کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ مردوں کے بعد یوں نے سردار کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ ان کے ہاتھ میں تیکھی نوکوں والے بانس کے رتھے۔ وہ ناچتے ناچتے سردار کے بدن میں تیروں کے کچوکے لگا رہی تھیں۔ سردار کے جسم پر بد جگہ زخم ہو گئے تھے۔ اور ان میں خون رسنے لگا تھا وہ اب بھی خاموش تھا اور اپنی قسمت راضی ہو کر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ موت اس کے بالکل سر پر بیٹھی تھی۔ وفادار وحشیوں میں سے ایک ادھیر عمر کے آدم خور نے اٹھ کر سردار کے سر پر زمین سے مٹی اٹھا کر ڈال دی۔ اس پر مردوں اور عورتوں نے زور سے چیخیں ماریں۔ پھر اس وحشی نے سردار کے سر کو بالوں سے بکڑ کر اس کا منہ اوپر کر دیا۔

جونہی سردار کا منہ اوپر ہوا پھرے والے وحشی نے سردار کی گردن پر چھرا چلاتے ہوئے اسے بکرے کی طرح ذبح کر دیا۔ خون کا ایک فوارہ چھوٹ کر سامنے گرا۔ آدم خور پک پک کر سردار کا خون جلوؤں میں بھر کر پینے لگے۔ سردار کی گردن آدھی کٹ کر ایک طرف کو ڈھسک گئی۔ عین اس وقت سارے آدم خور پھرے لے کر ایک ہجوم کی صورت میں سردار پر پل پڑے۔ میں اپنی جگہ پر خوف زدہ سا ہو کر یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وحشیوں کی بھیڑ چھٹی تو جہاں ایک لمحہ پہلے سردار کی لاش پڑی تھی۔ وہاں اب سوائے خون کے نشان کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ آدم خور سردار کی لاش کی بوٹی بوٹی کر کے لے گئے تھے۔ سردار کا سر ایک نیزے پر ڈانگ کر سارے جزیرے میں پھرایا گیا۔ پھر اسے نئے سردار یعنی فرانی ڈسے کے باپ کی پرانی جھنڈی کی چھت پر لٹکا دیا گیا۔ میں نے فرانی ڈسے کے اصرار پر وہ رات آدم خوروں کے جزیرے پر ہی بسر کی۔ ساری رات آدم خور ناچتے اور خوشیاں مناتے رہے۔ میں آدھی رات کے بعد سو گیا۔

اگلے دن میں آنے لگا تو فرانی ڈسے بھی میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ اصل میں اس کا

میں نے چٹان کے ساتھ بندھی ہوئی کشتی پر ضروری سامان لادنا شروع کر دیا۔ اب مجھے لپے ہی اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ فرائی ڈے اپنے جزیرے کا سردار بن کر رہ رہا تھا۔ یہ ایک طرح سے اچھا بھی ہوا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ شہر کی زندگی اسے راس نہیں آئے گی اس کا ان جزیروں میں اپنے وحشی لوگوں کے درمیان رہنا ہی بہتر تھا۔ میں نے کشتی میں جو تھوڑا بہت سامان لادا جاسکتا تھا ہجا کر رکھ دیا۔ پانی کا ڈرم بھی رکھ دیا اور خشک انگور کی دو بوریاں اور بکری کے خشک گوشت کے ٹکڑے بھی..... اب میں اچھے موسم کا انتظار کرنے لگا۔ میرے انداز کے مطابق کوئی ایک مہینے کے بعد پرسکون موسم کا آغاز ہونے والا تھا اس رات بادل آگئے۔ ہوا تیز چلنے لگی اور رات کے پچھلے پہر بڑے زور کی بارش شروع ہو گئی بارش اتنی شدید تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے کہن کی چھت یہ بارش برداشت نہیں کر سکے گی۔ اور سچ کہن کی چھت ٹپکنے لگی۔ میں چٹان کی کھوہ میں سمٹ کر لیٹ گیا۔ ہوانے طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بادل خوفناک کڑواؤں کے ساتھ گرج رہے تھے۔ درخت یوں وحشیوں کی طرح جھول رہے تھے کاب گھرے گھرے۔ سمندر کی طرف سے لہروں کے چٹان سے ٹکرانے کی بھیانک آوازیں برابر آرہی تھیں۔ بجلی کڑکتی بادل گرجتے تو گویا جزیرے میں ایک زلزلہ سا آجاتا۔ طوفان بڑا شدید تھا۔ پچھلے پہر سمندر کی طرف سے چٹانوں کے ٹوٹنے کی مہیب آوازیں آنے لگیں۔

مجھے سب سے زیادہ فکر اپنی کشتی کی تھی۔ جو چٹان کے پاس بندھی ہوئی تھی۔ اور جسے ہم نے شب و روز کی محنت کے بعد بنایا تھا۔ اتنے سخت طوفان میں اس کا اپنی جگہ پر قائم رہنا ایک معجزے کی بات ہی ہو سکتی تھی۔ وہ تو ضرور سمندری موجوں کے ساتھ بہہ گئی ہوگی۔ خدا خدا کر کے طوفان ٹھہرا۔ دن نکلا سورج نے بادلوں کی اوٹ سے جزیرے کو دکھایا۔ میں کہن سے باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے میں نے دیکھا کہ ساحل کے بے شمار درخت ٹوٹ کر گرے ہوئے تھے۔ چٹانوں کے پتھروں کو شوریدہ سرموجوں نے توڑ پھوڑ کر ادھر ادھر لٹھکادیا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس چٹان کے پاس آیا جہاں میں نے شام کو کشتی باندھی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا وہاں نہ کشتی تھی نہ کشتی کا کوئی نشان ہی تھا۔ طوفانی لہریں کشتی کی رسی توڑ کر اسے اپنے ساتھ

کا اب ان آدم خوروں میں نہیں لگتا تھا۔ وہ میرے جزیرے پر واپس آنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اسے بڑے دلائل سے سمجھایا کہ اس کی اصل جگہ اسی جزیرے میں ان لوگوں کے زمان ہے۔ اسے وہیں رہنا چاہیئے۔ اسے ان لوگوں کی اور ان لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے چاہیئے۔ اسے ان لوگوں کی اخلاقی اصلاح کرے اور آدم خوری کو بالکل جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا۔ کہ اگر فرائی ڈے میرے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں نکل پڑا اور ہماری کشتی کسی بندرگاہ پر پہنچ بھی گئی۔ تو وہ شہروں کی فضا میں زندہ نہ رہ سکے گا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری باتیں اور دلائل فرائی ڈے کی سمجھ میں آگئے۔ اور اس نے اپنے جزیرے پر رہنا قبول کر لیا۔ میں بہت خوش ہوا۔ دوسرے روز میں نے توپ اور بارود فرائی ڈے کے حوالے کر دیا۔ دوپٹوں بھی اسے دے دیئے اور اس سے ہنگامہ ہو کر واپس اپنے جزیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ کہ میں ہفتے میں ایک بار ضرور اس سے ملنے آیا کروں گا۔ فرائی ڈے نے کہا کہ وہ بھی ملنے آتا رہے گا۔

اپنے جزیرے پر پہنچ کر میں نے کشتی کو چٹان کے ساتھ لگا کر باندھا اور اپنے کہن میں آ گیا۔ فرائی ڈے اپنے پیارے طوطے اور کتے کے بغیر آج مجھے ویران جزیرے کی تنہائی بے حد ویران محسوس ہو رہی تھی۔ صبح معنوں میں مجھے اکیلا پن کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ تیس بیس سالوں کی تنہائی گویا ایک دم سے سمٹ کر ایک لمے میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ میں کہن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے اب بھی اس جزیرے پر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سورا گا۔ اسی رات مجھے بخار ہو گیا۔ میرا سارا بدن تپنے لگا۔ میں رات بھر بے ہوشی کے عالم میں ہڈیاں بکتا رہا۔ اگلے روز بھی بخار کم نہ ہوا۔ اور میں کہن کے اندر تخت پر پڑا رہا۔ شام کو جاکو بخار کی شد کم ہوئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رات بھر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرے حلق میں کلنٹے پڑ گئے تھے۔ دن نکلا تو میں دوپہر تک تخت پر لیٹا رہا۔ دوپہر کے بعد میں سمندر کے کنارے دھوپ میں آکر بیٹھ گیا۔ اگرچہ گرمی کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ پھر بھی دھوپ مجھے بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میں شام تک وہیں بیٹھا۔ رات کو تھوڑی سی روٹی اور خشک انگور کھا کر سو گیا۔ اس رات مجھے بڑی گہری نیند آئی۔ صبح اٹھا تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔

بسانے سمندر میں کھڑا تھا۔ خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق کے قریب آگیا۔ میں جہاز پر نیلی نیلی وردیوں والے ملاحوں کو صاف دیکھ رہا تھا۔ اسی قسم کے ملاح کشتی میں بھی بیٹھے تھے جو ساحل سے ہو کر واپس جہاز کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے پستول کا ہوائی فائر کر دیا۔ پستول کی آواز پر جہاز کی طرف جاتی ہوئی کشتی واپس مڑی اور اس نے ساحل کی طرف آنا شروع کر دیا میں پہاڑی برسے اتر کر سمندر کی طرف اپنے تجاشا بھاگنے لگا، بھاگتے بھاگتے میں دوبارہ ریت پر منہ کے بل گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد کشتی ساحل پر آکر رگ گئی میں زمین پر پڑا تھا۔ نیلی وردیوں والے ملاح کشتی میں سے اتر کر میرے پاس آگئے، وہ مجھے اور میں ان کو حیرت سے دیکھ رہا تھا ہاں اب یہ انسان تھے۔ مہذب شہر کے رہنے والے صاف ستھرے کپڑوں اور چمکیلے صحت مند چہروں والے انسان..... انہیں دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ایک ملاح نے جھک کر مجھ سے پوچھا ”تم کون ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں انسان ہوں۔“

اور اتنا کہہ کر میں ہاتھوں میں اپنا سفید بالوں والا بوڑھا چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ ملاحوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے ریت پر سے اٹھایا جب میں نے انہیں بتایا کہ میں تنیس برس سے اس منحوس جزیرے پر جلا وطن ہوں تو انہیں یقین نہ آیا۔ وہ مجھے بالکل سمجھنے لگے۔ میں انہیں پہاڑی پر لے گیا اور صلیب دکھائی جس پر میں نے جزیرے بھر میں آنے کی تاریخ لکھی تھی۔ اور دونوں کے شمار کے نشان لگائے تھے۔ پھر میں نے انہیں اپنا کہیں دکھایا ملاح ششدر رہ گئے۔ انہوں نے تعجب اور حیرانی سے دانتوں میں انگلیاں دبائیں۔ وہ مجھے کشتی میں سوار کر کر جہاز پر لے گئے۔ یہ جہاز ایک بہت بڑا اور صاف ستھرا جہاز تھا۔ کپتان نے میری کہانی سنی تو درجہ حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ میری ہمت اور دلیری پر عرش عرش کراٹھا۔ اس نے بتایا کہ رات کے طوفان کی وجہ سے اس کا جہاز جھٹک کر اس جزیرے پر آگیا تھا۔

بہا کر خدا جانے کہاں لے گئی تھیں۔ میں سر یکڑ کر بیٹھ گیا۔ امید کی آخری کرن بھی کچھ لگی تھی اب میں دوبارہ کشتی کہاں بنا سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں سر جھکائے بوجھل دل کے سات ریت پر ٹہلنے لگا۔

اب یہ جزیرہ مجھے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ تنہائی کا شدید احساس تو پہلے ہی میرے رگ پے میں سرایت کر گیا تھا۔ لیکن اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ جزیرہ میری موت کا انتظار رہا ہے۔ مجھے اپنے آس پاس موت کے پروں کی پھر پھر ٹائیں سنائی دے رہی تھیں میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔ جس جٹان ایسے عزم کے ساتھ میں نے اس منحوس جزیرے میں زندگی کے تیس سال بسر کئے تھے۔ اب اس میں کمزوری آنے لگی تھی اور میں اپنے آپ کو موت کی طرف جاتا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں آرزوہ دل لئے اپنے کہن میں واپس میں آگیا۔ میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے خوشگوار بچپن کی یادیں پھرنے لگیں۔ یہ موت کی نشانی تھی۔ کہتے ہیں جب آدمی مرنے لگتا ہے اس کا سارا بچپن گھوم جاتا ہے۔ اچھا اگر موت ہی میری قسمت میں لکھی ہے تو پھر موت سے بڑھ کر اور کوئی شے مجھے تسکین نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے موت سے پیار ہو گیا اور میں کہن کے اندر آکر تخت پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے موت کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے آنکھیں بند کئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ میری زندگی کا سب سے بڑھ کر حسین اور یادگار حادثہ ہوا۔ میرے کانوں میں سمندری جہاز کے بھونپو کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو مجھے لگا کہ موت میرا دل ہلار رہی ہے اور مرنے سے پہلے مجھے آخری بار لندن میں سنی ہوئی جہازوں کی آوازیں سنا رہی ہے۔ میں زیر لب مسکرا دیا اور موت سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن جب دوسری بار پھر جہاز کے وصل کی آواز آئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک کیمپ سے باہر آگیا۔ میں بھاگتا ہوا صلیب والی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ میں جلدی میں دوڑا کہن میں ہی بھول آیا تھا۔ مگر اب مجھے دور بین کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے ایک بہت بڑا دوخانی جہاز سمندر میں دو میل کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اور ایک سفید رنگ کی کشتی جہاز کی طرف واپس جا رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کا ایک حسین ترین خواب دیکھ رہا ہوں میں نے دو تین بار آنکھیں ملیں۔ جہا

ملاح جزیرے پر پانی تلاش کرنے آئے تھے۔ اور اب جہاز انہیں لے کر واپس جا رہا تھا۔ اگر میں بھونپو کی آواز نہ سنتا یا سو رہا ہوتا تو جہاز ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز اس ویران جزیرے کو چھوڑ کر سمندر کی طرف چل پڑا جہاں میں نے اپنی حوائی کے بہترین ایام تنہائی، اذیت اور کس میری کے عالم میں گزار دیئے تھے۔ جزیرے کی پہاڑیاں نگاموں سے اوجھل ہونے لگیں تو مجھے دور سے اپنے پیارے کتے اور طوطے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں کپتان کے کیبن کے نرم نرم بستر پر لیٹا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ایک مہینہ بعد یہ جہاز انگلینڈ کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ میرا باپ مرجکا تھا۔ کوئی رشتے باقی نہ تھا۔ کپتان نے مجھے اپنے ہی جہاز پر نائب کپتان کی نوکری دے دی اور میں زندگی کے باقی دن خاموشی سے بسر کرنے لگا۔